چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
APR 2020
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام
PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے
پاکستانی پوائنٹ
عظیم
2020

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 21 شمارہ نمبر 7 اپریل 2020ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/90 روپے

سالانہ قیمت -/1500 روپے

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہوسکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

بینڈڈ — ثناء شیخ — 18
احساس برتری میں مبتلا پستی سوچ رکھنے والوں کے لئے ایک جن کا عملی پیغام

آخری نشانی — ایس امتیاز احمد — 45
باذوق لوگوں کے لئے...... الفریڈ ہچکاک کی لرزہ خیز...... اسٹوریز سے انتخاب

زرتاش کا راز — سنبل وسیم سیالوی — 53
ایک ان دیکھی مخلوق کی ستم ظریفی جو کہ نوجوانوں کا خون پی کر حسین رہتی تھی

پراسرار چوکی — گلاب خان سولنگی — 61
ایک بلا کی داستان حیرت جو کہ گھنے جنگل میں رہتی تھی اور جب وہ سامنے آئی تو......

جہنمی دروازہ — راشد نذیر طاہر — 68
رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

عجیب واقعات — نثار فاطمہ — 91
ایسے واقعات جسے دیکھ کر ہر آنکھ دنگ رہ جاتی تھی، ناقابل فراموش حقیقی روداد

روح کی چیخ — محمد خالد شاہان — 95
دل و دماغ میں خوف کی...... ہلچل مچاتی اور رگوں میں خون منجمد کرتی...... تحیر انگیز کہانی

جناتی دنیا — شیخ معین اختر — 105
رات کا اندھیرا ہر طرف مسلط تھا اچانک دل دہلاتی آواز آئی، ریڑھ کی ہڈی میں لہر دوڑاتی کہانی

آخری رسومات — پیاسحر — 115
جناتی دنیا کی جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی حقیقت پر مبنی ڈراؤنی اور خوفناک کہانی

جلتے گلاب — عثمان غنی خان — 126
ایک اچھوتی انوکھی دلک دلنواز، فرحت بخشتی دل دماغ کو گدگداتی شاہکار کہانی

ایک شرط — ماریہ مسعود — 153
سبک رفتاری سے دل و دماغ کو فرحت بخشتی دلکش، دلگداز اور...... دلفریب کہانی

جدید روح — اسحار بن ناصر — 159
ایک روح کا حیران کرتا شاخسانہ...... جس نے لوگوں کو چنے...... چبوا دیے...... تھے

لٹیرا — مونا شہزاد — 163
جرم سات پردوں میں کیوں نہ کیا جائے، ہر حال میں اپنا اثر رکھتا ہے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

موت کی سرگوشی — مظہر الحق علوی — 172
ایک ایسے...... شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت...... سے نکل آیا تھا

ڈراؤنا سفر — شہزاد خان — 193
پل پل اور لمحہ لمحہ خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن بھیانک رات کا شاخسانہ

پراسرار قوت — رضوان علی سومرو — 200
خوف کے دھندلکوں میں لپٹی تحریر جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

قوس قزح — ادارہ — 218
قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں......

ام الیقین — ضرغام محمود — 222
حقیقت...... سے چشم پوشی انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی...... ایک...... حقیقی...... کہانی

WWW.PAKISTANIPOINT.COM

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

برینڈڈ

ثنا اے شیخ-لاہور

اس کا ناچ ھی اس کی طرح عجیب تھا، وہ کبھی اپنے سر کو اوپر نیچے جھٹک دیتا تو کبھی اپنے ھاتھوں کو ھوا میں گھماتا بس ایک چیز مستقل تھی اور وہ تھی اس کے چھرے کی بھیانک مسکراھٹ اور پھر وہ ناچتے ناچتے اچانک غائب ھوگیا۔

احساس برتری میں مبتلا سستی سوچ رکھنے والوں کے لئے ایک جن کا عملی پیغام

علی! تین کمرے ہم دو لوگوں کے لیے زیادہ ہیں، یہ جگہ بھی شہر سے اتنی دور ہے۔ میرا دل نہیں مانتا، افرحہ گاڑی سے ٹیک لگائے ایک کنال پر مشتمل دو منزلہ گھر کے باہر کھڑے ہو کر اپنے انکار کی وجہ بتا رہی تھی۔ ارے! ایک ہمارا بیڈ روم، ایک گیسٹ روم اور ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنا لینا باقی اتنا بڑا لاؤنج ہے تو اس میں لیونگ کے ساتھ ڈائننگ ایریا سیٹ ہو جائے گا۔ اور دیکھو گھر کے سامنے مسجد بھی ہے شاید اسی وجہ سے میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بھی شروع کر دوں۔ اور مسجد کے پیچھے ہی پارک ہے، مجھے واک کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑے گا تو میرا وزن بھی کنٹرول میں رہے گا۔ علی نے جیسے اس گھر کو ہر صورت کرایہ پہ لینے کی ٹھان لی تھی۔ اور مکان دار بھی اخلاق کے اچھے ہیں۔ علی! تم اخلاق کس چیز کو کہتے ہو؟ صرف میٹھا بولنے کو یا اپنا کام نکالنے کے لیے تسلی کے ساتھ جھوٹ بولنے کو؟ یا اصل میں سچ بات شائستگی سے کرنے کو؟ افراحہ، مکان داروں کے بارے میں علی کی رائے سے متفق نہیں تھی۔

لو جی! اب تمہیں مکان کے ساتھ ساتھ ان دونوں میاں بیوی میں بھی خامیاں نظر آ گئیں؟ یار کسی کو تو بخش دو اپنی کریٹیکل آبزرویشن سے۔ علی کی بات پر افراحہ نے اسے ناراضگی سے دیکھا تو وہ اپنی بات ڈھانپنے کے لیے مزید بولا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بیگم! اب ہر کوئی آپ کی طرح کمال پرسیپشن تو نہیں رکھ سکتا ناں۔ تم لوگوں کے منطلق اپنی رائے میں ذرا لچک والا رکھو تو تمہیں بھی میری طرح کسی کے رویے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مزید چڑ گئی۔ مجھے لوگوں کے ظاہری رویوں سے نہیں ان کے جھوٹ سے فرق پڑتا ہے۔ تم نے نوٹ نہیں کیا کہ اپر پورشن کے سارے فلورز کی ٹائلز کے درمیان لائنیں کالی پڑی ہوئی ہیں اور یہ تب ہوتا ہے جب گھر بہت زیادہ استعمال ہوا ہو۔ جب میں نے اس عورت سے وجہ پوچھی کہ یہ ٹائلز کی فلنگز کالی کیوں ہیں؟ کیا یہ پورشن استعمال ہو چکا ہے؟ آپ کتنے عرصے سے ہیں یہاں؟ تو اس نے جواب دیا کہ نہیں ہم تو گراؤنڈ فلور بننے کے بعد وہیں شفٹ ہو گئے تھے ایک سال پہلے اور پھر اپر فلور آہستہ آہستہ بنتا رہا تھا۔ اب تم بتاؤ کیا کسی نئے گھر کی سفید ٹائلز کے درمیان بھری سفید چونے یا وائٹ سیمنٹ کی بھرائی اتنی جلدی بنا استعمال کالی ہو سکتی ہے؟ ہم اس وقت جس گھر میں ہیں دو سال استعمال کے بعد بھی ابھی

تک اس کی فلور لائنز کالی نہیں ہوئیں، افراحہ مکان دار عورت کا جھوٹ پکڑ چکی تھی۔

وہ تو اس لیے کہ تم صفائیاں ہی اتنی ڈاڈی قسم کی کرواتی ہو، علی نے وجہ بتائی۔ تم کچھ بھی کہو۔ یہ گھر نیا نہیں ہے، پرانا ہے، پراپرٹی ڈیلر نے اشتہار میں برینڈ نیو صرف کرایہ بڑھانے کے لیے لکھا ہوا ہے۔ اور تم نے یہ بھی نوٹ نہیں کیا کہ یہ عورت مجھے کچن اور واش رومز کی لائٹس جلائے بنا ہی گھر دکھا رہی تھی، افراحہ نے دوسرا نقطہ بتایا۔

وہ تو اس لیے کہ دن کا وقت ہے نا، علی نے جواب دیا۔

اچھا! اور اس دن کے وقت جو آسمان پہ یہ کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے سورج کی روشنی تو ہے نہیں، تو اس اندھیرے میں گھر کے اندر کمرے، کچن یا واش رومز تمہیں واضح ہو رہے تھے؟ اور جب میں گھر کے اندر والے ٹیرس گارڈن پہ جانے لگی تو اس نے کیسے مجھے منع کر دیا کہ باہر مت جائیں۔ ارے کوئی گھر دیکھنے آئے تو اسے اس طرح گھر دکھاتے ہیں؟ اتنی روک ٹوک کے ساتھ؟ افراحہ نے پوچھا تو علی بولا کہ بھئی اب کمرے، کچن یا واش رومز دیکھ کے مجھے کرنا بھی کیا تھا؟ یہ تو تم خواتین کا ڈیپارٹمنٹ ہے، مجھے تو بس اس گھر کے ہال کے اندر کا ٹیرس گارڈن اور گھر کے سامنے یہ پارک نظر آ رہا ہے میری زندگی کے لیے تو بس یہی نیچر اور ہریالی کافی ہے میرا تو سارا وقت یہیں گزرا کرے گا۔ اور اس نے تمہیں اس وقت اس لیے اندر والے ٹیرس میں جانے نہیں دیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو بونداباندی ہو رہی تھی تو باہر سب گیلا ہو گا، سینتھیٹک گراس ہے ناں۔ اس کی سینتھیٹک گراس کی تو ایسی کی تیسی۔ جب ہم یہاں رہیں گے تو کیا تب اپنے ہی ٹیرس پہ اس کی اجازت لے کہ جایا کریں گے؟ کہ جائیں گے ہی نہیں؟ اور یہاں ہریالی کیوں نہیں ہو گی؟ ایک بلاک جتنی تو پوری سوسائٹی ہے اور چاروں طرف گاؤں۔ نہ ہی کوئی مارکیٹ ہے ادھر۔ شہر سے بالکل ہی کٹ جائیں گے، افراحہ کی باتوں سے اوازاری جھلک رہی تھی، اسے یہاں کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

افراحہ دیکھو! میرا آفس یہاں سے قریب ہے، پٹرول کی بہت بچت ہو گی۔ ہم منتھلی گروزری کے علاوہ ہفتے میں ایک بار شہر جا کر پھل اور سبزیاں وغیرہ لے لیا کریں گے ناں، باقی جو کچھ چاہیے میں آتے جاتے آفس سے لے آیا کروں گا۔ دیکھو پچھلے گھر کے معاہدے کی مدت ختم ہو چکی ہے ایک ہفتے بعد اسے رینیو کروانا پڑا تو اس گھر کا کرایہ بھی بڑھ جائے گا اور انہوں نے صاف صاف گھر خالی کرنے کو کہہ دیا ہے ہم نکلیں گے تو وہ اس گھر کو رینوویٹ کروا کر بیچنے پہ لگائیں گے۔ ہمیں وہ گھر اگلے ہفتے ہر حال میں خالی کرنا ہے۔ علی نے پہلی بار پریکٹیکل توجیہہ پیش کی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گئی اور وہ سمجھ گیا کہ اس کی خاموشی نیم رضامندی ہی ہے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی نظر گھر کے دائیں جانب پیوست بورڈ پر پڑی جس پہ ایک تیر کے نشان کے ساتھ انگریزی میں گریو یارڈ لکھا ہوا اور تیر کا نشان اس گھر کے پچھلی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ یہ لو! بس اس کی کمی تھی، وہ بولی۔

کیا ہوا؟ علی نے پوچھا۔

گھر کے بالکل پیچھے قبرستان بھی ہے۔ لیکن زیادہ آباد نہیں لگ رہا۔ افراحہ نے دور سے ایک لائن میں نظر آتی چار پانچ قبروں کو دیکھ کر کہا۔

ارے تم یہاں آ تو سہی اسے بھی آباد کروا دیں گے۔ علی اپنی ہی بات پہ ہنس دیا۔ اور وہ اس کے بے تکے مذاق پہ بنا جواب دیے مزید سنجیدہ ہو گئی۔ علی نے گاڑی آگے بڑھا دی اور وہ گھر کے بائیں جانب لگے بہت سارے سفیدے کے درختوں کو زمین پہ گرے دیکھ کر بولی، اتنے سارے سفیدے کے درخت ایک ساتھ کیسے زمین پہ پڑے ہیں؟ اتنی آندھیاں تو نہیں آئیں پچھلے دنوں کہ سارے کے سارے درخت گر جائیں۔ مکان دار بتا رہا تھا کہ انہوں نے ہی یہ سب کٹوائے ہیں

گھر کے تحفظ کے پیشِ نظر، ورنہ یہاں جنگل کا گمان ہوتا تھا۔ بس جی انگریز چلے گئے اور سفیدے کے درخت چھوڑ گئے لیکن ہمارے یہاں کے کچھ دیسی لوگوں کو یہ درخت پسند نہیں، تو کٹوا دیے، علی نے جواب دیا۔

ارے تو کیا ہوا؟ ہاں یہ زیادہ ماحول دوست درخت نہیں اور بیشک ان کی چھاؤں گھنی نہ سہی لیکن درخت تو تھے ناں۔ اچھا نہیں کیا انہوں نے، افراحہ کو زمین پر کٹے پڑے ہوئے درختوں کا ڈھیر دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔

چھوڑو ہمیں کیا۔ علی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اب یہ کون ہیں؟ کیا کرنے آئے تھے؟ قبرستان کی دیوار پر بیٹھے ابرام نے آتش سے پوچھا۔ وہ دونوں جو انسانی نظروں سے اوجھل تھے لیکن پچھلی کچھ دیر سے قبرستان سے منسلک گھر کو دیکھنے آئے علی اور افراحہ کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ جو بھی تھے، لیکن اس گھر میں تو اب میں کسی کو رہنے نہیں دوں گا۔ اوپر اس پچھلے کمرے کو میں نے اپنی رہائش کے لیے پسند کر لیا ہے۔ اس گھر کے مالک نے ہمارے درختوں کو کاٹ کے پہلے ہی ہم سے دشمنی مول لے لی ہے اب میں اس گھر کے اس اوپری حصے میں کسی کو آباد ہونے نہیں دوں گا۔ آتش اپنے نام کی طرح ہی گرم مزاج تھا اور بنا بھی چونکہ آگ کا تھا تو آتش مزاجی قدرتی طور پر بھی اس کی خصلت کا حصہ تھی۔ بھلے اس کا تعلق مسلمان قبیلے سے تھا لیکن بہت سے انسانوں کی طرح یہ بھی نام کا ہی مسلمان تھا۔ اس کا شمار شیاطین میں نہیں لیکن شریر جنات میں ضرور ہوتا تھا۔ کئی صدیوں پہلے جب یہاں دور دور تک صرف جنگل ہوتے تھے تب سے اس کے قبیلے والے اس علاقے میں نسل در نسل رہتے آ رہے تھے۔

اگلے دن علی نے اس گھر کے کرایہ نامے پہ دستخط کیے تو مکان دار بشیر نے پوچھا آپ لوگ کب تک شفٹ ہوں گے؟ بس ایک ہفتے تک۔ ٹھیک ہے ہم اوپر پورشن کی صفائی کروا دیں گے اور اوپر جو اسٹور میں سامان پڑا ہے وہ بھی خالی کر دیں گے۔ ہم اپنا اسٹور چھت پر بنوا رہے ہیں آپ کو کوئی زحمت نہیں ہو گی کیونکہ آپ نے بتایا تھا کہ پچھلے گھر میں بھی آپ ہی کے پورشن میں مکان داروں کے اسٹور کی وجہ سے آپ کو بہت پرائیویسی ایشوز تھے۔ اور گیراج کی بھی تنگی تھی۔ یہاں آپ کو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہو گا۔ ہمارے پاس گھر کی بیک سائیڈ پہ بھی گیراج ہے۔ ہماری ایک گاڑی وہاں بھی کھڑی ہو سکتی ہے۔

شفٹنگ سے ایک دن پہلے افراحہ نے علی کو نئے مکان چلنے کو کہا۔ مجھے اس کے واش رومز دیکھنے ہیں تاکہ انہیں کی کلر اسکیمز کے مطابق واش رومز ایکسیسریز خرید لیں۔

اف افراحہ! وائپرز، ڈسٹ بنز، فلور برشز وغیرہ کے لیے بھی تمہیں میچنگ چاہیے؟ علی نے کہا۔ بات میچنگ کی نہیں ہے مجھے اچھے بھلے گھر کو گھر ہی رکھنا ہے رنگ برنگی چیزیں رکھ کے سرکس نہیں بنانا۔ افراحہ نے جواب دیا۔ او کے میری پرفیکشنسٹ وائف چلتے ہیں اور پھر یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تینوں کمروں میں سے اپنا بیڈ کس روم میں شفٹ کرنا ہے۔

آتش جو قبرستان کی دیوار پہ بیٹھا ساتھ مکان کی کھڑکیوں کے شیشوں کے پار گھر میں کام کرتے کچھ لوگوں کو دیکھ رہا تھا دل تو کر رہا تھا کہ دن دیہاڑے ان سب کے سامنے جا کر خود کو ظاہر کر دے لیکن اپنے باپ کی سخت نصیحت کی وجہ سے وہ من چاہی کرنے سے قاصر تھا۔ اتنے میں اس کی تیز نظر سڑک پر سے گزرتی ایک کار کی دھیمی ہوتی رفتار پر پڑی، وہ ہوا میں معلق ہو گیا اور اگلے ہی پل وہ افراحہ کے گاڑی سے اترنے سے پہلے وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا لیکن غائب حالت میں جسے افراحہ دیکھ نہ سکتی تھی۔

افراحہ اور علی کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس گھر کے اندر داخل ہوا وہ ان کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا لیکن ان کی طرح زمین پر قدموں کے ساتھ نہیں بلکہ ہوا میں معلق ان کے سروں پر سے ہوتے ہوئے وہ بھی اوپر پورشن میں پہنچ چکا تھا جہاں مکان دار بشیر کے بوڑھے والد کچھ لوگوں سے کھڑکیوں اور دروازوں کی مرمت

کروارہے تھے۔

یہ گھر تو نیا ہے تو پھر یہ کام کونسے کروارہے ہیں؟ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی افراحہ نے علی سے کہا۔ جواب اس کے پاس بھی نہ تھا۔ افراحہ نے وقت کا ضیاع کیے بنا تینوں بیڈرومز میں جا جا کے واش رومز کی کلر اسکیم ذہن نشین کرنا شروع کردی۔ آج مطلع صاف ہونے کی وجہ سے سورج پوری آب وتاب سے جگمگا رہا تھا۔ کمروں اور واش رومز میں بھی گزشتہ بار کے برعکس بہت اجالا تھا پھر بھی افراحہ نے ہر بیڈروم اور واش رومز کی لائٹس آن کر کے جائزہ لیا تو ایک ہی منٹ میں اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے علی کو بلا کر ہر واش روم دکھایا۔ جس کے فلورز اور ٹوائلٹ سیٹس بیحد گندے تھے حتیٰ کہ فلورز پر موجود سفید رنگ کے سیوریج نیٹ کورز تک پیلے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے تو ہم سے کہا تھا کہ یہ برین ڈینیو ہاؤس ہے؟ اور اس دن بھی اس عورت نے کہا تھا کہ ہم تو نیچے والے پورشن میں شفٹ ہوئے تھے اور اوپر والا بنتا رہا تھا۔ تو یہ سب کیا ہے؟ میں کہہ رہی تھی نہ کہ یہ عورت لائٹس جلا کر گھر نہیں دکھا رہی تھی کہ کہیں اس کے استعمال شدہ گھر کی گندگی ہمیں نظر نہ آجائے؟ اور یہ فرش دیکھو ان کی لائنز دیکھو اتنی کالی؟ بنا استعمال کے ہو ہی نہیں سکتیں وہ بھی جب تک گھر بہت بری طرح استعمال نہ کیا گیا ہو۔ اور نئے گھر کی کھڑکیوں دروازوں کو مرمت کی کیا ضرورت؟ اور انہوں نے تو کہا تھا کہ ہم صفائی کروا کے دیں گے انہیں پتہ ہے کہ ہم نے کل شفٹ ہو جانا ہے۔ پورا ہفتہ گزر گیا ہے انہوں نے صفائی تک نہیں کروائی۔ وہ بہت غصے میں تھی۔ یار کل ہفتہ ہے تم صفائیاں کروا لینا ہم پرسوں شفٹ ہو جائیں گے ایک دن سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بس اب ریلیکس رہو اور آؤ دیکھیں اپنا اکلوتا بیڈروم فرنیچر کس کمرے میں رکھوانا ہے۔ علی نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور افراحہ کا ہاتھ پکڑے اسے ڈریسنگ روم سے باہر لے آیا۔

تبھی آتش نے ڈریسنگ روم میں کھڑے کھڑے ہی اپنی گردن کئی گز لمبی کر کے واش روم کے اندر جھانک کے دیکھا تو ٹوائلٹ سیٹ کے زنگ آلود آئرن جوائنٹس سے نیچے تک بنتی لکیروں کے نشان اور ان سے نکلتی بو کو محسوس کر کے مسکرانے لگا۔ سیڑھیوں سے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی جو پہلا بیڈروم دائیں ہاتھ پہ تھا وہ کافی چھوٹا تھا۔ اس کے آگے دائیں ہاتھ ہی کچن اور پھر راہداری تھی جس کے دائیں بائیں، آمنے سامنے دو ٹیرس تھے۔ دائیں ہاتھ والا ٹیرس باہر کی جانب کھلے میدان کا نظارہ پیش کرتا تھا جہاں اس دن سفیدے کے درختوں کا ڈھیر پڑا تھا جو بعد میں اٹھوالیا گیا ہوگا تبھی آج میدان بالکل صاف تھا بس اس میدان کے وسط میں سوسائٹی کے پانی کی ٹینکی تھی جس کے اوپر سوسائٹی کا نام لکھا تھا۔ اور راہداری کے بائیں جانب ٹیرس گارڈن تھا جہاں پچھلی دیوار میں بہت چھوٹی سی مصنوعی آبشار کے لیے پتھر اور مشینری فٹ کی گئی تھی اور زمین پر سینتھیٹک گراس یعنی مصنوعی گھاس کارپیٹڈ تھی۔ ان دونوں ٹیرسز کے بعد دائیں، بائیں ایک ایک بیڈروم تھا اور راہداری کے اختتام پر ایک اسٹور روم تھا جس کا دروازہ اس وقت شاید کام کروانے کی وجہ سے کھلا ہوا تھا اور اندر بے تحاشہ کاٹھ کباڑ نظر آرہا تھا جسے دیکھ کر افراحہ کو مزید تپ چڑھ گئی۔ انہوں نے یہ بھی ابھی تک خالی نہیں کیا؟ اس نے علی سے پوچھا۔

ہو جائے گا سب، تم ادھر آؤ اور علی اسے ٹیرس گارڈن سے منسلک آخری بیڈروم میں لے آیا جس کے پیچھے ہی قبرستان تھا اور اس کمرے کی پچھلی دیوار کی کھڑکی کے باہر ایک بالکنی تھی جہاں کھڑے ہو کر قبرستان کی وہ چند قبریں بھی نظر آتی تھیں۔ یہ کمرہ ٹھیک ہے بہت وینٹیلیٹڈ ہے ایک طرف ٹیرس گارڈن کا ویو اور دوسری طرف باہر کا۔ علی نے کہا۔

اور باہر قبرستان کا ویو۔ اس نے علی کو یاد دلایا۔

ارے تو کیا ہوا؟ ابھی زیادہ قبریں نہیں ہیں، علی بولا۔

اور جو صبح سے دوپہر ٹیرس گارڈن کی گلاس وال سے دھوپ آئے گی او پھر سورج غروب ہونے تک بالکنی

والی گلاس ونڈو سے؟ یعنی سارا دن یہ کمرہ دھوپ میں تپتا رہے گا۔ افراحہ نے بات ختم ہی کی تھی کہ مکان دار بشیر کے والد کمرے میں آگئے۔ بیٹا! آپ اسے اپنا مین بیڈروم بنالو اس میں دونوں جانب کھڑکیاں ہیں۔

پر انکل! یہاں اے سی پوائنٹ دیوار کے آخر میں ہے، پورے کمرے میں کولنگ نہیں ہوگی۔ افراحہ نے کہا تو وہ بولے، نہیں بیٹا! پہلے بھی یہیں اے سی لگا ہوا تھا۔ کولنگ ہو جاتی ہے پورے کمرے میں۔ وہ دونوں اس بات پہ چونکے۔ پہلے کب؟ کیا پہلے بھی کرائے دار رہتے تھے یہاں؟ افراحہ نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

نہیں بیٹا! کرائے دار نہیں، ہم رہتے تھے نا۔ ایک سال رہے ہیں۔ یہ گھر بننے کے بعد جب ساری فنشنگ اور لکڑی کا کام رہتا تھا تو ہم اوپر شفٹ ہو گئے تھے اور نیچے والا پورشن بنتا رہا تھا جب وہ مکمل ہو گیا تب ہم نیچے شفٹ ہو گئے۔

یہ بات سن کر تو افراحہ کا دماغ بالکل ہی گھوم گیا۔ اللہ حافظ! چلیں؟ اس نے علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور خود پیر پٹختے ہوئے باہر آگئی۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں اتری اور اس کے پیچھے علی اور آتش جو افراحہ کو غصے میں سیڑھیاں اترتے دیکھ رہا تھا، علی کو اس کے پیچھے جاتا دیکھ کر وہیں لاؤنج میں کھڑا خوشی سے ناچنے لگا تھا لیکن اس کا ناچ بھی اسی کی طرح عجیب تھا وہ اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں اوپر نیچے کرتا تو کبھی اپنے سر کو اوپر نیچے اور کبھی آگے پیچھے جھٹکے دیتا اور کبھی اپنی گردن کو ادھر ادھر گھماتا بس ایک چیز مستقل تھی اور وہ تھی اس کے عجیب چہرے کی پراسرار مسکراہٹ۔ اور پھر وہ اچانک رکا اور کچھ یاد آنے پر فوراً غائب ہو گیا اور اگلے ہی پل وہ گھر کے سامنے کھڑی گاڑی کے بونٹ پر الٹا لیٹا اپنی گردن کو پھر سے لمبا کیے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی افراحہ کی سائیڈ والی کھڑکی میں ٹکا کے مسکرانے لگا مگر پہلے کی طرح انسانی نظروں سے اوجھل۔

افراحہ گاڑی میں بیٹھتے ہی پھٹ پڑی۔ کہہ رہی تھی نہ میں تمہیں؟ مجھے یہ گھر استعمال شدہ لگ رہا ہے۔ وہ بھی اچھا خاصا رگڑا ہوا ہے۔ ہم سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ مکان دار بشیر کے معصوم والد کو خبر نہیں تھی کہ ہمیں یہ گھر کیا کیا جھوٹ بول کر کرائے پہ دیا گیا ہے اور وہ اپنی معصومیت میں ہمیں سب بتا بیٹھے۔ ابھی کے ابھی پراپرٹی ڈیلر کو فون کرو، ڈیل کینسل کرو، اس سے کہو ہمارا ایک ایک پیسہ واپس کرے۔ جھوٹے، گندے لوگ۔ جانوروں کے گھر بھی اتنے گندے نہیں ہوتے، اور یہ تو پھر ان کا اپنا گھر ہے لیکن لگتا ہے جیسے زندگی میں کبھی انہوں نے فرشوں اور واش رومز کی صفائیاں نہیں کیں اور اسٹور روم میں کباڑ دیکھا ہے؟ حرام کے پیسے ہیں کیا تمہارے؟

افراحہ کی ساری باتیں سن کے آتش کے چہرے کی مسکراہٹ اور پھیل گئی اور وہ افراحہ سے اتفاق کرتے ہوئے ہاں میں سر ہلانے لگا۔

تو کیا ہو گیا اگر گھر استعمال شدہ ہے؟ کل اپنی کام والی کو لا کر صفائیاں کروالینا۔ علی چڑ چکا تھا۔ اس کی اس آواز پہ اب آتش علی کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ میری کوئی فل ٹائم کام والی نہیں ہے، پورے محلے کا کام کرتی ہے اس کے پاس وقت نہ ہوا تو؟ اور یہ کوئی ایک دو گھنٹے کی صفائی نہیں پورے دن کا کام ہے مجھے بھی ساتھ لگنا پڑے گا۔ اور میرے پاس صرف ایک بیڈروم کا فرنیچر ہے۔ جہیز کے صوفے پہلے ہی سیل ہو چکے ہیں۔ میں برینڈ نیو فرسٹ اینٹری گھر صرف اسی لیے ڈھونڈتی رہی تھی کہ نیا فرنیچر نئے گھر میں ہی آئے اور میں اس گھر کو اپنے حساب سے سیٹ کر سکوں۔ افرحہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے تو آتش کے چہرے کی مسکراہٹ پل میں غائب ہو گئی اور اب وہ نہایت سنجیدہ ہو کے افراحہ کی باتیں سننے لگا۔

اس سے بہتر کنڈیشن تو بہت سے استعمال شدہ گھروں کی تھی جو ہم نے ریجیکٹ کیے۔ اگر کوئی پرانا گھر ہی لینا تھا تو شہر سے اتنی دور کیوں آئے؟ صرف اسی لیے نہ کہ یہ نیا گھر ہے۔ مگر پراپرٹی ڈیلر، مکان دار سب نے جھوٹ بول کے بیوقوف بنایا ہے۔ میں جھوٹ

برداشت نہیں کرسکتی۔ اخلاق۔ اخلاق۔ خاک اخلاق کے اچھے ہیں۔ جھوٹے، فراڈ، منافق۔ وہ مسلسل بولتے جارہی تھی۔

بس کردو۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں پچھلے مکان کا ایڈوانس واپس لے چکا ہوں اور یہاں تین مہینے کا ایڈوانس دے چکا ہوں۔ اگر یہ لوگ کسی طرح میرا کرایہ واپس کربھی دیں تو پراپرٹی ڈیلر اپنا کمیشن کبھی واپس نہیں کرے گا۔ وہ پیسہ بھی ڈوب جائے گا۔ کچھ مہینے یہاں گزارلو بس پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم نہیں رہیں گے ان جھوٹے لوگوں کے ساتھ۔ تم صحیح کہتی تھی کہ یہ جتنا منہ پہ میٹھا بن رہے ہیں، اتنے ہی منافق ہیں۔ مجھے ہی لوگوں کی پہچان نہیں ہوتی اور ظاہری اخلاق پہ یقین کرلیتا ہوں۔ تم کسی نئے مکان کو سیٹ کرنا چاہتی ہو نا؟ تو بس ہم یہاں کوئی فرنیچر نہیں خریدیں گے۔ کوئی نیا مکان دیکھیں گے۔ تم اپنی مرضی سے اپنی پسند سے اسے فرنشڈ کرنا لیکن پلیز افراحہ ابھی کے لیے بس خاموشی سے گزارا کرلو جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ ہم یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہیں گے، آئے پرامیس! علی نے افراحہ کو بہت تفصیل سے سمجھایا۔

وہ زبان سے تو خاموش ہوگئی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بہہ رہی تھیں۔ شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے اور اسے اپنا ایک گھر نصیب نہیں ہورہا تھا۔ کرائے کا کوئی بھی مکان اسے گھر بنانے کے لائق نہ لگتا اور جو پسند آتا وہاں رہنا نصیب نہ ہوتا۔ کہیں گھر میں رہائش پزیر گارڈز اور ملازموں کی کھچ کھچ جو مکان داروں اور کرائے داروں میں غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ تو کہیں مکان داروں کا اوپر والے پورشن میں کوئی نہ کوئی کمرہ یا اسٹور روم اپنے پاس رکھ کے دن رات پرائیویسی میں مخل ہونے کا مسئلہ، تو کہیں گیراج میں مکان داروں کی دو دو گاڑیوں کے بیچ ان کی اپنی اکلوتی گاڑی کی پارکنگ کا مسئلہ۔ اور اس گھر کا تو افتتاح ہی جھوٹ اور دھوکے سے ہوا تھا۔ وہ بہت رنجیدہ تھی۔ گھر کو سیٹ کرنے کا خواب ایک بار پھر سے ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

اور آتش اس کی روتی آنکھوں کو دیکھ کے اپنی آنکھوں سے جھلکتی پریشانی سے بے خبر الجھا الجھا سا گاڑی کے بونٹ سے اتر آیا تھا۔

علی گاڑی کو بڑھا لے گیا۔ سوسائٹی گیٹ سے باہر جانے تک آتش کی نظریں انہیں پہ جمی رہیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ جن لوگوں کو اس گھر میں آباد نہ ہونے دینے کے لیے وہ اتنا بضد تھا آج انہی کو پریشان دیکھ کے اسے خوشی کی بجائے دکھ کیوں ہورہا تھا۔ اور تبھی ابرام ٹپک پڑا۔ کیا بات ہے؟ وہ آتش کی شکل پہ پھیلی پریشانی کو دیکھ کر پوچھ رہا تھا لیکن آتش اس وقت بھڑکتی ہوئی آگ نہیں بلکہ اندر ہی اندر کسی سلگتے کوئلے کی مانند دہک رہا تھا۔ خاموش اور غیر متحرک۔

افراحہ اگلے دن اپنی پچھلے گھر کی کام والی کو لاکر اس گھر کی صفائیاں کروارہی تھی۔ جہاں ہر کمرے کی الماری سے بے جا سامان ملتا گیا۔ جو اس نے کام والی کے ہاتھ نیچے رہائش پزیر مکانداروں کو بھیج دیا۔ اور اسی طرح کچن اور لاؤنج کے کیبنیٹس میں سے بچی جلی بچا برتن، ردی، کتابیں اور نہ جانے کیا کیا برآمد ہوتا گیا۔ وہ غصے میں بڑبڑاتی اور کام میں لگ جاتی۔ اس نے کام والی کے ساتھ مل کر پورے پورشن کی ایک ایک الماری، دراز، کیبنٹ ہر چیز اندر باہر سے اچھی طرح صاف کی اور اسی دوران اسے کچن کے سنک کا نل کھولنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو اس میں سے برائے نام پانی نکلتا دیکھ کر اسے مزید غصہ آگیا تبھی مکاندار عورت آسیہ اوپر آئی۔ ویلکم ہوم! اس نے مسکرا کر افراحہ کے لیے اپنی بانہیں پھیلا لیں۔

افراحہ جو اس جھوٹی اور مکار عورت کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی مصلحتاً گلے لگ گئی۔ آسیہ آپی! یہ نل سے پانی بہت کم آرہا ہے۔ افراحہ نے پوچھا۔ دراصل یہ برینڈڈ نل ہے نہ واٹر سیونگ ٹیکنالوجی! اس میں پانی کم ہی آتا ہے۔ کیا؟ اوہ نو! لیکن واٹر سیونگ ٹیپ میں شاور بھی تو ہوتا ہے پانی کا

پریشر بلڈاپ کرنے کے لیے۔ اس نے آسیہ کو ایک ہی جملے میں احساس دلا دیا تھا کہ وہ کرائے دار صحیح لیکن کافی آپ ڈیٹڈ لڑکی ہے۔ ایک لمحے کو آسیہ اس کی بات پر چونکی اور اگلے لمحے اسے بتانے لگی ہاں یہ بٹن ہے پر اسے دبائے رہو تو شاور ہوگا چھوڑو گے تو بند۔ پر اسے دبائے رکھوں گی تو ایک ہاتھ سے برتن کیسے دھوؤں گی؟ اور بنا شاور تو پانی کا اتنا پریشر ہی نہیں ہے۔ میں کچن میں کام کیسے کروں گی؟ افراحہ نے پریشان ہوتے ہوئے آسیہ سے پوچھا۔ برینڈڈ ہے نہ اب کیا کریں؟ اور فخر سے مسکرانے لگی۔ اور اس کی اس شو آف پہ افراحہ دل ہی دل میں اس سے مزید خائف ہوگئی۔ آپ ذرا میرے ساتھ آئیں! اس نے سب واش رومز کی ٹوائلٹ سیٹ کے آئرن جوائنٹس سے نکلتے زنگ کو پانی میں جا کر ملتے اور اس سے پھیلی بو کے بارے میں آسیہ کو بتایا۔ اچھا دکھاؤ مجھے۔ اوہ اچھا! آسیہ نے دوپٹہ ناک پہ رکھتے ہوئے کہا یہ کام والی پہ دھیان نہ دو تو یہ ایسی ہی صفائی کرتی ہیں۔ اور یہ استعمال نہیں ہوئے نہ اس لیے۔ دیکھیں کام والی کا تو پتہ نہیں لیکن میں نے کبھی کسی سینیٹری کے آئرن جوائنٹس سے رسٹ نکلتا نہیں دیکھا بلکہ سینیٹری میں آئرن نہیں اسٹیل استعمال ہوتا ہے تاکہ پانی پڑنے سے رسٹڈ نہ ہو لیکن اتنا زنگ اور وہ بھی ہر واش روم میں؟ میری کام والی نے انکار کردیا ہے انہیں صاف کرنے سے تو آپ پلیز اپنی کام والی سے کم از کم مجھے واش رومز تو صاف کروادیں۔ افراحہ کی صاف گوئی پہ آسیہ ذرا جھجکی۔ اچھا میں بھیجتی ہوں۔ وہ دراصل سب فنگو برینڈڈ ہیں نہ۔ اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

برینڈڈ کی ماں! گھر صاف رکھنے کی تمیز نہیں اور برینڈڈ برینڈڈ کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ شو آف کی ماری احساسِ برتری کا شکار جھوٹی عورت۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ افراحہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہ سب اس کے منہ پہ سنا ڈالتی لیکن علی نے اسے اپنا غصہ قابو میں رکھنے اور مصلحت سے کام لینے کی بہت تاکید کی تھی۔ وہ پھر سے کچن کی صفائی میں جت گئی۔

اور آتش لاؤنج میں برینڈڈ برینڈڈ لفظ دہراتا کچھ سوچنے لگا۔ آسیہ کی کام والی دبے قدموں آئی اور صرف ٹوائلٹ سیٹس کو دھو کر چلی گئی افراحہ نے اسے لاؤنج سے واپس جاتے دیکھا تو بھاگ کر واش رومز چیک کرنے گئی جس کے فرش، سیوریج جالی کے ڈھکنے سب کچھ ویسے ہی پڑا تھا سوائے زنگ کے۔ اسے اس ادھورے کام پہ بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے ساتھ لائے سارے فلور کلینز، ٹوائلٹ کلینز اور سرف کے پیکٹ واش رومز میں خالی کردیے اور اس کی ملازمہ نے جی جان ایک کر کے انہیں نئے جیسا چمکا دیا لیکن اس ایک عمل میں ہی انہیں تین گھنٹے لگ گئے۔ ابھی باتھ رومز کے علاوہ صرف کچن اور کمروں کی الماریاں ہی صاف ہوئی تھیں۔ گھر کی باقی صفائیاں ابھی رہتی تھیں۔

علی انہیں ایک ریسٹورانٹ سے کھانا لاکر دے گیا تھا۔ اسے بھوک محسوس ہوئی تو اس نے اپنی ملازمہ سے کہا چلو کھانا کھاتے ہیں۔ لیکن مائیکرو ویو تو ہے نہیں ابھی، یہاں سامان تو کل آئے گا۔ ابھی تو بیٹھنے کے لیے بس یہ تین فولڈنگ چیئرز ہی لائے ہیں ہم۔ تم ٹھنڈا کھانا کھالوگی؟ افراحہ نے پوچھا۔

جی باجی کھالوں گی۔ ملازمہ نے جواب دیا۔

اچھا میں ذرا منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں، افراحہ یہ کہہ کر کچن سے چلی گئی لیکن جب واپس لوٹی تو ملازمہ نہیں تھی اور پھر اگلے ہی لمحے وہ وارد ہوگئی۔ وہ جی میں نیچے گئی تھی، نیچے والی باجی سے ماچس اور کوئی پتیلی مانگنے کہ ہم کھانا چولہے پہ گرم کرلیں گے پر باجی نے کہا کہ یہ چولہے بنا ماچس کے ہی جل جاتے ہیں۔ اسے ملازمہ پہ بڑا غصہ آیا۔ پچھلے تین گھروں کے چولہے بھی سیلف سپارک برنر تھے۔ مجھے کبھی تم نے ماچس استعمال کرتے دیکھا؟ ایک سٹو و لائٹر رکھا ہوا تھا وہ بھی احتیاطاً لیکن کبھی اس کی بھی ضرورت نہیں پڑی اور تم مجھ سے بنا پوچھے نیچے ماچس مانگنے چلی گئی۔ نیچے والی کیا سوچے گی کہ کسی پنڈ سے اٹھ کر آئے ہوئے ہیں ہم؟ اسے تو پہلے ہی شو آف کا موقع چاہیے۔ اس نے غصے سے سیلف برنر آن

کیا اور اسکرین ٹچ چمنی کو بھی آن کر دیا۔

ابھی وہ کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئی تھیں کہ آسیہ آ گئی۔ اس کے چہرے پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ سٹوو آن ہو گیا؟ اس نے پوچھا۔ جی! میں نے چینک نہیں کیا تھا اور یہ مجھے بنا بتائے آپ سے ماچس اور پتیلی لینے چلی گئی۔ افراحہ نے بجھے دل کے ساتھ جواب دیا۔ تو آسیہ جانے کے لیے پلٹی۔ اور پھر کچھ یاد آنے پہ واپس مڑ کے پوچھا۔ اور وہ ہوڈ کا پتہ چل گیا آپ کو؟ کیسے چلتا ہے؟ اور افراحہ اس کے اس سوال پہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور اپنے تاثرات سنبھالتے ہوئے بولی۔ جی وہ تو سکرین ٹچ ہی ہے؟ نہیں میں نے سوچا یہاں سب کچھ بریتھڈ ہے نہ تو اکثر لوگوں کو ان کا استعمال نہیں آتا۔ آسیہ کی بات پہ اب اس سے خاموش نہیں رہا گیا۔

میرے پچھلے دونوں گھروں میں یہی سیلف سپارک سٹوو اور ٹچ سکرین چمنیز ہی تھیں تو الحمدللہ مجھے ان کا استعمال پتہ ہے۔ افراحہ کے جواب پہ آسیہ بولی کہ دراصل میں یہی سوچتی تھی کہ جب کوئی گھر دیکھنے آئے گا تو میں اسے کیسے ایکسپلین کروں گی؟ مجھے بتانا نہیں آتا کہ یہ فلور ٹائلز جرمنی کی ہیں، وہ ڈورک اٹلی۔

وہ ابھی بول ہی رہی تھی کہ افراحہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی، جی نہیں! یہ پاکستانی ٹائلز ہیں، نظر آ رہا ہے۔ میں ویسے بھی انٹیریئر ڈیزائنر ہوں۔ اپنا گھر نہ سہی لیکن شادی کے بعد سے جب کرائے کے گھروں میں رہنا پڑا تو الحمدللہ اچھے سے اچھے گھروں میں رہ چکی ہوں۔ اور دیکھتے ہی بتا سکتی ہوں کہ یہ سب کچھ لوکل ہے۔ ویسے آپ ایک منٹ ادھر آئیں اس نے آسیہ کو کچن میں آنے کو بولا جہاں اس نے چولہے کے جلے ہوئے گندے سوئچز دکھاتے ہوئے کہا، یہ دیکھیں! یہ سب بھی جلے ہوئے ہیں اور سٹوو بھی بہت گندا ہے۔ حالانکہ ابھی ہم نے اسے بہت صاف کیا ہے۔

آسیہ جو پہلے ہی اپنے بھرم دکھانے پر افراحہ کے کڑے جواب سن کر ذرا خاموش ہو گئی تھی، ایک دم ہی یہ کہہ کر جانے کے لیے پلٹ گئی کہ استعمال نہیں ہوئے نہ اسی لیے، ویسے بھی یہ سب برینڈڈ ہیں۔

اور افراحہ وہیں کچن میں کھڑی ماتھے پہ ہاتھ مار کر اپنی ملازمہ کو دیکھنے لگی۔ باجی! بنا استعمال کے بھلا کونسی چیزیں گندی اور خراب ہوتی ہیں؟ ملازمہ بھی آسیہ کے جھوٹ پر چپ نہ رہ سکی۔ چھوڑو۔ چلو اندھیرا ہونے والا ہے اور ابھی ساری سوئیپنگ اور موپنگ رہتی ہے پھر تمہیں تمہارے گھر بھی چھوڑنا ہے اور وہ دونوں پھر سے کام میں لگ گئیں۔

کہاں تھے تم؟ ابرا پوچھ رہی تھی تمہارا۔ ابرام نے آتش سے پوچھا جو افراحہ کے لوٹ جانے کے بعد اندھیرا ہونے پر قبرستان کی دیوار پر آن بیٹھا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا، وہ بس گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس دن والی لڑکی آج بھی آئی ہوئی تھی نہ؟ بڑے کام کر رہے تھے یہ لوگ۔ اس گھر میں آنے کی تیاری ہو رہی ہے نہ؟ آنے دو ان کو انہیں ان کے سامان سمیت اٹھا کے گھر سے باہر پھینک دیں گے۔ دیکھتے ہیں کون رہتا ہے اوپر کمروں میں ہمارے سوا؟

ابرام نے اپنے بھائی آتش کو جوش دلایا تو وہ بولا، اس کی ضرورت نہیں! وہ لوگ خود ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ انہیں اس گھر کے مالک پسند نہیں آئے اور نہ گھر۔ اور ہماری دشمنی تو ویسے بھی اس گھر کے مالکوں سے ہے، نہ کے ان کرائے داروں سے۔ ان بیچاروں کا کیا قصور؟ وہ تو خود ان کے دھوکے کا شکار ہوئے ہیں۔ آتش کا یہ انداز ابرام کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ جو کل تک اس گھر کے اوپر والے پورشن کے آخری کمرے کو اپنے ٹھکانے کے لیے چن چکا تھا، آج ان نئے لوگوں کے آگے کیسے ہتھیار ڈال بیٹھا تھا؟ آخر ماجرا کیا تھا؟ اسے آتش کے مزاج بدلے بدلے نظر آ رہے تھے۔

خیریت ہے؟ تم نے اپنا ارادہ کیسے بدل لیا؟ ابرام نے سوال کیا۔ بدلا نہیں، بس کچھ دیر کے لیے ملتوی کیا ہے۔ ان نئے لوگوں کے ساتھ بھی اس گھر کے مالکوں نے غلط کیا ہے یعنی وہ بھی میری طرح ان گھر

والوں سے خائف ہیں۔ تو بس اسی مماثلت کی وجہ سے میں نے فی الحال نئے آنے والوں کو تھوڑی مہلت دی ہے۔ لیکن جس دن انہوں نے بھی ہمارا برا کرنے یا ہمیں نقصان پہنچانے کی ٹھانی، میں انہیں بھی نہیں چھوڑوں گا، سب تہس نہس کر دوں گا۔

علی اور افراحہ کو آئے دو روز ہو چکے تھے۔ علی آفس جا چکا تھا اور افراحہ جو پچھلے کچھ دن کے کام، صفائیاں، پینٹنگ اور پھر ان پیکنگ، سب چیزوں سے تھک چکی تھی، بیڈ پہ پڑی تھی کہ باہر لاؤنج کا دروازہ جو کہ نیچے سے آتی سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا زوردار آواز کے ساتھ بج اٹھا۔ وہ اٹھ کے لاؤنج تک آئی اور پوچھا کون ہے؟ کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پھر سے پوچھا کہ کون ہے؟ کہ تبھی اس کے کمرے اور ڈریسنگ روم کے بیچ کا دروازہ بجنے لگا۔ وہ پلٹی تو راہداری سے گزرتے ہوئے اس کی نظر گلاس وال ونڈو سے ٹیرس گارڈن کے اوپر کھلے آسمان پر پڑی۔ ہلکا سنہری آسمان مٹی سے دھندلایا ہوا تھا بادلوں نے سورج چھپا رکھا تھا۔ اپریل کے مٹیالے موسم میں ٹیرس گارڈن کی پچھلی دیوار کے پیچھے سے باہر لگے ایک پیپل کے پیڑ کی سب سے اونچی شاخوں کے پتے ادھر ادھر جھولتے نظر آ رہے تھے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آندھی آ رہی ہے۔ اور شاید اسی کی آواز سے دروازے بج رہے ہیں۔ یہ سوچ کر اس کا ذرا تھوڑا کم ہوا ہی تھا کہ اسے ایک ساتھ ماسٹر بیڈروم، لاؤنج اور ڈریسنگ روم کے دروازے ایک ساتھ بجتے سنائی دیے۔

باہر آندھی نے زور پکڑ لیا تھا وہ گھبرا کر پھر سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ وہ سونا چاہتی تھی لیکن دروازوں کے بجنے کی آوازیں اتنی پرزور تھیں کہ کئی بار وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھتی۔ یوں لگتا جیسے کوئی زور زور سے پکڑ کر ان دروازوں کو بجا رہا ہے۔ آٹھ آٹھ فٹ اونچے مضبوط لکڑی کے دروازے بند ہونے کے باوجود بھلا اتنی زور زور سے کیسے بج سکتے ہیں؟ یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی۔

اس نے آیت الکرسی پڑھ کر خود پر دم کیا اور کانوں پر کشن رکھ کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ پورا گھر سامان سے خالی تھا سوائے اس کے اس ماسٹر بیڈ روم کے اور وہ یہ بات جانتی تھی کہ خالی گھر میں آوازیں زیادہ گونجتی ہیں لہٰذا وہ ان آوازوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جیسے ہی آنکھ بند کرتی اس کے کمرے سے منسلک ڈریسنگ روم اور اس ڈریسنگ روم سے منسلک واش روم کے دروازے بج اٹھتے لیکن یہ بات اسے سمجھ نہ آتی کہ واش روم کی کھڑکی تو بند ہے تو پھر اس کا اور ڈریسنگ روم کے دروازے کو اتنے زور سے ہلا ڈالنے والی ہوا آخر کدھر سے آ رہی ہے؟ یہی اصول اس کے بیڈروم کے دروازے پہ بھی لاگو ہوتا تھا کہ لاؤنج اور رہداری کی بھی کھڑکیاں بند تھیں اور لاؤنج اور سیڑھیوں کے بیچ کا داخلی راستہ بھی بند تھا تو اس کے بیڈروم کا دروازہ اتنی زور زور سے کیسے بج سکتا تھا؟

اسی سب حساب کتاب کے چلتے وہ کسی قدر خوف میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس نے سونے کا ارادہ ملتوی کیا اور یونہی آنکھیں کھولے بیڈ پر لیٹی رہی۔ دروازے بجنے کا یہ سلسلہ دو تین گھنٹے تک چلتا رہا۔ آندھی ختم ہو چکی تھی لیکن باہر تیز ہوائیں چلنا بند نہیں ہوئی تھیں۔ رات کو سونے کے لیے لیٹتے ہی دروازے بجنے کا یہ سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔

علی نے گھبرا کر افراحہ کو دیکھا اور اسے مذاق میں ڈراتے ہوئے بولا۔ یہ کون ہیں جو اتنی رات کو دروازے بجا رہے ہیں؟

سارا دن یہ دروازے بجتے رہے ہیں اور میں سو نہیں سکی، پلیز اب تم مت ڈراؤ، افراحہ تھکاوٹ سے چڑی ہوئی تھی۔

میں تو مذاق کر رہا تھا۔ شکر کرو ابھی تو ہم نے قبرستان کی طرف والے اس آخری کمرے کو اپنا بیڈروم نہیں بنایا ورنہ تمہارا تو پتہ نہیں کیا بنتا؟ ڈرپوک کہیں کی! علی نے اسے چھیڑا تو وہ ناراضگی سے اسے دیکھنے لگی۔ اچھا سوری! ارے باہر ہوا ہی اتنی تیز ہے۔ چلو تم

سو جاؤ، میں ہوں نہ۔ دیکھ لوں گا جو آئے گا۔ علی نے پھر سے اسے ڈرایا۔ افراحہ نے اسے گھورا تو وہ بولا۔ اچھا اچھا کوئی نہیں آئے گا۔ تم سو جاؤ۔ بس ہوا سے بج رہے ہیں اور کچھ نہیں۔ اور وہ کروٹ لیے پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر یہ آوازیں اتنی زوردار اور مسلسل تھیں کہ اس کا دل بار بار حلق میں آ جاتا۔ لیکن علی تو پانچ منٹ کے بعد ہی خراٹے لینے لگا۔ اور تبھی ان کے بیڈ روم کا دروازہ اتنی زور سے بجا کہ افراحہ تقریباً چیخ اٹھی اور علی کی بھی آنکھ کھل گئی۔

کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ علی گھبرا کر بولا تو افراحہ بیڈ پر بیٹھی کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو اتنی زور زور سے بج رہا تھا جیسے کوئی بہت طاقتور شخص اسے پکڑ کے زور زور سے بجا رہا ہو۔ ایک پل کے لیے تو وہ بھی گھبرا گیا۔ ارے کچھ نہیں! میں نے کہا ہے نہ کہ ہوا ہے ہی بہت تیز۔ پلیز سو جاؤ۔ اچھا آؤ میں سلاتا ہوں اور افراحہ اس کے بازوں میں منہ چھپا کے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

علی نے افراحہ کے کان پہ ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ دیر تک وہ ان آوازوں سے ڈر کر بار بار کانپ جاتی اور علی اسے بچوں کی طرح تھپکیاں دے کر تسلی دینے لگتا۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اگلے روز آفس جانے سے پہلے علی بولا۔ افراحہ دھیان سے رہنا، رات والے جن پھر نہ آ جائیں۔ اس سے پہلے کہ اسے گھورتی افراحہ اس پہ چلائی تو وہ ہنستے ہوئے لاؤنج سے باہر بھاگ گیا۔ اور وہ سر جھٹک کے کچن کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

میرا خیال ہے یہ لوگ جلد ہی یہ گھر چھوڑ کے چلے جائیں گے۔ یہ ڈر تو رہی ہے۔ اسی طرح ڈراتے رہے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ابرام ٹیرس گارڈن کی دیوار پہ بیٹھا آتش سے کہہ رہا تھا اور آتش راہداری سے گزرتی، کبھی لاؤنج اور کبھی کچن اور کبھی بیڈ روم میں آتی جاتی افراحہ کو بنا پلک جھپکائے دیکھ رہا تھا، بولا۔ تجھے کہا تھا نہ کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں کا یہاں زیادہ دن رہنے کا ارادہ نہیں ہے۔ آتش! اس سے پہلے تو تو کچھ اور ہی کہتا تھا کہ یہاں میں ایک دن بھی کسی کو رہنے نہیں دوں گا اور اب ان نئے آنے والوں کو اتنی رعایت دے رہا ہے، ایرا کو پتہ چلا تو؟ سچ بول، بات کیا ہے؟ ابرام دیوار سے کود کر ہوا میں جھولتا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ایرا کی دھمکی مت دے مجھے، اچھا جو کرنا ہے کرو تم لوگ۔ اور آتش یہ کہتے فوراً ہی دیوار سے ہوا میں اچھل کر اوپر پرواز کر گیا۔

ابرام نے شیشے کے پیچھے، اندر راہداری سے گزرتی افراحہ کو ایک نظر دیکھا اور پھر خود بھی ہوا میں اچھلتا آتش کے پیچھے لپک گیا۔

علی! واش بیسن کی فٹنگ ٹیڑھی اور بہت کم ہائیٹ پر ہے، مجھے منہ ہاتھ دھونے اور وضو کرنے کے لیے بہت جھکنا پڑتا ہے اور ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے پانی کے سب چھینٹے کپڑوں پہ پڑتے ہیں پلیز اسے صحیح کروا اور کچن کا نل بھی بدلہ جائے گا اس میں پانی نہ ہونے کے برابر آتا ہے، بہت دیر کھڑا رہنا پڑتا ہے برتن دھونے کے لیے۔ پہلے ہی شفٹنگ کی تھکن ہے اور ان چیزوں کی وجہ سے میری ریڑھ کی ہڈی میں بھی تکلیف ہونے لگی ہے۔ افرحہ نے علی کو اس گھر کے مین مسائل بتائے۔

ٹھیک جناب! آپ کا کام ہو جائے گا اور حکم؟ علی بولا۔

پہلے اتنا تو کروا دو، افراحہ نے کہا۔

بشیر کہہ رہا ہے کہ یہ واش بیسن کی فٹنگ ایسی ہی ہے، برینڈڈ جو ہے۔ اور کچن میں بھی ہم نے برینڈڈ واٹر سیونگ نل لگوایا ہے تو ان کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ علی نے اگلے دن افراحہ کو بتایا تو وہ تپ گئی۔ کیا؟ کیا بکواس ہے یہ سب؟ برینڈڈ، برینڈڈ۔ ان سے کہو کہ ہر گھر میں آج کل برینڈڈ سینٹریز ہی ہوتی ہیں لیکن فٹنگ تو اپنی مرضی، اپنے حساب سے کروانی ہوتی ہے نہ؟ اب برینڈ کو اپنے سر کی ہائیٹ پہ لگوا لو یا پیروں میں لگوا لو۔ اور ان کا واش بیسن نارمل اوسط اونچائی سے بہت نیچے لگا ہوا ہے اور وہ بھی ٹیڑھا۔ افراحہ کی باتیں سن کر علی غصے میں آتے ہوئے بولا، تو اب میں کیا کروں؟ میری بے عزتی کروا دی ہے تم نے۔ وہ بشیر ہنس ہنس کر مجھے کہہ رہا تھا کہ یہ برینڈڈ ہے، ایسے ہی لگتا ہے۔

تو تمہیں اسے جواب نہیں دینا آیا؟ کہ تم اس سے اچھے گھروں میں رہ چکے ہو۔ ہر جگہ برینڈڈ فٹنگز ہی تھیں۔ آپ نے تین مہینے کا ایڈوانس لیا ہے تو ہمارے کام کروا کے دیں اور پانی کی موٹر لگوا کے دیں۔ ایک تو اوپر پانی آتا ہی کم ہے اور لائٹ جانے کے بعد تو بالکل ہی بند ہو جاتا ہے۔ کام والی اکثر پانی کا انتظار کر کر کے چلی جاتی ہے بنا کپڑے دھوئے جبکہ نیچے والے پورشن میں آتا رہتا ہے لیکن اوپر صرف ٹینکی سے آتا ہے جو خالی رہتی ہے کم از کم موٹر لگوا کر ٹینکی تو بھر دیا کریں۔ افراحہ نے ایک اور مسئلہ گنوا دیا۔

بھاڑ میں جائے سب۔ میں اب اس جاہل آدمی سے بات نہیں کروں گا۔ علی اڑ گیا۔

تو ٹھیک ہے پھر جلد دوسرا گھر ڈھونڈو، میں اس گھر کے ساتھ مزید نہیں کھپ سکتی، افراحہ غصے میں بولی۔

مجھے اور کوئی کام نہیں؟ فارغ نہیں ہوں میں جو گھر ڈھونڈوں۔ تمہیں گھر سے مسئلہ ہے تم خود ڈھونڈ لو، علی نے جواب دیا۔ پر تم ہی نے تو کہا تھا کہ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ افراحہ علی کے لاپرواہ رویے پہ حیران تھی۔ جان چھوڑو میری! علی غصے سے کرسی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اٹھا، سائیڈ ٹیبل کی دراز سے گاڑی کی چابیاں نکالیں اور گھر سے باہر نکل گیا۔

افراحہ جو اس گھر کے مسائل سے پہلے ہی پریشان تھی، اب علی کے رویہ پہ مزید دکھی ہو کر رونے والی ہو گئی۔ آج پھر دوپہر سے آندھی والا موسم ہو رہا تھا اور مغرب ہوتے ہوتے مٹیالی فضا کی تیز ہوا نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ وہ نم آنکھوں سے جاگتے ہوئے کمرے میں ہوتے اندھیرے میں زور زور سے بجتے دروازوں کی آوازیں سن رہی تھی۔ علی ابھی تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔

عشا تک آندھی ختم ہو چکی تھی لیکن ہوا کی منہ زوری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی جو اس کا دل دروازوں کے بجنے کے پیچھے گھر کے باہر چلتی تیز ہوا کی دلیل پر مطمئن نہ تھا۔ آج پھر یہ سلسلہ دیر رات تک چلتا رہا اور وہ اکیلی کمرے میں آنکھیں کھولے لیٹی رہی۔

اور تب ہی اچانک زوردار آواز کے ساتھ اس کے کمرے اور ڈریسنگ روم کا دروازہ بجا۔ اور وہ تقریباً چلا اٹھی۔ کون ہے؟ وہ جانتی تھی کہ جواب نہیں ملے گا لیکن جواب میں دروازے اور زور سے بجنے لگ گئے۔ اور پھر اچانک لائٹ چلی گئی۔ یو پی ایس کی بیپ بیپ بیپ کی ایک مسلسل آواز شروع ہو گئی کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اب یہ یو پی ایس کو کیا ہوا؟ یہ کیوں بند ہو گیا ہے؟ اس نے موبائل ٹارچ آن کر کے اندھیرے سے آتے خوف کو کم کرنے کی کوشش کی اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنا حصار کیا، کمرے کے چاروں اطراف پھونک ماری اور دروازوں پر بھی اور دھیان بٹانے کے لیے موبائل پر گیمز کھیلنے لگ گئی۔

ایرا اور ابرام زور زور سے ہنستے ہوئے قبرستان کے بیچ و بیچ ہوا میں معلق ناچ رہے تھے۔ اور تبھی آتش نمودار ہوا۔ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ حیرت سے بولا۔ ابھی بڑا مزہ آیا ہمیں۔ ہم ابھی پتہ ہے کیا کر کے آ رہے ہیں؟ ایرا ہنستے ہوئے بولی۔ مجھے نہیں سننا، بابا بلا رہے ہیں سب کو، تم دونوں بھی چلو، آتش نے اپنے مخصوص غصیلے لہجے میں جواب دیا۔

چلتے ہیں، پہلے سنو تو کہ ہم نے کس کو ڈرایا؟ ابھی۔ اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ ابرام آتش کے تیور دیکھ کر ایرا کی بات کاٹ کر بولا، ایرا بعد میں، بعد میں۔ ہاں؟ ہمیں بلایا گیا ہے۔ دیر ہو گئی تو ڈانٹ پڑے گی۔ چلو فوراً اور وہ ایرا کا جواب سنے بغیر ہی قبرستان کی زمین میں درختوں کے کٹے ہوئے جا بجا تنوں میں سے ایک تنے میں اتر گیا۔ اور اس کی جلد بازی کو دیکھتے ہوئے ایرا بھی اس تنے میں اتر گئی۔

آتش جو ابرام اور ایرا کو گھور رہا تھا اس نے ایک نظر قبرستان سے جڑے گھر کی بالائی منزل پہ ڈالی جیسے وہ

بھانپ گیا تھا کہ ایرا اور ابرام کیا شرارت کر کے آرہے ہیں۔ ایرا تو تھی ہی خود سر لیکن ابرام کو تو آتش نے صاف الفاظ میں منع کیا تھا کہ ابھی ان نئے مکینوں کو تنگ مت کرے، پھر بھی وہ ایرا کے ساتھ مل کر اکیلی افراحہ کو ڈرا کر آیا تھا۔ لیکن ابھی یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا اس کے بابا نے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے یہاں رہائش پزیر سبھی جنات کو ملاقات کے لیے بلایا تھا جو یہاں موجود درختوں پر رہتے تھے لیکن کچھ دن پہلے درخت کٹوائے جانے پر وہ زیرِ زمین انہیں درختوں کی جڑوں میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے جو زمین کے بالکل اوپری سطح تک کٹوائے تو جا چکے تھے لیکن ان کے دو، تین انچ کے تنے ابھی بھی زمین کے اوپر دیکھے جا سکتے تھے۔

رات لائٹ تو جلدی آ گئی تھی لیکن علی دیر تک رات واپس نہ آیا تھا اور افراحہ آدھی رات تک اس کا انتظار کرتے کرتے بالآخر تھک کے سو چکی تھی اور جب صبح دیر سے اس کی آنکھ کھلی تو علی آفس بھی جا چکا تھا۔ وہ کچن میں آئی تو اس کی نظر کچن کی بڑی سی کھڑکی کے باہر پڑی جہاں سے گھر کے پچھلی جانب موجود قبرستان کا آدھا حصہ نظر آتا تھا، وہاں قبریں تو نہیں تھیں لیکن کٹے ہوئے درختوں کے نشان دیکھے جا سکتے تھے وہاں دھواں ہی دھواں ہو رہا تھا۔ جس کی بو اس کے گھر میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ قبرستان میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ کیا ہے؟ اس نے ہم کلامی کی۔ یہ اس قدر آگ کیوں لگائی گئی ہے؟ پہلے ہی آندھیوں کا موسم ہے اتنی مٹی اڑ رہی ہے آجکل اور اس پہ یہ ریزیڈینشل ایریا میں اتنی بڑی پوری جگہ کو آگ لگا دی گئی ہے؟ آگ لگانے والے احمقوں کو خبر نہیں کہ حکومت نے ہوا اور ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے ریزیڈینشل ایریا میں کوڑے کے چھوٹے سے ڈھیر کو بھی آگ لگانے سے منع کیا ہوا ہے؟ اور اس پہ باقاعدہ ایکٹ لاگو ہوتا ہے اور یہاں تو اتنے بڑے قبرستان کی پوری کی پوری زمین کو آگ لگا دی گئی ہے۔ یہاں لوگ آباد ہیں، بچے بوڑھے بیمار سب اسی ہوا میں سانس لیتے ہیں نہ جانے کن جاہلوں نے یہ ہوا آلودہ کر رکھی ہے؟ یہ سوچتے ہوئے وہ غصے میں پلٹی، اپنے کمرے میں آ کر اس نے انٹرنیٹ پر کچھ ڈھونڈا اور کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد بالآخر اسے وہ فون نمبر مل ہی گیا جو آلودگی ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں کی شکایات درج کروانے کے لیے حکومت نے انوایرنمنٹل پروٹیکشن سیل کو الاٹ کر رکھا تھا۔ اس نے نمبر ڈائل کر کے فون کان سے لگا لیا۔ ہیلو۔ السلام علیکم! جی میں مسز افراحہ علی بات کر رہی ہوں ایک کمپلین درج کروانی تھی۔

اب آپ مجھ بتائیں کہ جب قبرستان کی یہ جگہ قبروں کے لیے مخصوص ہو اور زمین پہ جا بجا درخت اگے ہوئے ہوں گے تو قبریں کہاں بنائی جائیں گی؟

ہم نے درخت کٹوائے تھے لیکن زمین پہ چلتے ہوئے ان کٹے ہوئے درختوں کے بچے کچھے ابھرے ہوئے تنے پیروں میں اڑتے تھے۔ ان کو اسی لیے آگ لگوائی تا کہ وہ بھی جل کر ختم ہو جائیں اور میدان بالکل صفا چٹ ہو جائے، بشیر انکوائری انسپکٹر کو وضاحتیں دے رہا تھا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ کچروں کے پاس کوڑے یا کسی بھی قسم کے ڈھیر کو آگ لگانے سے ماحول میں کس قدر آلودگی پیدا ہوتی ہے؟ درختوں کے بچے ہوئے تنوں کو زمین سے جڑوں سمیت بھی نکالا جا سکتا تھا آگ لگانے کی نوبت ہی نہ آتی، اب بقول آپ کے یہ آگ آپ نے صبح سے لگائی ہوئی ہے اور اب شام ہو چکی ہے لیکن دیکھیں پھر بھی زمین سلگ رہی ہے، دھواں اٹھ رہا ہے، فضا میں کس قدر گھٹن اور آلودگی ہے، سانس تک نہیں لیا جا رہا۔

انسپکٹر بولا۔ تو جناب بتایا نا کہ یہ آگ ضروری تھی، اور مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ کوئی اتنا بڑا جرم ہے، بشیر نے جواب دیا۔ یہ سوسائٹی آپ کی ہے؟ انسپکٹر نے پوچھا۔ نہیں میرے جاننے والوں کی ہے، آپ میری ہی سمجھیں۔ بشیر نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔ آج میں آپ کی کم علمی کی وجہ سے انجانے میں کیے جانے والی اس غلطی کو پہلی اور آخری دفع معاف کر رہا

ہوں لیکن یاد رہے، آئندہ ہمیں کوئی شکایت موصول نہ ہو۔ انسپیکٹر سختی سے بولا۔

ویسے یہ شکایت لگانے والا تھا کون؟ بشیر نے پلٹ کے جاتے ہوئے انسپکٹر سے سوال کیا۔ کوئی خاتون تھیں لیکن ان کا نام آپ کو بتانا ضروری نہیں، آپ بس آئندہ اس قسم کی حرکتوں سے پرہیز کریں۔ وہ جانے کے لیے مڑا لیکن پھر کچھ سوچ کے واپس پلٹا اور بولا۔ اور ہاں! آئندہ آپ کو سوسائٹی کا چودھری بننے کی ضرورت نہیں۔ جن کی سوسائٹی ہے، تھرو پراپر چینل قبرستان کی زمین ہموار کروانا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ٹیرس میں بیٹھے علی اور افراحہ جو شروع سے آخر تک اس ساری گفت و شنید کو سن رہے تھے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ علی نے ابرو چڑھا کے افراحہ کو دیکھا تو وہ اندر آ گئی۔ علی بھی اس کے پیچھے لپکا۔ ذرا میری طرف دیکھنا! یہ انوائیرنمنٹل پروٹیکشن سیل کو فون تم نے کیا تھا نہ؟ علی نے پوچھا۔

ہاں کیا تھا تو؟ افراحہ نے بھی ماتھے پہ بل ڈال کے جواب دیا۔ تو یہ کہ بہت اچھا کیا اور علی کے ساتھ ساتھ افراحہ بھی ہنس پڑی۔ صبح آفس جانے کے لیے گاڑی باہر نکال رہا تھا تو باہر دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا، میرا تو کھانس کھانس کے برا حال ہو گیا۔ گھر کے پیچھے قبرستان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ غصہ تو مجھے بھی بہت آیا لیکن دیر ہو رہی تھی سو چلا گیا۔ ابھی آ کے شاور لیا تو بیل ہو گئی۔ دیکھا تو باہر گیٹ پہ بشیر انسپکٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی باتیں سن کے مجھے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ کارنامہ یقیناً تمہارا ہی ہو گا۔ یہ انقلابی کاروائیوں کے شگوفے تمہارے دماغ میں ہی پھوٹتے ہیں۔ علی نے کہا تو افراحہ بولی، کیوں نہ پھوٹتے؟ ایک تو چاروں طرف کے درخت کاٹ ڈالے، وہ کیا کم تھا اور اوپر سے بچے کھچے تنوں کو مالی سے کہہ کر جڑ سمیت نکلوانے کی بجائے پورے میدان میں آگ لگا دی۔ یعنی تمہیں صرف آگ پہ ہی نہیں درختوں کے کاٹے جانے پہ بھی اعتراض تھا؟ اسی بات کا غصہ نکالا؟ علی نے اسے کریدا۔

بات صرف ماحول کی آلودگی کی نہیں ہے۔ یہ درخت نہ جانے کتنے جانداروں کا بسیرا ہوں گے، پرندے، گلہریاں، تتلیاں۔ اور جڑوں میں رہنے والی چیونٹیاں۔ ابھی افراحہ اتنا ہی بولی تھی کہ علی بیچ میں بول پڑا۔ اور وہ تمہارے دروازے بجانے والے جن۔ کیا پتہ وہ بھی رہتے ہوں ان پہ؟ علی نے آنکھ مار کے افراحہ کو چھیڑا۔

ہاں! بالکل وہ دروازے بجانے والے بھی۔ بس؟ مذاق اپنی جگہ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ انسان خود تو مضبوط در و دیوار کے بڑے بڑے گھر بنا کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے لیکن درختوں کو کاٹتے ہوئے ایک بار بھی نہیں سوچتا کہ یہ درخت بھی کتنے چرند پرند، کتنے جانداروں کے گھر ہوتے ہیں۔ انسان اس زمین کے اوپر زندہ رہنے کے لیے بھی زمین کے پیچھے لڑتا مرتا ہے اور مرنے کے بعد زمین کے اندر رہنے کے لیے بھی زمین پہ اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور اپنی اس خودغرضی میں کسی اور جاندار کا سوچتا تک نہیں۔ افسوس ہوتا ہے ایسے انسانوں پہ مجھے۔ افراحہ خاموش ہوئی تو علی مذاق میں بولا او تالیاں! اسے تالیاں بھی بجانے لگا۔ اور آپ اس تقریری مقابلے کی اکلوتی پارٹیسپنٹ ہونے کے ناطے پہلے انعام کی حقدار پائی ہیں۔

میں مذاق نہیں کر رہی، وہ واقعی سنجیدہ تھی۔

ہاں ویسے تم ٹھیک کہہ رہی ہو، اب بیچارے وہ تمہارے پرندے، گلہریاں اور تتلیاں کہاں گھر بنائیں گے؟

ایک اور مخلوق کو بھول رہے ہو۔ افراحہ نے مسکرا کر کہا۔ کسے؟ علی نے پوچھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا، اچھا ہاں! وہ جن بھی۔ کوئی بات نہیں! یہاں دو بیڈرومز خالی ہیں وہ ان میں رہ لیں گے ویسے بھی تم اکیلی ہوتی ہو تمہاری کمپنی ہو جائے گی۔ علی نے مسکرا کر پھر سے افراحہ کو ڈرانے کی کوشش کی۔

جی جی ضرور! مجھے کوئی اعتراض نہیں، دے آر موسٹ ویلکم! افراحہ نے بھی علی کی اسے ڈرانے کی

کوشش کو ناکام بناتے ہوئے جواب دیا۔ بس ان سے کہنا رات کو دروازے نہ بجایا کریں، نیند بہت ڈسٹرب ہوتی ہے۔ علی کا مذاق جاری تھا۔

اوہ! شٹ اپ پلیز۔ بہت ہو گیا اب مذاق۔ اپریل کا مہینہ ہے، علاقہ بھی کھلا ہے تو یہاں آندھیاں بہت آ رہی ہیں، ہوا کے زور سے بجتے ہیں دروازے۔ افراحہ نے دلیل دی۔

بالکل بالکل! لیکن لگتا ایسے ہی ہے جیسے جن بجا رہے ہوں، ہے نا؟ علی نے پوچھا۔ اچھا بس! بہت ہو گیا۔ افراحہ نے جیسے یہ موضوع ختم کر دیا۔ لیکن وہ دونوں اس بات سے قطعی انجان تھے کہ وہ محض ہوا نہیں۔ وہ مذاق میں جو بات کر رہے ہیں وہ ایک حقیقت تھی جس سے یہ دونوں ہی انجان تھے اور ان کی انجانے میں کی گئی اس گفتگو کو قدرت پہلے سے وقوع پزیر کر کے غیب کا روپ دے چکی تھی۔ علی کا کیا ہوا مذاق اصل میں ایک عملی سچ تھا۔

آتش جو صبح سے افراحہ کی سرگرمیوں پہ نظر رکھے ہوئے تھا، اس کی اور علی کی باتوں کو سن کر ٹیرس میں ٹہلنے لگا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو قبرستان کی زمین کو آگ لگائے جانے پہ بدلہ لینے کا سوچ رہا تھا اب اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کرنے لگا تھا۔ گو کہ اس کے باپ نے جو کہ اس جنانی قبیلے کا سردار تھا، اپنے دونوں بیٹوں آتش اور اس کے بھائی ابرام کو کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے منع کیا تھا۔ مگر وہ آتش ہی کیا جو کسی پھونک سے بجھ جائے۔ اس نے رات کو ہی جب اس کے باپ نے تمام جنات کو اکٹھا کر کے صبح یہاں لگائے جانے والی آگ کے بارے میں سب کو پہلے سے آگاہ کیا تھا وہ تب ہی بشیر کے گھر کو تہس نہس کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن تبھی اس کے باپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روک دیا اور اس سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ دیکھو آتش! جب یہاں انسان آباد ہونا شروع ہوئے تھے اسی وقت ہم مسجد کے امام صاحب کے پاس گئے تھے اور انہوں نے ہمیں یہی کہا تھا کہ یہ انسانوں کی آبادی ہے۔ یہاں درخت کٹیں گے، فصلیں کٹیں گی، زمین پہ بڑی بڑی مشینیں چلیں گی، سڑکیں بنیں گی، گھر بنیں گے، تو ہماری بقا کے لیے یہی ضروری ہے کہ ہم یہاں سے دور چلے جائیں لیکن ہم نے ان کی یہ بات نہ مانی لیکن اس وقت ان سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ جب تک یہ درخت نہیں کٹتے ہم یہیں رہیں گے۔ بس انسانوں کی زندگیوں میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ہم بھی مسلمان ہیں اور اللہ کے حکم سے فساد سے اجتناب کرتے ہیں۔ اب درخت کٹنے کے بعد جب ہم پھر سے شکایت لے کر ان کے پاس گئے تو انہوں نے ہمیں ہمارا وعدہ یاد کروایا۔ انہوں نے تو پہلے ہی ہمیں یہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔ وہ تو اگر ابرام چوری چھپے بشیر کی باتیں نہ سنتا اور ہمیں بروقت اطلاع نہ دیتا تو کیا معلوم درختوں کے تنوں سے جڑوں تک پہنچتی آگ ہمیں زیر مین جلا ہی ڈالتی۔ گو کہ ابرام نے بہت غلط کیا ہے۔ میں تم لوگوں کو انسانوں کے گھروں میں تانکا جھانکی، چوری اور مداخلت سے منع کرتا رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ تم سب مجھ سے چھپ کر لوگوں کے گھروں میں آتے جاتے ہو، اور کبھی کبھار شرارتاً انہیں ڈراتے بھی ہو۔ میں تب نظر انداز کیا لیکن میں اس فساد کی اجازت تمہیں ہرگز نہیں دے سکتا صبح آگ لگنے سے پہلے ہمیں یہ ٹھکانہ چھوڑنا ہوگا۔ تم، ابرام اور ایرا جا کر آج رات کا عارضی ٹھکانہ ڈھونڈو لیکن اس کے بعد ہمیں کوئی مستقل ٹھکانہ تلاش کرنا ہوگا۔

اور یہ سب سن کر آتش نہ چاہتے ہوئے بھی ابرام اور ایرا کے ساتھ ٹھکانے کی تلاش میں نکل گیا۔

مگر صبح سے وہ پھر سے افراحہ کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ جتنا اس گھر کے مالک بشیر سے خار کھائے بیٹھا تھا اتنا ہی اسے افراحہ کی باتیں اس کا گرویدہ کر رہی تھیں وہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا کہ اگر اس نے اس گھر کو تہس نہس کر دیا تو افراحہ بھی بے گھر ہو جائے گی۔ نہ جانے اسے افراحہ سے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی تھی؟ وہ انہی سوچوں کا تانا بانا بنتا قبرستان کی دیوار پہ آ بیٹھا۔

کیا بات ہے؟ ابرام نے نمودار ہوتے ہی پوچھ ڈالا۔ ابرام! مجھے اس پہ خود کو ظاہر کرنا ہے۔ میں اسے دیکھ سکتا ہوں پر وہ میرے وجود سے غافل ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ بھی مجھے دیکھے۔ آتش نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ کیا؟ کون؟ وہ نئی مکین؟ ارے تو رات کو چلیں گے نہ اس کے دروازے بجانے، آج اسے اپنے وجود کا قائل کر کے چھوڑیں گے۔ تو فکر نہ کر، ابرام نے لاپرواہی سے کہا۔ میں اسے ڈرانے کی بات نہیں کر رہا۔ اور تمہیں منع کیا تھا نا کہ اسے ڈرانا مت آئندہ! آتش بگڑنے لگا تو ابرام بولا۔ ارے وہ تو بس ایرا کے ساتھ مل کر تھوڑی بہت شرارت کر لیتا ہوں۔ تھوڑی بہت بھی نہیں! اسے کسی نے تنگ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ ابھی تو بس مجھے یہ بتا کہ میں خود کو اس کے سامنے کیسے ظاہر کروں جس سے وہ ڈرے نہیں؟ آتش نے بے چینی سے کہا۔

کیا بات کر رہا ہے آتش؟ تو جانتا ہے کہ بابا نے منع کر رکھا ہے ہمیں کسی بھی انسان کے سامنے اپنا اصل روپ ظاہر کرنے کو۔ اور ہمارا اصلی روپ وہ شاید جھیل بھی نہیں پائے گی۔ اور ایرا؟ اسے پتہ چلا تو؟ آخر تمہاری شادی طے ہے اس سے۔ وہ برداشت نہیں کرے گی یہ بات۔ ابرام نے اس کو روکنا چاہا۔ اور ایرا کو کون بتائے گا؟ اپنا منہ بند رکھنا ورنہ میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ آتش آگ بگولہ ہوا۔

اچھا اچھا نہیں بتاتا، بس زرا خیال رکھنا۔ وہ انسان ہے اور تم جن! اور ہم کوئی ایسے سرکش جنات بھی نہیں ہیں، نہ ہی ایسا کچھ بھی کرنے والوں کی ہمارے قبیلے میں معافی ہے۔ ابرام نے اسے سمجھایا۔

جانتا ہوں یہ سب، مجھے مت بتا۔ صرف اس کی نظروں کے سامنے آنا چاہتا ہوں۔ آتش سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

اگلے روز افراحہ ملازمہ سے لاؤنج کی صفائی کروا رہی تھی کہ ٹیرس گارڈن میں پرندوں کے بے تحاشہ شور سے اس کا دھیان گلاس وال کے دوسری جانب گیا تو اس نے دیکھا کے تین سے چار کالے پرندے ایک سنہری بھورے رنگ کے پرندے کو اپنی چونچوں سے مار رہے ہیں تو وہ اڑتا ہوا کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر لیکن اس پہ حملہ کرنے والے وہ کالے پرندے اسے اوپر اڑنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر کالے رنگ کے پرندے کوے کی آدھی جسامت جتنے دبلے پتلے تھے جن کی دو شاخہ دم بہت لمبی تھی۔

افراحہ نے لاؤنج میں کھڑے کھڑے ہی اس سنہری بھورے پرندے کو مارتے ہوئے ان کالے پرندوں کو شور مچاتے اور ہاتھ کے اشارے سے اڑانے کی کوشش کی۔ اوئے! وہ زور سے چلائی۔ گو کہ اس کی زبان پرندوں کو سمجھ نہیں آ سکتی تھی مگر وہ شاید متوجہ ہو جاتے۔ وہ کالے پرندے تو کیا ہی اڑتے لیکن اس سنہری بھورے پرندے نے اپنی پوری کی پوری گردن موڑ کے افراحہ کو دیکھا۔ افراحہ اس کی سنہری بڑی بڑی گول گول آنکھوں کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔ وہ ایک الو تھا۔

بے شک اس سے پہلے اس نے حقیقت میں اپنی آنکھوں سے الو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اسے یہ یقین تھا کہ یہ الو ہی ہے جو اسے بٹر بٹر اپنی گول گول آنکھوں سے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا اور اس الو کو یہ بھی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کالے پرندے اس پہ حملہ کر رہے ہیں۔

افراحہ نے جلدی سے اپنی ملازمہ کو ٹیرس گارڈن میں بھیجا۔ کام چھوڑو، باہر جا! ان کالے پرندوں کو اڑا، وہ اسے مار ڈالیں گے۔ ملازمہ جھاڑو وہیں پھینک کے راہداری کا دروازہ کھول کے ٹیرس گارڈن میں گئی اور پورے ٹیرس پہ ادھر ادھر تیزی سے بھاگ بھاگ کے پرندوں کو اڑانے لگی اور اسی اثنا میں وہ الو جو ابھی بھی صرف افراحہ کو ہی دیکھے جا رہا تھا ملازمہ کے پاس آنے اور شور مچانے سے اچانک اڑ گیا۔ اف! اسے اڑانے کو تو نہیں کہا تھا ان کالے پرندوں کو بھگانے کو کہا تھا، یہاں نہیں تو وہ کہیں اور جا کر اس پہ حملہ کر دیں گے۔ وہ ملازمہ کو بولی۔

اسے اس خوبصورت الو کے اڑ جانے کا بہت

دکھ تھا لیکن اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے آج پہلی بار براہِ راست اپنی آنکھوں سے ایک الو دیکھا تھا لیکن وہ کالے پرندے اس بیچارے اکیلے الو کو کیوں مار رہے تھے؟ شام تک وہ اس الو کو دیکھنے کے تصور سے خوش ہوتی رہی۔ وہ الو ہی تھا نہ؟ وہ کتنی دیر سوچتی رہی اور پھر اپنا شک دور کرنے کے لیے انٹرنیٹ پر الو کے بارے میں تھوڑی ریسرچ کرنے بیٹھ گئی اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس نے الوں کے بارے میں کافی معلومات اکٹھی کرلیں۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ الو ہی تھا۔

اس نے الوں کی ہر نسل کی ڈھیروں تصویریں دیکھ ڈالی تھیں۔ جن میں ایک سنہری بھورے رنگ کی نسل کا الو آج ٹیرس میں آئے الو سے بالکل مشابہہ تھا اور اس کے دو سو ستائیس ڈگری کے زاویے سے گردن موڑ لینے کی معلومات سے بھی اسے یقین ہو چلا تھا کہ کیسے اس الو نے اپنے جسم کو حرکت دیے بنا ہی صرف اپنی پوری گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا؟ اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کالے پرندے اس الو کو کیوں مار رہے تھے؟

اس نے پڑھا کہ الو اندھیرے میں واضح دیکھنے کی وجہ سے چونکہ رات کے وقت شکار کرتا ہے اور دیگر پرندوں کے گھونسلوں سے ان کے انڈے لے اڑتا ہے، اسی لیے وہ عام طور پہ دن کے وقت باہر نہیں نکلتا اور اگر وہ دن کے وقت باہر نکلے تو اسے باقی کے پرندے مار دیتے ہیں۔

اوہ! کہیں اسے بھی انہوں نے مار تو نہیں دیا؟ اللہ نہ کرے۔ نہ جانے اسے اس الو سے کیسا لگا ہو گیا تھا۔ شاید اس کے پلٹ کے دیکھنے پر وہ بھی اس کی پر اسراری آنکھوں کے سحر میں کھو گئی تھی اور پھر جب اس نے دیکھا کہ اس الو کے اسے محویت سے دیکھنے سے فائدہ اٹھا کے کالے پرندے اسے اور زیادہ مارنے لگے تھے۔ اسے اس الو پہ بہت ترس آیا تھا لیکن وہ الو مار کھاتے ہوئے بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

شاید یہی وہ لمحہ تھا کہ اسے اس الو سے جذباتی لگا سا ہو گیا تھا۔ اور لگا بھی ایسا کہ وہ نہ صرف سارا دن اس کے بارے میں سوچتی رہی بلکہ انٹرنیٹ پہ اس کے بارے میں ساری معلومات بھی لے لیں جو اسے پہلے نہیں تھی۔

علی کے واپس آنے پر اس نے خوشی خوشی الو والا سارا قصہ سنایا اور پھر اداس ہوتے ہوئے بولی۔ اللہ کرے وہ زندہ ہو۔ بہت پیارا تھا۔ اور علی! جس طرح سے اس نے گردن گھمائی اور پھر مجھے بنا آنکھیں جھپکائے دیکھنے لگا۔ اف! مجھے اس پہ اتنا پیار آیا کہ کیا بتاؤں۔

دھیان سے! کہیں وہ کوئی اور ہی چیز نہ ہو؟ علی نے پھر سے اسے ڈرایا۔

ویسے ایک بات بتاؤں؟ ایک سیکنڈ کے لیے میں بھی ڈر گئی تھی اس کے اس طرح گردن گھما کے دیکھنے پر لیکن جب میں نے اس کے بارے میں سب پڑھا تو پتہ چلا کے الو اسی طرح گردن گھما کے دیکھتے ہیں کیونکہ یہ آنکھیں نہیں گھما سکتے، تو یہ کمی اللہ نے ان کی گردن کی روٹیشن سے پوری کردی ہے۔ بس مجھے ایک فکر ہے کہ ان پرندوں نے اسے مار ہی نہ دیا ہو اور اگر اللہ نہ کرے وہ بچ بھی گیا ہو، تب بھی زخمی تو بہت ہوا ہو گا۔ اسے سب پرندے مار ہی اتنی بری طرح سے رہے تھے۔

ایرا جو پچھلے ایک گھنٹے سے بیرونی ٹیرس کی گرل پہ بیٹھی افراحہ کی باتیں سن رہی تھی، اب بور ہونے لگی تھی اور افراحہ کو ڈرانے کا کوئی بھی موقع نہ پا کر وہاں سے اٹھ کر ہوا میں معلق ہو گئی کہ علی اس کے ساتھ ہی بیٹھا رہا تھا تو وہ کوئی شرارت نہ کر پائی تھی۔ وہ قبرستان لوٹی تو قبرستان سے باہر کچھ دور اکلوتے سلامت پیپل کے اس بڑے اور اونچے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر اس نے آتش اور ابرام کو بیٹھے دیکھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ پیچھے کی جانب سے ان کی طرف جانے لگی۔ تجھے الو کے علاوہ کوئی اور پرندہ نہیں ملا تھا روپ دھارنے کو؟ ابرام آتش کے چہرے پہ لگے زخموں کا معائنہ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ ایرا کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ان کے پیچھے وہیں رک گئی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ کلوے مجھ پہ حملہ

کردیں گے؟ آتش بولا۔ تو تو اپنے اصلی روپ میں آ جاتا نہ، کیوں مار کھاتا رہا؟ ابرام نے پوچھا۔ وہ دیکھ رہی تھی مجھے، تو اتنا خطرہ مول لینا تو بنتا ہی تھا، وہ تو اس لڑکی نے باہر آ کر مجھے اڑا دیا اور میں جیسے ہی اڑا وہ پرندے پھر سے میرے پیچھے پڑ گئے۔ وہ تو میں اس درخت میں چھپ کے بیٹھا ہی تھا سانس لینے کو کہ وہ یہاں بھی آ گئے اور پھر مجھے بھی اپنے اصلی روپ میں آنا پڑا، اور اس سے پہلے کہ میں ایک آدھ کو پکڑ کر کھا جاتا۔ وہ مجھے دیکھ کر چلاتے ہوئے بھاگ گئے۔ پر یہ تو اب طے ہے کہ زندگی میں کبھی دن کے وقت الو نہیں بنوں گا۔ آتش نے ساری آپ بیتی سنا ڈالی۔

ایک بات اور بھی طے ہے، اور وہ ہے ہماری شادی! یہ تو یاد ہے نہ؟ اگر اس بات کو بھولے تو انجام کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔ ایرا نے آتش کے سامنے اچانک آ کر اسے بوکھلا دیا تھا جبکہ ایرا اتنا کہتے ہی غائب ہو گئی۔ اس کی دھمکی سے لگتا ہے اس نے ساری باتیں سن لیں ہیں اور اب تو بھی سن لے۔ اس سے پہلے کہ یہ بابا کو شکایت لگا دے، اب ذرا افراحہ سے دور رہ۔

ابرام نے آتش کو ایک بار پھر سمجھایا۔ ہوں! جانتا ہوں، آتش نے سر جھٹک کے مایوسی سے کہا۔ تو پھر چل چلیں۔ ابرام نے پوچھا۔ کہاں؟ آتش نے سوال کیا۔ بھول گیا؟ بابا نے ہمارے ذمے مستقل ٹھکانہ ڈھونڈنے کا کام لگایا ہے اور یہ کام ہمیں کچھ دنوں میں ہی پورا کرنا ہے۔ بابا نے کچھ جگہوں کا پتہ کرنے کو کہا ہے، اب سے ہمیں ہر رات تلاش میں نکلنا ہو گا۔ ابرام نے یاد دہانی کروائی۔ ہاں! چلو۔ آتش نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا اور پھر ابرام کے پیچھے ہوا میں اڑتا کہیں غائب ہو گیا۔

افراحہ! افراحہ! وہ جو اپنے بیڈروم کی صفائی کروا رہی تھی آسیہ کی آواز پہ کمرے سے باہر آئی تو وہ آسیہ پورا لاؤنج پار کر کے اس تک پہنچ چکی تھی۔ کیا کر رہی ہو؟ کام کروا رہی تھی، ملازمہ نئی ہے تو ابھی سر پہ کھڑے ہو کے سب سمجھانا پڑتا ہے۔ آپ آ جائیں اندر باہر گرمی ہے۔ کمرے کی صفائی مکمل ہونے والی ہے اور افراحہ ملازمہ کو کچھ ہدایتیں دے کر آسیہ کو بیڈروم میں لے آئی۔ اے سی آن دیکھ کر آسیہ نے پوچھا تم نے اے سی بھی آن کرلیا ہے؟

جی! میری گرمی سے بہت جان جاتی ہے۔ افراحہ نے جواب دیا۔ ہوں ں ں۔ یہ انورٹر نہیں لگ رہا۔ آسیہ نے ابرو اٹھا کے پوچھا۔ جی! کیونکہ یہ انورٹر ہے بھی نہیں، افراحہ نے جواب دیا۔

نیچے پورشن میں تو میرے سارے کمروں میں انورٹرز ہی ہیں، تینوں بیڈرومز میں، ایک لاؤنج میں، ایک ڈرائنگ روم میں اور ایک کچن میں، سب کے سب انورٹرز ہی ہیں۔ آسیہ نے گردن اکڑا اکر چھچھورے پن کا مظاہرہ کیا۔ اور باتھ رومز میں؟ افراحہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ کیا مطلب؟ آسیہ اس کا طنز نہیں سمجھی۔ مطلب کہ آپ کے باتھ رومز میں بھی انورٹرز ہی ہوں گے؟ افراحہ نے وضاحت چاہی۔ نہیں! وہاں نہیں ہیں، آسیہ نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ کوئی بات نہیں اللہ آپ کو باتھ رومز میں بھی انورٹر دے، آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھیں نہ! افراحہ نے اسے مسکرا کر وہاں پڑے ایک صوفہ پر بکھرے کپڑے اٹھا کے بیڈ پر رکھے اور آسیہ اس کے طنز، مذاق اور دعا میں الجھ کر رہ گئی، پھر کچھ نہ سمجھ آنے پر ٹاپک چینج کرنے کی غرض سے بولی، الماری ٹھیک کر رہی تھی؟ آسیہ نے صوفہ پہ بیٹھتے ہی بیڈ پہ پڑے ہینگرز اور کپڑوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جی! کچھ ڈریسز ان پیک کرنے والے تھے سو وہی کر رہی تھی تو ملازمہ آ گئی تو اس کے ساتھ لگ گئی۔ افراحہ نے کپڑے ہینگرز میں ڈالتے ہوئے بتایا۔

اچھا دکھا کون کون سے ہیں؟ اچھے لگ رہے ہیں، وا! یہ اچھا ہے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ یہ کس کس برینڈ کے ہیں؟ آسیہ صوفہ سے اٹھ کر اس کے ایک ایک جوڑے کو ٹٹولنے لگی۔

برینڈ؟ جو ریڈی میڈ ہیں ان کے بیک ٹیگو پہ دیکھ لیں اور جو خود سلوائے ہیں وہ تو مجھے یاد بھی نہیں کس

کس آٹ لیٹ سے لیے ہیں؟ افراحہ کا دل کررہا تھا کہ آج تو اس سے پوچھ ہی لے کہ اسے کونسا احساسِ برتری ہے یا پھر کوئی احساسِ کمتری جسے چھپانے کے لیے یہ برینڈ برینڈ کرتی پھرتی ہے؟ پر وہ خاموش رہی۔ میں تو صرف برینڈڈ جوڑے ہی لیتی ہوں۔ عام کپڑے تو مجھے اچھے ہی نہیں لگتے۔ آسیہ کی بات سے اب افراحہ کو جواب دینا ہی بنتا تھا۔

مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اس سب سے۔ مجھے جو چیز جہاں سے اچھی لگتی ہے، میں وہ وہاں سے لے لیتی ہوں۔ میں اگر کسی نامی گرامی بوتیک کے کپڑے خریدتی ہوں تو کسی عام سے اسٹال پہ پڑے کپڑے بھی خرید لیتی ہوں۔ بس اس کا فیبرک، رنگ، سٹائل میری پسند کا ہونا چاہیے۔ کہ مجھ پہ اچھا لگے ورنہ کچھ لوگوں کی چوائس اتنی خراب ہوتی ہے کہ بڑے بڑے اسٹورز سے خریدے گئے مہنگے کپڑے بھی ان پہ عام سے نظر آتے ہیں۔ جسے پہن کر بھی انسان کی پرسنیلیٹی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو بس پہننے کا سلیقہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بھی خدا کی دین ہے کہ کسی کے پاس سلیقہ ہوتا ہے اور کسی کے پاس پیسہ۔ جس کے پاس سلیقہ ہوتا ہے اسے برینڈز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جس کے پاس صرف پیسہ ہوتا ہے، اسے دنیا کا کوئی بھی برینڈ نہیں سنوار سکتا۔ افراحہ نے آسیہ کے پرتکبر رویے پہ دل کھول کے اپنی بھڑاس نکالی۔

آسیہ کھسیانی سی ہو کر اٹھی۔ اچھا تم! تمہارے پاس بس اتنا ہی فرنیچر ہے؟ میں نا تمہیں ایک وظیفہ بتاؤں گی، جس سے تمہارا گھر بھر جائے گا جیسے نیچے میرا گھر بھرا ہوا ہے، آسیہ عادت سے مجبور تھی۔

واٹ؟ آئے ایم سوری! کم اگین پلیز۔ وٹ ڈُ یو سے؟ افراحہ اس کے اس حد درجہ چھچھور پن پر حیران ہو چکی تھی۔ لیکن آسیہ اپنی طرف سے اس کی تذلیل کے مزے لیتے ہوئے اپنی بات پوری کرنے لگی۔ مطلب! اس وظیفے سے جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا، انہیں سب مل جاتا ہے۔ آسیہ نے کہا تو افراحہ بولی۔ الحمدللہ! میرے پاس سب کچھ ہے۔ شوہر، گاڑی، اچھا روزگار، اس گھر کا اتنا زیادہ کرایہ دینے کے لیے پیسے، صحت، تندرستی، اور رہی بات فرنیچر کی تو وہ میں خود ڈیزائن کروں گی انشااللہ! اپنے حساب سے، اپنے وقت پہ اور دوسری بات یہ کہ مجھے اللہ سے مانگنے کے لیے کسی بلواسطہ طریقہ کار کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس سے جو چاہیے ہوتا ہے، میں اس سے براہِ راست مانگتی ہوں۔ اتنی دوستی تو ہے میری خدا سے کہ بس اسے اتنا ہی کہنا ہوتا ہے کہ اے اللہ! مجھے وہ دے جو میرے حق میں بہتر ہے اور جو میرے حق میں بہتر نہیں، اس چیز کو مجھ سے دور رکھ۔ اب دیکھیں نہ کچھ لوگوں کو خدا گھر، پیسہ، جائیداد، اولاد، شہرت سب کچھ دے دیتا ہے لیکن ان لوگوں کو ذہانت، حکمت، نیک نامی، عزت، عاجزی، سلیقہ اور تمیز سے محروم رکھتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کچھ لوگ ڈگریاں تو لے لیتے ہیں لیکن علم سے محروم رہتے ہیں اور جیسے کچھ لوگ مشہور ہو جاتے ہیں لیکن عزت سے محروم رہتے ہیں۔ افراحہ کی لمبی چوڑی تقریر پہ تو آسیہ دل ہی دل میں پچھتانے لگی کہ اس نے کیوں کس بندی پہ اپنا رعب ڈالنے کی کوشش کی؟ یہ تو رعب میں آتی ہی نہیں۔ وہ ظہر کی نماز کا بہانہ کر کے اٹھ گئی۔ اچھا میری نماز کا وقت ہو گیا ہے میں چلتی ہوں۔ افراحہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اللہ حافظ کہا۔ آسیہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔

افراحہ! برینڈڈ کپڑے اور جوتے پہننے سے انسان ذرا امیر اور کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ مجھے دنیا پہ اپنی امیری ظاہر کرنے کا کوئی شوق نہیں! مجھے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد لگنے سے زیادہ کسی مہذب گھرانے کا فرد لگنے اور ہونے میں زیادہ دلچسپی ہے، افراحہ نے جواب دیا تو آسیہ اکڑ کر بولی، ہاں! ویسے بھی برینڈڈ چیزیں افورڈ کرنا شاید تمہارے بس کی بات بھی نہیں۔ اتنا کہتے ہی وہ تو تیزی سے نکل گئی لیکن افراحہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی۔ اور اس نے بیڈ پہ پڑا تکیہ زور سے بیڈ کے کراؤن پر مارا جہاں آتش کب سے پیر لٹکائے بیٹھا افراحہ کے کام، اس کی

باتوں اس کے تاثرات اور اب اس کے جذبات کا مشاہدہ کررہا تھا۔ وہ جو کچھ دیر پہلے افراحہ کی باتوں کو سن کر مسکرا رہا تھا۔ اب افراحہ کو غصے میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی انگارہ گل رہی تھیں۔

وہ بھی سوچتی ہوگی کہ کس شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا؟ تم نے تو اچھی خاصی مٹی پلیت کردی اس کی۔ علی نے رات میں ہنستے ہوئے کہا۔ اور جو جاتے جاتے اس نے پھر سے وہی بکواس کی وہ؟ ویسے تم لاؤنج کا دروازہ لاک کر کے کیوں نہیں رکھتی؟ وہ جب چاہے بنا دستک دیے اندر چلی آتی ہے۔ بیشک مینرز کی بات ہے یہ۔ علی نے کہا۔

ہوں! اب دن میں بھی لاک رکھا کروں گی۔ مگر میں اس اوور کونفیڈنٹ عورت سے بہت تنگ ہوں۔ علی! تم نے گھر ڈھونڈنا ہے یا نہیں؟ افراحہ سید ھا مدعے پر آ گئی۔ صبح بات کریں گے۔ ابھی بہت نیند آ رہی ہے۔ اور وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ اور افراحہ اس کے اس بہانے پر اسے گھور کر رہ گئی۔

آتش بھی اسے کچھ پڑھتا دیکھ کمرے سے غائب ہو گیا۔ باہر ابرام اس کا انتظار کررہا تھا۔ وہ دن میں کئی بار افراحہ کے اردگرد منڈلا کر اس سے باخبر رہتا تھا پر رات ہوتے ہی اسے ابرام کے ساتھ ٹھکانہ ڈھونڈنے کے کام پہ جانا پڑتا تھا۔

رات کے پونے تین بجے کا وقت تھا جب افراحہ آرٹیکل لکھ رہی تھی جو اسے جلد از جلد ایک امریکن کمپنی کو بھیجنا تھا۔ جس سے وہ پچھلے کچھ سالوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے منسلک تھی۔ ایک فری لانس انٹیریئر ڈیزائنر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فری لانس آرٹیکل رائٹر بھی تھی۔ لیکن شفٹنگ کے بعد سے اسے کام کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ آج وقت ملا تو دیر رات تک کام میں مصروف رہی۔ اس کا کام مکمل ہی ہونے والا تھا کہ اس کے کانوں میں دور سے آتی ایک آواز پڑی۔ اگرچہ یہ آواز کچھ دور سے آ رہی تھی لیکن رات کے گہرے سناٹے میں بہت واضح تھی جیسے کوئی عورت بہت خوفناک طریقے سے بین کرنے کے سے انداز میں چلا رہی ہو۔ اس کی آواز میں نسوانیت کم اور حیوانیت زیادہ تھی۔ وہ اپنا کام روک کے اس آواز پہ غور کرنے لگی۔ وقفے وقفے کے ساتھ وہ آواز باہر کے ویران سناٹے میں گونجتی اور افراحہ خوف سے کانپ جاتی۔ وال کلاک پر نظر پڑی تو اس نے علی کو کندھے سے پکڑ کے ہلایا۔ علی! باہر سے بہت خوفناک آواز آ رہی ہے۔

علی نے آنکھیں کھول کے پہلے دائیں بائیں دیکھا اور پھر نہ سمجھ آنے والے انداز میں افراحہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تو افراحہ نے باہر کی طرف اشارہ کیا وہ خوفناک آواز پھر سے گونجی تو علی نے نیند بھرے لہجے میں پوچھا، یہ کیا ہے؟

پتہ نہیں؟ افراحہ نے ڈرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ چلو سو جاؤ، یہ کہتے ہی وہ پھر سے کروٹ لے کے سو گیا اور افراحہ کو اس کے اس لاپرواہ رویے پہ حیرانی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آنے لگا۔ وہ اس خوفناک آواز کا پھر سے انتظار کرنے لگی۔ لیکن اس کے بعد وہ آواز سنائی نہیں دی۔ اس نے ٹائم نوٹ کیا، تین بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے اور وہ آواز دو بج کر پینتالیس منٹس سے لے کر تین بجے تک آتی رہی تھی اور اب مکمل خاموشی تھی۔ اس نے کمپیوٹر بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی، بہت دیر تک وہ اس آواز کے دوبارہ سنائی دیے جانے کے خوف سے جاگتی رہی۔

جبکہ علی ہر چیز سے بے خبر گہری نیند سو چکا تھا اور پھر آخرکار اسے بھی نیند نے اپنی آغوش میں لے ہی لیا۔

صبح جب اس نے علی سے رات والی آواز کا ذکر کیا تو اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اچھا؟ ہاں! رات کو تم نے اٹھایا تو تھا، کیا کہہ رہی تھی؟

علی! سیریسلی؟ تم نے وہ آواز خود سنی تھی اور مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ یہ کیا ہے؟ افراحہ نے اسے حیرت سے جواب دیا۔ اچھا؟ کہا ہوگا۔ مجھے یاد نہیں۔ اچھا میں لیٹ ہو رہا ہوں آ کر بات کریں گے۔ اور وہ کمرے

سے نکل گیا۔ اب کیا بات کرنی اس بارے میں جو تمہیں یاد ہی نہیں۔ افراحہ نے اسے جاتے جاتے اونچی آواز میں کہا۔ چلو ٹھیک ہے لاک کرلو۔ اور وہ لاؤنج سے نکل گیا۔ اور وہ جو کمرے سے اس کے پیچھے آئی تھی، چڑ کے لاؤنج کا دروازہ لاک کرنے لگی۔

واپس مڑی تو سامنے لاؤنج میں آتش کھڑا تھا لیکن اس کی نظروں سے اوجھل۔ اور پھر صبح سے شام تک وہ اس کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا جب تک کے وہ سونے کے لیے بیڈ پہ نہیں چلی گئی۔

وہ جب باہر آیا تو ابرام مستقل ٹھکانے کی تلاش میں نکلنے کی غرض سے تیار کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ایرا تھی۔ ہمارے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں اور تم نے اس نئی آنے والی کے گھر میں اپنا ٹھکانہ بنا رکھا ہے؟ صبح سے تم وہیں ہو۔ اسے اس گھر سے نکالنا ہے تو ہمیں بتاؤ، ہم تمہاری مدد کرتے ہیں۔ ایسا ڈرائیں گے اسے کہ دو دن میں یہ مکان چھوڑ جائے گی۔ لیکن تم نہ تو خود کچھ کر رہے ہو اور نہ ہمیں کچھ کرنے دے رہے ہو، آخر تم چاہتے کیا ہو؟ ایرا نے آتش سے پوچھا تو وہ بھڑک اٹھا۔

میں جو بھی چاہتا ہوں، تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم صرف اس بات کی فکر کرو کہ اگر تم نے اسے ڈرانے اور گھر سے نکالنے کی کوشش کی تو میں تم سے شادی سے انکار کردوں گا۔ آتش نے یہ کہتے ہی ہوا میں چھلانگ لگا دی اور ابرام بھی اس کے پیچھے لپک گیا جبکہ ایرا غصے میں کھڑی وہیں تلملاتی رہ گئی، باز آنے والی تو وہ بھی نہیں تھی۔

اس آدم ذادی کے پیچھے آتش نے اسے دھمکی دی تھی۔ اس نے افراحہ کو اپنی توہین کی وجہ سمجھتے ہوئے اپنے ارادے پہ قائم رہنے کا فیصلہ کیا اور رات کے پونے تین بجے قبرستان سے منسلک گھر کی دیوار کے پاس پہنچ گئی وہ جس دیوار کے پاس تھی اس کے اوپر افراحہ کا بیڈروم تھا وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنا آرٹیکل مکمل کر کے لیٹی تھی، سونے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ اسے اس گھر کے بالکل باہر سے پھر وہی کل رات والی آواز سنائی دی لیکن اس بار وہ آواز بہت واضح تھی اور بہت قریب سے آرہی تھی۔ کسی عورت کے ہولناک انداز میں بین کرنے کی سی آواز۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے کمرے کی نچلی دیوار کے باہر کھڑا ہی یہ خوفناک آوازیں نکال رہا ہے۔ اس نے وقت دیکھا کل والا ٹائم تھا۔

اس نے علی کو اٹھایا تو وہ نیند ٹوٹ جانے پر افراحہ پہ بگڑ گیا۔ اور اس بری طرح جھڑک دیا۔ کیا مصیبت ہے؟ آدھی آدھی رات تک جاگو گی تو یہی سب سنائی دے گا نہ تمہیں، نہ خود سوتی ہو نہ مجھے سونے دیتی ہو۔ تم تو گھر پہ رہتی ہو لیکن مجھے تو آفس جانا ہوتا ہے، مجھے تو سونے دیا کرو۔ وہ علی کے اتنا زیادہ غصہ کرنے پر روہانسی ہوگئی اور علی یہ سب بول کے دوسرے ہی منٹ خراٹے لینے لگا۔ اس کی نیند ایسی ہی تھی۔ وہ کبھی بھی کہیں بھی لیٹتے ہی با آسانی سو جاتا تھا جبکہ وہ بیڈ پر سونے کے لیے لیٹنے کے بعد بھی دو ڈھائی گھنٹے تک جاگتی رہتی تھی۔ اسے بہت مشکل سے نیند آتی تھی اور اس پہ یہ خوفناک آوازیں۔

تین بج چکے تھے۔ خدا جانے یہ کیا بلا ہے جو رات کے وقت اتنی بھیانک آواز میں بین کرتی ہے؟ وہ بہت ڈر گئی تھی۔ جیسے ہی تین بجے، وہ آوازیں پھر سے بند ہوگئیں اور اس کی وجہ آتش اور ابرام کی واپسی تھی۔ وہ رات تین بجے تک اپنے قبیلے والوں کے پاس لوٹ آتے تھے۔ انسانوں کی آبادی میں رہتے ہوئے تو یہ سب دن میں غائب رہتے تھے لیکن رات کو ہی ہوتے ہوتے یہ سب باہر نکل آتے تھے اور رات کے تین بجے تو ان کی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہوتی تھیں اور یہی وقت ہوتا تھا کہ آتش اور ابرام جو کچھ دنوں سے اپنے مستقل ٹھکانے کی تلاش میں نکل کر دور دراز کے ویرانوں میں بھٹکتے تھے، رات کے تین بجے وہاں کی بھی عجیب مخلوقات کے باہر نکل آنے پر یہ دونوں بھی واپسی کی راہ لیتے تھے۔

افراحہ نے باہر سے آتی خوفناک آوازوں کے بند ہو جانے پر سکون کا سانس تو لیا تھا لیکن پھر بھی اسے

اپنے آپ کو سنبھالنے اور خود کو سلانے کے لیے کافی وقت لگ گیا اور پھر آخر کار وہ بھی سو گئی۔

اگلے روز جب اس نے سیڑھیوں میں کھلتا لاؤنج کا دروازہ کھولا تھا سامنے ڈھیروں سامان پڑا تھا۔ کارڈ بورڈ کے بڑے چھوٹے بے شمار ڈبے۔ اس نے ملازمہ کو نیچے بھیجا کہ آسیہ سے پوچھو کہ کیا اس نے یہ سامان اسٹور میں رکھنا ہے تو رکھے لیکن یہاں راستے سے اٹھالے۔ کچھ دیر بعد ملازمہ نے آکر بتایا کہ آسیہ نے دروازہ نہیں کھولا، باجی! اب سامان کا کیا کروں سیڑھیوں میں کپڑا بھی لگا نا ہے، کل بھی نہیں لگایا تھا۔ بہت گندی ہو رہی ہیں۔

تو ٹھیک ہے، یہ سامان نیچے جا کر سیڑھیوں کے نیچے بنی خالی جگہ پر رکھ آ۔ اور سیڑھیوں کی صفائی کرلو۔ ملازمہ کام کر کے چلی گئی تو کچھ ہی دیر بعد اس کے لاؤنج اور سیڑھیوں کا درمیانی دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ افراحہ نے دروازہ کھولا تو سامنے آسیہ کھڑی تھی۔ تم نے دن کے وقت بھی لاؤنج کا دروازہ لاک کر رکھا ہے؟ ایک تو کل رات تم لوگوں کے دروازہ لاک کرنے کی وجہ سے میں اپنا سامان اسٹور میں نہیں رکھوا سکی اور اب بھی اندر آنے لگی تو دروازہ لاک تھا اور میرا سامان نیچے پڑا ہے، آسیہ نے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔

تو آپ یہ سامان میرے دروازے کے آگے رکھوانے سے پہلے مجھے بتا دیتی نا۔ ملازمہ آئی تو یہ میرے دروازے کے آگے راستے میں پڑا تھا۔ میں نے اسے آپ کے پاس بھیجا لیکن آپ نے دروازہ نہیں کھولا تو میں نے اسے نیچے رکھ کر آنے کو کہا۔ افراحہ نے ساری بات بتائی۔

آئندہ میرے سامان کو میری اجازت کے بغیر مت ہلانا، آسیہ نے نہایت بدتمیزی سے کہا۔

یہ سامان میرے دروازے کے آگے پڑا ہوا تھا جو کہ ایک نہایت غیر مناسب بات ہے، سامان اوپر میرے دروازے کے آگے پڑا ہو یا نیچے سیڑھیوں پہ، دونوں صورتوں میں راستہ تو میرا ہی رک رہا ہے نہ؟ افراحہ نے کہا تو آسیہ بولی، جو بھی ہو آئندہ میرے سامان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے پہلے مجھ کو فون کر لینا، تمہیں اپنا نمبر بھیج رہی ہوں، پوچھ لینا کہ میں نے کچھ اسٹور روم میں رکھوانا ہوا تو۔ میرا اتنا قیمتی سامان ہے، اتنی مشینری ہے، الیکٹرانکس ہیں۔ تم نے تو دیکھ ہی لیا ہوگا کہ کتنے قیمتی برینڈز ہیں۔ آئندہ میری اجازت کے بغیر کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ آسیہ کی اس بدتمیزی کے جواب میں افراحہ خاموش نہ رہ سکی۔

پہلی بات تو یہ کہ مجھے کسی کے سامان کو ہاتھ لگا کر یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ ان سب باکسز میں کیا ہے اور کیا نہیں؟ اور دوسری بات یہ کہ میں اوپر والے پورشن کا اچھا خاصہ کرایہ دیتی ہوں، مفت میں نہیں رہتی جو کوئی بھی کبھی بھی دن یا رات دیکھے بغیر منہ اٹھا کے میرے لاؤنج کے دروازے پہ بنا دستک دیے سیدھا اندر چلا آئے۔ اپنی سیکیورٹی کے لیے میں دن اور رات اپنے لاؤنج کا دروازہ بند رکھنے کی مجاز ہوں۔ تیسری بات، میرے دروازے کے آگے کوئی بھی آڑ کباڑ پڑا ہوا مجھے برا لگتا ہے تو لہٰذا آئندہ اگر آپ کو اسٹور میں کچھ بھی رکھوانا ہو تو آپ مجھے فون کرنا نہ کہ آپ کا سامان میرے دروازے کے باہر رکھ جانے کے بعد میں آپ کو فون کر کے پوچھوں۔ اتنا کہہ کر وہ غصے میں بھڑکی ہوئی واپس آ گئی۔

آسیہ کو افراحہ کے اتنے دو ٹوک جواب کی امید بالکل نہیں تھی۔ وہ پیر پٹختے اندر آئی اور بشیر کو فون ملانے لگی۔ نکالو انہیں میرے گھر سے۔ ارے یہ گھر میرا ہے، میں جب چاہے اوپر جاؤں، دن ہو یا رات جب چاہوں اپنے اسٹور میں سامان رکھوں، یہ کون ہوتی ہے مجھ اجازت دینے والی؟ خود کے پاس تو سامان کے نام پہ کچھ ہے نہیں محض ایک بیڈروم کے فرنیچر کے سوا اور یہ میرے برینڈڈ سامان کو میرے ہی اسٹور روم میں رکھوانے کے لیے مجھے تیور دکھا رہی ہے۔ میں مالکن ہوں اس گھر کی اور وہ کرائے دار۔ کوئی ضرورت نہیں اوپر ان کے واش روم اور کچن کے نل وغیرہ کا کام

کروانے کی۔ دفع ہوں یہاں سے یہ لوگ! وہ آگ لگانے کی شکایت کرنے والی بھی یہی ہوگی کیونکہ اس سوسائٹی میں تو کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے ہمارے آگے بولنے کی۔ آسیہ اونچے اونچے فون پہ چلا رہی تھی۔

کیوں؟ تم سوسائٹی کی چودھرانی ہو؟ بشیر نے فون پہ جواب دیا۔

کیا؟ آسیہ نے غصے میں پوچھا۔ اوہ ہو! میرا مطلب کہ ہم کون سا یہاں کے چودھری ہیں جو لوگ ہمارے خلاف شکایت نہیں لگا سکتے؟ اور اگر یہ چلے گئے تو ہمیں وہ ایڈوانس بھی واپس کرنا پڑے گا۔ ارے! یہ دونوں بیوقوف جتنا کرایہ ہمیں دے رہے ہیں اس پرانے گھر کو نیا سمجھ کے اتنا تو پوری سوسائٹی میں کوئی کرایہ دار نہیں دے رہا۔ نہ کوئی مالک مکان بیٹھے بٹھائے اتنا کمار ہا ہے۔ تم فکر نہ کرو، ہم ان کا کوئی کام نہیں کروائیں گے۔ نہ ہی چھت پہ اپنا الگ اسٹور بنوائیں گے۔ ان کے پورشن میں موجود اسی اسٹور میں اپنا سامان رکھیں گے۔ تم بس ہر مہینے ان سے پیسے بٹورتی رہو۔ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اور بشیر نے اپنی لالچی بیوی آسیہ کو اپنے لالچی منصوبے سے قائل کر کے خاموش کروادیا۔

ادھر افراحہ جو پہلے ہی علی کے رات والے رویے پر ناراض تھی اور پھر گھر میں سینیٹری کے کاموں کے نہ ہونے پر پریشان تھی، آج آسیہ کے رویے پر بالکل ہی دل برداشتہ ہوگئی تھی اور آتش بھی اسی کے ساتھ غصے میں پھنکار رہا تھا۔ دوپہر علی جلدی گھر آیا تو افراحہ کا اترا چہرہ دیکھ کے وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی بات پر پریشان ہے۔ اس نے رات والے رویے پہ معافی مانگی تو افراحہ پھر سے روہانسی ہو کے بولی مجھے یہاں نہیں رہنا۔ اور پھر اس نے صبح کا واقعہ علی کے گوش گزار کردیا۔

کرائے داروں کی تو کوئی عزت ہی نہیں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ ہم اسے اس گھر میں رہنے کے پیسے دے رہے ہیں یا اس کے گھر کی چوکیداری کرنے کے پیسے لے رہے ہیں؟ اپنی ملازمہ کے سامنے مجھے ایسے ذلیل کررہی تھی جیسے میں اس کی ملازمہ کی بھی ملازمہ ہوں۔ ایک تو ہم سے جھوٹ بول کے، برینڈ نیو گھر کا کہہ کے، پرانا استعمال شدہ گھر اتنی چالاکی سے ہمیں کرائے پر دے دیا۔ نہ صفائیاں کروائیں، نہ گھر کے سینیٹری کے کام، اور نہ ہی اپنا اسٹور روم خالی کیا۔ اور جب دل چاہے بنا اجازت اندر چلی آتی ہے، دستک دینا بھی گوارہ نہیں کرتی۔ اپنی اور ہماری حیثیت کے فرق پہ باتیں الگ سناتی ہے، وہ تو تمہارے کہنے پہ اب میں لاؤنج کا دروازہ لاک کرنے لگ گئی ہوں ورنہ وہ تو مجھ سے پوچھنا بھی گوارہ نہیں کرتی ہمارے پورشن میں موجود اسٹور روم استعمال کرنے سے پہلے۔ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔

لیکن اتنی جلدی گھر کیسے ڈھونڈیں گے؟ ہوں! مجھے افسوس ہے کہ پہلے دن تم نے ان لوگوں کے بارے میں جو تجزیہ کیا تھا وہ درست تھا کہ پیار سے جھوٹ بول کے اپنا کام نکلوالینا اخلاق نہیں بلکہ دھوکہ بازی اور مکاری ہوتی ہے۔ صحیح کہہ رہی ہو تم ایسے کے گھروں میں رہنا کچھ لوگوں کے لیے تو نری ذلالت ہے۔ علی کو اب افراحہ کی باتیں سمجھ آرہی تھیں۔

میں اگر اپنا گھر بناؤں تو کسی اور کو کرائے پر کبھی نہ دوں۔ ایک ہی پورشن بناؤں صرف اپنی رہائش کے لیے۔ اور اگر ضرورتاً کبھی بنا کرائے پہ دینا بھی پڑا تو کم از کم کرایہ دار کا اتنا احترام تو کروں گی کہ نہ تو اس کی پرائیویسی میں خلل پڑے اور نہ اس کی انا نفس مجروح ہو۔ آخر کار اگر کوئی مجھے میرے گھر میں رہنے کے لیے رقم دیتا ہے تو مجھے اپنے اس ذریعہ آمدنی کی اپنے ذریعہ روزگار کی طرح قدر کرنی چاہیے نہ کہ اسے اپنا ملازم جان کے اس کی بے عزتی اور خود سے کمتر حیثیت کا معاشرتی فرد سمجھ کر اس کی تذلیل۔ وہ اپنی تذلیل پہ کسی قدر دلبرداشتہ تھی حالانکہ اس نے آسیہ کے رعب میں آنے کی بجائے اسے ٹھیک ٹھاک جواب دیے تھے لیکن پھر بھی آسیہ کا حقارت بھرا انداز اس سے بھلایا نہیں جارہا تھا۔

آتش اسے پریشان دیکھ کر اسی وقت باہر چلا گیا۔

علی واش روم میں شاور لے رہا تھا کہ تبھی افراحہ کے فون کی بیل بجی۔ جی! بالکل! لیکن ہم تو گھر لے چکے تھے۔ لیکن آپ بتائیں کیا آپشن ہے؟ آپ مجھے تصویریں وٹس ایپ کرسکتے ہیں؟ جی، تھینک یو۔ فون بند ہوتے ہی وہ حیرت سے مسکرانے لگی تھی۔ وٹس ایپ کی بیپ بجنے لگی۔ وہ میسج اوپن کرتی رہی اور خوشی سے اس کا چہرہ کھلتا گیا۔ علی نہا کر نکلا تو افراحہ خوشی سے تقریباً چلا اٹھی۔ اور علی کو اپنا فون دکھاتے ہوئے کہنے لگی، علی! ہمیں نیا گھر مل گیا۔ یہ دیکھو! یہ بالکل نیا گھر ہے۔ کس قدر خوبصورت ہے اور اس کا کرایہ بھی اس گھر سے کم ہے اور تو اور یہ گرانڈ فلور ہے، اپر پورشن لاک کے ساتھ۔ لینڈ لارڈز ملک سے باہر ہوتے ہیں۔ پر تمہیں کس نے بتایا اس کا؟ پتہ نہیں علی! ابھی کسی ایجنٹ کا فون آیا ہے کہنے لگا کہ آپ کچھ مہینے پہلے گھر ڈھونڈ رہے تھے تو مجھے کسی نے آپ کا بتایا تھا لیکن تب میرے پاس کوئی گھر نہیں تھا۔ اب ایک آپشن نکلی تو سوچا آپ کو فون کر کے پوچھوں کہ اگر آپ نے ابھی تک شفٹ نہیں کیا تو دیکھ لیں۔

پہلے تو میں نے اسے بتایا کہ ہم گھر لے تو چکے تھے لیکن ابھی پھر بدلنا ہے۔ تو اس نے اس گھر کے بارے میں بتایا۔ وہ خوشی خوشی بتا رہی تھی۔

فون بند کرنے کے بعد ایجنٹ ظہور اپنے ساتھی سے کہنے لگا یار یہ کال میں نے پتہ نہیں کس کو کردی؟ نمبر تو میں کسی اور کو ملا رہا تھا۔ لیکن یہ تو کسی خاتون نے اٹھایا۔ مجھے لگا کہ شاید یہی اس کلائنٹ کی بیوی ہے جو کچھ دن پہلے ہمارے ہاں آیا تھا گھر کے لیے۔ لیکن کال پہ بات ہونے کے بعد اس نمبر پہ تصویریں بھیجتے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ تو وہ پارٹی نہیں۔ یہ تو پتہ نہیں کون سا نمبر ڈائل ہوگیا مجھ سے اور اتفاق سے انہیں گھر پسند بھی آگیا ہے اور میسج بھی آیا ہے کہ یہ آج ہی یہ گھر دیکھنے آنا چاہتے ہیں۔

تو یار تجھے کیا فرق پڑتا ہے کہ کلائنٹ کون ہے؟ تیرا تو کام بن گیا نہ؟ جسے بھی جیسے بھی فون ملا، انہیں گھر تو چاہیے تھا نہ؟ تو تو ان کو گھر دکھا! اپنا کمیشن جیب میں ڈال اور آم کھا پیڑ مت گن۔

اپنے ساتھی کی باتیں سن کر ظہور بولا۔ بات تو تو صحیح کررہا ہے۔ تو پھر انہیں ٹائم دے دوں آج کا؟

تو اور کیا۔ اس کے ساتھی نے کہا تو وہ پھر سے افراحہ کو کال ملانے لگا۔ السلام علیکم! میڈم، آپ لوگ ساڑھے چار بجے تک آجائیں۔ ایجنٹ ظہور نے کال بند کی اور آتش اس پراپرٹی ڈیلر کے آفس سے نکل گیا۔ شیشے کا دروازہ کھلا اور اپنے آپ بند ہوگیا۔ آواز تو آئی لیکن کوئی اندر یا باہر آتا جاتا دکھائی نہیں دیا تو ظہور نے نظر اٹھا کے دروازے کی طرف دیکھا اور اپنا وہم سمجھ کے پھر سے اپنے فون میں مصروف ہوگیا۔ جب کہ اس کا ساتھی کمپیوٹر ٹیبل کے نیچے گھسا الجھی تاروں کو سلجھا رہا تھا۔ کون آیا تھا؟ اس نے سر اٹھا کے ظہور سے پوچھا۔ ہے نہ؟ مجھے بھی ایسا لگا کہ کوئی آیا ہے لیکن کوئی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کوئی آیا ہو اور نکل گیا ہو، میں فون میں مصروف تھا تو دیکھا نہیں اور تو میز کے نیچے تھا۔

انہیں معلوم ہی نہ ہوسکا کہ آتش نام کی ایک غیبی مخلوق کتنی دیر سے اس کے آفس میں بیٹھی اپنا کام نکلوا کے جا بھی چکی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد افراحہ گیراج میں کھڑی اپنی گاڑی کے اندر اپنا سامان رکھ رہی تھی جب لان کے بیچ کھڑی آسیہ اپنی ملازمہ سے لان کی بڑی سی چھتری کے نیچے پڑی اپنی میز صاف کرواتے ہوئے اونچی آواز میں بولی۔ احتیاط سے صاف کرو یہ کوئی عام میز اور کرسیاں نہیں ہیں، امپورٹڈ برینڈ ہے۔

گاڑی کی پچھلی سیٹس پہ علی کے لا کے رکھے بکھرے سامان کو ترتیب اور سلیقے سے رکھتی افراحہ اس کی باتوں پہ مسکرا رہی تھی۔ باجی جی! آپ کا مطلب یہ برینڈڈ ہیں؟ ملازمہ نے اپنے الفاظ کے اضافے کی اضافی معلومات پر فخر سے آسیہ کو دیکھا۔ ہاں! تجھے بڑا پتہ ہے برینڈڈ کا؟ یہ جو کرا کری تم اٹھا رہی ہو نہ سب

سے مہنگا برینڈ ہے۔ تمہیں کیا پتہ؟ اس گھر میں لگی ایک ایک چیز، یہاں رکھا ایک ایک فرنیچر، سب کچھ برینڈڈ ہے اور اتنی مہنگی برینڈڈ چیزیں صرف ان کو نصیب ہوتی ہیں جن کے پاس اپنا گھر ہوتا ہے۔ کرائے کے گھروں میں رہنے والوں کی اتنی اوقات کہاں کہ وہ ان چیزوں کو افورڈ بھی کرسکیں۔

افراحہ جواب تک آسیہ کی کم عقلی پہ زیرلب مسکراتے ہوئے اپنا کام کررہی تھی، اس کے اس آخری جملے پہ یک دم دکھی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں فوراً ہی بھیگ گئیں۔ اب تم ایک گھر سے دوسرے گھر بار بار اپنا سامان اٹھاتے پھرو گی تو آخر کو وہ کب تک سلامت بچے گا؟ تھوڑا بہت سستا سا جو بھی سامان ہوگا تمہارا وہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تو برینڈڈ تو چھوڑ واس لوکل سامان سے بھی جاؤ گی۔ اونچی آواز میں ملازمہ کو کہتی اور افراحہ کو سناتی آسیہ کی بات پہ افراحہ خاموشی سے اوپر چلی آئی، جہاں علی دروازہ لاک کررہا تھا۔ اس کی آنسوں سے بھری آنکھوں کو دیکھ کے پوچھا، ارے تم اوپر کیوں آ گئی؟ بس میں نیچے ہی آرہا تھا۔ کیا ہوا؟ اور اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے بولی، کچھ نہیں! بس جلدی چلو یہاں سے۔

ہاں بابا! ہمیشہ کے لیے جارہے ہیں ہم یہاں سے، وہ بھی تمہاری پسند کے نئے نویلے، صاف ستھرے گھر، جسے انشاء اللہ تمہاری پسند کی چیزوں سے سجائیں گے۔ وہ اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے اس کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔ علی نے گاڑی گیراج سے نکالی اور افراحہ گیٹ بند کرکے باہر جانے لگی تو آسیہ نے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ لاکر غرور کے ساتھ ملازمہ سے کہا، بند کرو گیٹ! کہاں میرا اتنا خوبصورت، ساز وسامان سے بھرا ہوا گھر اور کہاں ان کا خالی پورشن؟ اس پہ میرا مقابلہ کرتی تھی۔ دیکھا! اس سامان سے خالی گھر میں رہنا بھی اسے نصیب نہیں ہوا۔ اب پھرے گی دربدر جبکہ میں یہاں اپنے قیمتی برینڈڈ سامان سے بھرے ہوئے گھر میں رہوں گی آرام سے۔

افراحہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے ہمیشہ آسیہ کی بیوقوفانہ شوبازیوں کا جواب دیا تھا مگر آج اس گھر سے جاتے ہوئے آسیہ نے جن گھٹیا الفاظ میں اپنی اور اس کی حیثیت کا اندازہ کیا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت ذلت آمیز تھا۔ الحمدللہ! وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی بس اتنا بولی تھی۔

ہیں؟ کس بات پر؟ علی نے پوچھا۔ اگر اپنا گھر، قیمتی ساز وسامان، جائیداد، مال ودولت ہونے پر انسان اتنا مغرور ہوجاتا ہے کہ وہ ہر کسی کو حقیر سمجھنے لگے تو ایسا مکان دار بننے سے بہتر میں کرایہ داری اچھی ہے۔ کم از کم خدا نے ہم کرایہ داروں کے سر پہ چھت تو دی ہوتی ہے۔ شکر الحمدللہ! کہ مجھے غرور میں مبتلا کرنے والی ایسی آسائشیں نہیں ملیں جن سے میرا دماغ اتنا خراب ہو جائے کہ بس میری زبان پہ انہی مادی چیزوں کا تذکرہ رہے اور میں جس کو چاہے خود سے کمتر سمجھنے لگوں۔ افراحہ کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔

اور آتش گریویارڈ کے بورڈ کے پاس غمگین کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

علی نے گاڑی اسٹارٹ کی تو افراحہ نے اسے روکا۔

علی! ایک منٹ، آخری بار قبرستان کے لیے فاتحہ پڑھ لیں۔ اور دونوں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے سورت فاتحہ اور سورت اخلاص پڑھی۔ السلام وعلیکم یا اہل القبور! افراحہ نے قبرستان پہ آخری نظر ڈالی اور علی نے گاڑی آگے بڑھادی۔

وعلیکم السلام! آتش نے افراحہ کے سلام کا جواب دیا اگرچہ کہ وہ سلام اس کے لیے نہیں تھا۔ وہ نم آنکھوں سے گاڑی کو سڑک کے آخری کنارے تک جاتا دیکھتا رہا اور پھر غصے سے گھر کی جانب مڑا۔ ابرام اور ایرا جو اپنے نئے ٹھکانے سے اڑتے ہوئے آتش کی تلاش میں یہیں آرہے تھے، اسے گھر کے اندر غصے سے جاتا دیکھ اس کی جانب لپکے۔ کیا بات ہے آتش؟ اب تو ہمارا قبیلہ یہاں سے جاچکا ہے تو تم اب یہاں کیا کرنے

آتے ہو؟ ایرا نے پوچھا۔

کیا کروگی جان کے؟ اس سے پہلے تم نے کبھی میرا ساتھ دیا ہے جو آج دو گی؟ وہ غصے سے بولا۔

کیوں نہیں دوں گی؟ ایک بار کہہ کے تو دیکھو! وہ بولی۔ تم دونوں کے اندر ہمیں گھر سے بے گھر کرنے والوں کے خلاف انتقام کی آگ نہیں بھڑکتی؟ آتش کے سوال پہ ایرا کے چہرے پہ وحشیانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تمہارا مطلب ہے؟ ایرا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ہاں! آتش نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے بس اتنا ہی جواب دیا۔ کوئی رعایت؟ اس نے پوچھا۔ بالکل نہیں۔ آتش سنجیدگی سے بولا تو ابرام نے گھبرا کے پوچھا۔ اور بابا؟ آتش نے ابرام اور ایرا کی طرف دیکھا۔

انہیں کون بتائے گا؟ اور ویسے بھی ہم یہاں سے کوسوں میل دور نکل چکے ہیں۔ اور یہ ہماری یہاں اب تک کی پہلی اور آخری مہم ہے۔ ساتھ دینا ہے تو ٹھیک، ورنہ میں یہ کام اکیلے بھی کرسکتا ہوں، آتش مزید سنجیدہ ہوچکا تھا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ابرام نے ہامی بھری۔ یہ سنتے ہی آتش کسی آندھی کی طرح اڑتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا، اس کی پیچھے ایرا اور اس کے پیچھے ابرام اور پھر شروع ہوئی ایک تباہی۔

ابھی ابھی بیڈروم میں آکے لیٹی آسیہ کچن میں برتنوں کے گرنے کی آوازوں سے گھبرا کر اس طرف آئی تو اس نے چیختی چلاتی ملازمہ کو گھر سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس کے آگے بڑھتے قدم وہیں رک گئے۔ ابھی ابھی واش روم سے باہر نکلا بشیر بھی گھبرا کر باہر کی طرف لپکا تو اس نے بھی لاؤنج میں کھڑے کھڑے کچن کے اندر برتنوں کو اپنے آپ ہوا میں اڑ کر زمین پہ زور زور سے گرتے دیکھا۔ اور جیسے ہی کسی نے فریج کو اوپر اٹھا کے زمین پہ پٹخا تو وہ دونوں چیخیں مارتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف بھاگے۔ ڈائننگ ہال اور لاؤنج کا ایک ایک سامان توڑا جارہا تھا۔

آسیہ اور بشیر کے کانوں میں سامان ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ ایک لفظ برینڈڈ برینڈڈ کی بھیانک آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ان کے گھر کے ٹی وی، مائیکرو ویو، فانوس ہر چیز توڑتے ہوئے برینڈڈ برینڈڈ کا ایک شور برپا تھا وہ حواس باختہ اس افتاد پر ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال پارہے تھے اور پھر کسی نے ان کے بیڈروم کے آٹھ فٹ اونچے مضبوط دروازے کو یوں اکھاڑ پھینکا جیسے کوئی بچہ اپنے کھلونے کو پھینکتا ہے۔ ان کے کمرے کا سارا فرنیچر اٹھا اٹھا کے زمین پہ پٹخا جانے لگا۔ اور برینڈڈ برینڈڈ کی آوازوں کے ساتھ ہر چیز توڑی جانے لگی لیکن تباہی مچانے اور بولنے والے دکھائی نہیں دیتے تھے۔

بشیر کسی طرح جان بچا کر باہر بھاگ نکلا لیکن آسیہ دیوار کے ساتھ لگی بس چیختی جارہی تھی۔ وہیں آتش، ایرا اور ابرام اپنے کام میں مگن تھے۔ ویسے یہ برینڈڈ ہوتا کیا ہے؟ وہ اور ایرا جو آتش کے برینڈڈ بول کے چیزیں توڑنے پر اس کی نقل کرتے ہوئے وہ بھی برینڈڈ برینڈڈ چلاتے ہوئے چیزیں توڑ رہے تھے، اس لفظ کا مطلب نہ جانتے تھے۔ تو ابرام کو یاد آنے پر کہ وہ تو اس کا مطلب ہی نہیں جانتا۔

آتش کے پاس آکر برینڈڈ کا مطلب پوچھنے لگا۔

بعد میں تفصیل سے بتاں گا، ابھی بس اتنا سمجھ لو کہ جو کچھ اس گھر میں ہے سب بریں ڈڈ ہے، برینڈڈ کا نعرہ لگا اور سب اٹھا کے توڑ دو۔ آتش نے ابرام کو سمجھایا تو ابرام نے ایک ٹیبل لیمپ اٹھا کے پوچھا، یہ برینڈڈ ہے؟

ہاں، آتش کے جواب پہ ابرام نے اسے ہوا میں اچھال دیا، اور یہ؟ ابرام نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم کی شیشی اٹھا کے پوچھا۔ ہاں! یہ بھی، آتش کے جواب پہ ابرام نے ساری پرفیوم کی شیشوں کو زمین پہ یہ کہہ کر دے مارا کہ یہ بھی برینڈڈ ہے۔ اس نے چھت کا پنکھا اکھاڑ کے پوچھا؟ اور یہ؟ آتش ڈریسنگ روم کی الماری کھولے کپڑوں کو آگ لگاتے ہوئے بولا، کہا نہ سب برینڈڈ ہے، تو یہ بھی برینڈڈ ہے۔ اور یہ سنتے ہی ابرام جنونیوں کی طرح ہر چیز توڑتے ہوئے بولنے لگا!

یہ بھی برینڈڈ ہے، یہ بھی برینڈڈ ہے، یہ بھی برینڈڈ ہے۔

اور اور پھر دیوار میں لگی ایل ای ڈی کو اکھاڑ کے اس نے جیسے ہی زمین پہ پٹخا، وہ ایک دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھی آسیہ کے پاؤں کے پاس آ کے گری تو وہ بے تحاشہ چلانے لگی، اس کے چلانے پہ ابرام اس کی طرف متوجہ ہوا اور یہ کہتے ہوئے آسیہ کی جانب لپکا کہ یہ بھی برینڈڈ ہے۔

اور اس سے پہلے کہ وہ آسیہ کو بھی اٹھا کے زمین پہ پٹخ دیتا، آتش نے آ کر اسے تھام لیا۔ نہیں میرے بھائی! یہ برینڈڈ نہیں ہے، یہ تو سب سے گھٹیا لوکل ہے۔ اسے جانے دے۔ یہ برینڈڈ نہیں ہے؟ ابرام نے آسیہ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے آتش سے یقین دہانی چاہی۔ نہیں! بالکل نہیں، جانے دے اسے۔ اور آسیہ ان دیکھے وجود کی باتوں کی آوازوں سے شدید خوفزدہ ہوتی اٹھ کر کمرے سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ باہر کا سامان بھی سب ٹوٹا بکھرا پڑا تھا، کوئی شے سلامت نہیں بچی تھی۔ ایرا ابھی بھی ڈرائنگ روم کا سامان توڑنے میں مصروف تھی۔ آسیہ ہانپتے کانپتے کسی طرح گھر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

ڈرے اور سہمے آسیہ اور بشیر محلے داروں کے گھیرے میں گھر کے باہر کھڑے اپنی بربادی کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ جہاں اب آوازوں کا شور مدھم ہوتے ہوتے بالکل تھم چکا تھا اور ان کے گھر کی تباہی بھی۔ کیونکہ تباہ ہونے کو اور کچھ بچا ہی نہ تھا۔

مسجد کے امام صاحب جانتے تھے کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ لیکن وہ اب یہاں سے جا کر کہیں اور بس چکے تھے اور امام صاحب بھی بشیر کے سوسائٹی کے پلاٹوں اور اپنے گھر کے اردگرد کی اضافی زمین پہ ناجائز قبضہ کرنے سے لے کر، شریف محلے داروں پہ اپنا اثر و رسوخ جمانے کی کوششوں اور یہاں کے بھی درخت کٹوانے اور آگ جلانے تک کی ساری سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہٰذا وہ اس معاملے میں خاموش رہے۔ آسیہ اور بشیر اتنا ڈر چکے تھے کہ انہوں نے اس گھر میں دوبارہ کبھی قدم نہیں رکھا۔ ان دونوں نے گھر کو بیچنے کی بھی بہت کوشش کی لیکن جسے بھی محلے داروں کی زبانی اس گھر میں وقوع پذیر تباہی کا پتہ چلتا وہ یہ گھر لینے سے انکار کر دیتا۔

کچھ عرصے میں افراحہ اور علی جونی الحال اسی نئے اور پیارے سے کرائے کے گھر میں آرام سے رہ رہے تھے جو انہیں آتش کے توسط سے ملا تھا، بہت اچھی جگہ پہ اپنا ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید چکے تھے اور عنقریب اس پہ گھر تعمیر کرنے والے تھے۔

جبکہ آسیہ اور بشیر جو اپنا گھر نہ بک پانے پر نیا گھر نہیں خرید سکے تھے، آج بھی کرائے کے گھر میں رہنے پہ مجبور تھے اور وہ بھی بنا برینڈڈ ساز و سامان کے۔ اور آتش ایرا کے ساتھ انسانی آبادی سے کوسوں دور ایک جنگل کے خوبصورت درخت پر رہائش پزیر تھا۔ تم نے ابرام کو تو بتا دیا تھا لیکن مجھے تو کبھی بتایا ہی نہیں۔ آج تو بتا دو برینڈڈ کا مطلب؟ ایرا آتش سے پوچھ رہی تھی۔

"برینڈڈ کا مطلب ہوتا ہے۔ زبردستی کی مصیبت مول لینا۔" آتش نے جواب دیا تو ایرا نے چڑ کے کہا۔

جی نہیں! مجھے بیوقوف مت بنا، وہاں جو چیزیں تھیں کیا مصیبت تھیں؟

ہاں نہ! ان کے لیے تو مصیبت ہی تھیں جو انہوں نے خود مول لی تھیں۔ پر کیا فائدہ ہوا سب برباد ہو گئیں۔ آتش نے جواب دیا۔

اگر مصیبت ہی برباد ہوئی تو ان کے لیے تو اچھا ہو گیا، ایرا بولی۔

ہاں! اگر وہ ان مول لی مصیبتوں کے تباہ ہونے پہ سدھر جاتے ہیں تو ان کے لیے اچھا ہی ہے۔ ورنہ ہمیں کیا؟ دوبارہ مول لے لیں۔ برینڈڈ۔

آخری نشانی

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اچانک اسے محسوس ہوا کہ جیسے آسمان ٹوٹ پڑے گا، دروازے میں گھر کی پالتو بلی کھڑی تھی، اسے دیکھ کر نوجوان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

باذوق لوگوں کے لئے..... الفریڈ ہچکاک کی لرزہ خیز..... اسٹوریز سے انتخاب

سلاگر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی حسین بیوی جولی خواب گاہ میں ایک غیر مرد کی بانہوں میں سمٹی کچھ اس انداز سے محو کلام تھی گویا سلاگر کے بجائے وہ دبلا پتلا اور سانولا سا نوجوان ہی اس کا شوہر رہا ہو۔ سلاگر کو غصے کے ساتھ ساتھ حیرت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ اس نوجوان سے کہیں زیادہ مردانہ وجاہت کا پیکر تھا پھر جولی نے اس سے بے وفائی کیوں کی؟

"یہ عورتیں جسم میں جلتی ہوئی چتا رکھتی ہیں۔ جس کی بھینٹ کے لیے کچھ نہ کچھ ہونا ہی چاہیے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا اور جس خاموشی سے گھر میں داخل ہوا تھا اسی خاموشی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ جولی کے علاوہ اس بھری دنیا میں اس کا کوئی اور عزیز یا رشتے دار بھی نہیں تھا، اس نے تنہا زندگی سے گھبرا کر جولی کی آغوش میں پناہ لی تھی لیکن

اب وہ آغوش پرائی ہوگئی تھی۔

وہ شہر سے تیں میل دور ایک ایسے مضافاتی علاقے میں رہتے تھے جو بظاہر تو شہری زندگی سے دور تھی لیکن درحقیقت بڑی ہی پرسکون جگہ تھی۔ شہر کی ہنگامی زندگی سے اکتا کر وہ ہفتہ پندرہ دن کے لیے اس دیہی کوٹھی میں آجاتے تھے اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔

چونکہ اس بار وہ پورے سال بھر ادھر آئے تھے اس لئے سلاگر اور جولی نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ وہ کم از کم ایک ماہ تو ضرور قیام کریں گے...... لیکن ابھی انہیں اس دیہاتی قیام گاہ میں رہتے ہوئے آٹھ دن کا قلیل وقفہ ہی گزرا تھا کہ اچانک ایک کاروباری مصروفیت نکل آئی اور اسے شہر واپس جانا پڑا۔

وہ صرف تین دن کے لیے واپس شہر گیا تھا لیکن خلاف توقع وہ ایک ہی دن میں کام کاج سے فارغ ہوگیا اس لئے بلا تاخیر واپس آگیا۔ واپسی میں چونکہ خاصی رات ہوگئی تھی اس لئے اس نے خاموشی سے بیرونی دروازہ کھولا اور کار کو باہر ہی چھوڑ کر خواب گاہ تک پہنچا اس وقت خواب گاہ میں روشنی دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ فوری طور پر تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ جولی اس کی جدائی میں کروٹیں بدل رہی ہے لیکن جب اس کی سماعت سے ایک غیر مرد کی آواز ٹکرائی تو اسے بری طرح چونکنا پڑا۔

جب ان آوازوں کا اسے پوری طرح یقین ہوگیا تو اس نے بڑے ہی غیر محسوس انداز میں خواب گاہ کی اس کھڑکی تک پہنچنے کی کوشش کی جس سے وہ اندر کا تمام منظر بلا روک ٹوک دیکھ سکتا تھا تو اس پر حقیقت کا انکشاف ہوا جو ظاہر ہے اس کے لئے ہر لحاظ سے قیامت خیز تھا۔

کار تک واپس پہنچتے پہنچتے وہ کن کن کیفیات سے نہیں گزرا۔ اس نے دروازہ کھولا اور یہ سوچ کر اس کا ہاتھ اگنیشن کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ جولی کی اس جھوٹی دنیا سے کہیں دور چلا جائے گا۔ اس نے کسی انجانے جذبے کے تحت اپنی زندگی کا خطرناک ترین فیصلہ کرلیا۔

اس نے جولی کو سزا دینے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔

رات وہ کار ہی میں پڑا سوتا رہا۔ اسے جولی کو قتل کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد کسی قسم کی بے قراری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس لئے وہ سکون کی نیند سویا اور پھر علی الصبح جب وہ کار اسٹارٹ کرکے گیراج میں داخل ہوا تو اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا کہ جولی کا آشنا جاچکا ہے۔

جولی نے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس کا استقبال کیا لیکن سلاگر نے اسے زیادہ چاپلوسی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا ڈرائنگ روم میں لے گیا اور پھر اس کا گلا اس وقت تک دونوں ہاتھوں سے دبائے رہا جب تک جولی کی حسین اور بے وفا آنکھیں حلقوں سے ابل نہ پڑیں۔

وہ مرچکی تھی۔ لیکن سلاگر کے انتقام کی پیاس بجھنے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ اس نے لاش کے ٹکڑے کرنے شروع کردیئے، سرتن سے جدا کردیا۔ ہاتھ کاٹ کر الگ کردیئے۔ دھڑ کے کئی حصے کیئے اور ٹانگوں کو تین برابر حصوں میں تقسیم کرکے وہ یوں جائزہ لینے لگا جیسے اس تقسیم پر غور کررہا ہو کہ کہیں اس نے کاٹ چھانٹ کے دوران کوئی غلطی تو نہیں کردی۔

جولی کا کٹا ہوا سر اس نے کتے کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

اس کی حلقوں سے اُبلی ہوئی آنکھیں اس وقت بھی چھت پر کسی انجانے نقطے پر مرکوز تھیں، ہونٹ نیم وا تھے اور سلاگر نے محسوس کیا کہ وہ مرنے کے بعد بھی اس پر ہنس رہی ہے، اس کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ سلاگر نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

یہ غالباً ازدواجی زندگی میں تیسرا موقع تھا کہ اس نے پوری توجہ سے جولی کا بغیر چشمے کے چہرہ دیکھا ہوگا۔ وہ ہر وقت نظر کا چشمہ پہننے کی عادی تھی اس وقت بھی چشمہ سلاگر کے سامنے ہی تھا، اس نے چشمہ اٹھا کر جولی کی آنکھوں پر رکھ دیا اور پھر وہ وحشیانہ انداز سے ہنس پڑا، پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے چشمہ اتارا اور اُسے کمرے کی ایک دیوار کی جانب اچھال دیا۔

کچن میں جا کر اس نے اپنے لئے کریم ملی ہوئی

کافی کا ایک بہترین کپ تیار کیا اور واپس کمرہ نشست میں آگیا۔ کافی کی چسکیوں کے دوران اس نے ایک نظر کتے کی ٹوکری کی جانب بھی دیکھا جس میں جولی کا سر رکھا ہوا تھا پھر اس کی نگاہ اس کرسی پر مرکوز ہوگئی جس پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

دھڑ کے تین حصے جن میں ایک سے جولی کی حسین اور جنس تاثر سے بھرپور ناف بھی دکھائی دے رہی تھی، صوفہ پر رکھے ہوئے تھے۔ پہلو میں ترتیب سے رکھے ہوئے بازو اور اطراف میں دونوں پاؤں کھڑے تھے، چشمہ دیوار سے ٹکرا کر قالین پر گر گیا تھا۔ اس نے چشمے کی طرف دیکھا جس کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا اور فریم قدرے مڑا ہوا نظر آرہا تھا۔ غالباً کمرے میں گھومتے وقت اس کا پاؤں ایک مرتبہ چشمے پر بھی پڑ گیا تھا۔

اس نے چشمہ اٹھا کر آستین سے صاف کیا۔ اس کا فریم آہنی تھا گویا اسے جلا کر ضائع کرنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا اسے بھی جولی کے بے وفا جسم کے ساتھ ہی جانا چاہئے اس نے سوچا۔ وہ بیٹھ گیا اور اپنے لئے کافی کا دوسرا کپ بنانے لگا۔

''آخر یہ مجھے یہ کیوں گھورے جارہی ہے؟'' وہ زیر لب بڑبڑایا اور کتے کی ٹوکری میں رکھے ہوئے جولی کے سر کی طرف متوجہ ہوگیا جس کی ابلی ہوئی آنکھیں بدستور اس پر جمی ہوئی تھیں اس نے ایک گدی اٹھائی اور پھینک کر ماری۔

گدی کی تہہ پیشانی کے درمیانی حصے میں لگی اور نتھنوں سے خون کی باریک لکیریں ظاہر ہونے لگیں جو ٹوکری سے نکل کر قالین تک آگئیں۔

''اس کے جسم میں کس قدر خون جمع تھا'' وہ کافی کی چسکی لے کر بولنے لگا۔

کافی ختم کرکے اس نے کچن میں استعمال ہونے والے دستانے پہنے اور آری اٹھا کر دوبارہ کام میں مصروف ہوگیا!

اچانک وہ بری طرح چونک پڑا۔

دروازے پر بھاری ہاتھوں کی دستک ہورہی تھی۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''کیا پولیس؟'' یہ کہہ کر وہ خود ہی اپنی حماقت پر مسکرا دیا۔ پولیس کو ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ پولیس والے روشن ضمیر تو ہوتے نہیں کہ انہیں بیٹھے بیٹھائے اس قتل کی سن گن مل گئی ہوگی۔

اس نے جلدی جلدی کمرے کی روشنیاں بجھادیں اور دوبارہ دستک کا انتظار کرنے لگا۔

ممکن ہے پولیس کے بجائے ڈاکیہ یا بجلی کمپنی کی جانب سے کوئی میٹر ریڈر ہو۔ اس نے سوچا اور دوبارہ دستک سنتے ہی اس نے فیصلہ کرلیا کہ باہر موجود ہستی سے ضرور ملاقات کرے گا۔ اس کی خاموشی شک و شبہات پیدا کرسکتی تھی۔

ایک مرتبہ تو اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ کہیں وہ اپنے ہی جال میں نہ پھنس گیا ہو۔

جلدی جلدی لاش کے ٹکڑوں کو صوفے کے عقب میں اور کچھ کو نیچے سرکانے کے بعد اس نے کتے کی ٹوکری میں رکھے ہوئے سر کو کشن سے اچھی طرح ڈھانپا اور دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ جولی کا کٹا ہوا ہاتھ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بے خیالی میں اسے اٹھائے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

دروازے پر تیسری بار دستک ہوئی۔

''اندھے کو کال بیل دکھائی نہیں دیتی۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لیا اور اس کی نگاہیں میز پر دکھائی دینے والے دھبوں پر جم گئیں اس نے ایک چیتھڑے سے میز کو صاف کیا کپڑے کو کتے کی ٹوکری میں گدی پر پھینکا اور ٹوکری کو ایک طرف کونے میں رکھ دیا۔ جولی کا ہاتھ اس نے کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیا تھا۔

دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ سر کتے کی ٹوکری میں محفوظ نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے اسے نکالا اور سائیڈ بورڈ کی دراز کھول کر اس میں بند کردیا۔

اچانک گھنٹی بجنے لگی، گویا عقل کے اندھے نو وارد نے گھنٹی کا بٹن دیکھ لیا تھا اس صورت حال میں

سلاگر نے محسوس کیا کہ گھنٹی کی آواز اعصاب پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈال رہی ہے وہ کچھ بے قراری سی محسوس کرنے لگا، پھر اس نے جیب کو تھپتھپا کر جولی کے ہاتھ کو ٹٹولا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

سلاگر نے دروازہ کھولا اور باہر کھڑے ہوئے جوڑے کو دیکھ کر مسکرایا۔ ان کے چہرے پر شکوک و شبہات کی پرچھائیاں رقصاں تھیں آدمی چالیس برس کا موٹا تازہ اور قد آور تھا اس کے جسم پر کاروباری حضرات جیسا سوٹ تھا اور سیاہ جوتے ہلکے ہلکے چمک رہے تھے۔ عورت بھی اسی عمر کی تھی اس نے چمکدار نیلے رنگ کی جین اور سوئٹر پہن رکھا تھا..... یہ موسم کی مناسبت سے موزوں ترین لباس تھا۔

''کیا جولی گھر میں ہے؟'' عورت نے دریافت کیا۔

''نہیں.....!''

''میں اس کی ایک پرانی سہیلی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم سلاگر ہو۔''

سلاگر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ کہاں گئی ہے؟''

''وہ..... وہ ذرا قصبے تک گئی ہے۔''

''کب۔ کیا کافی دیر ہو چکی ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے شاید وہ نصف گھنٹہ پہلے ہو گئی تھی۔''

''خیر..... ہم انتظار کر لیں گے۔'' عورت نے کہا اور اپنے ساتھی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اس کا خیال درست ہے نا؟ اور سلاگر نے محسوس کیا کہ اس کا جال خود اس کے لیے تنگ ہونے لگا ہے۔ عورت اسے سامنے سے ہٹاتی ہوئی اندر گھس گئی۔

ابھی سلاگر کوئی بات بھی منہ سے نکالنے نہیں پایا تھا کہ عورت کا ساتھی جو غالباً اس کا شوہر تھا وہ بھی اندر داخل ہو گیا۔ وہ راہداری میں چلتے ہوئے ہال کمرے اور پھر ہال سے نکل کر سیدھے ڈرائنگ روم میں جا پہنچے عورت جاتے ہی اطمینان سے صوفے پر نیم دراز ہو گئی اس کا شوہر بھی آرام سے بیٹھ گیا۔

اس دوران اس عورت کی زبان ایک لمحے کے لئے بھی خاموش نہیں ہوئی وہ مسلسل چپڑ چپڑ باتیں کئے جا رہی تھی، زیادہ تر باتیں جولی ہی کے بارے میں تھیں یا پھر اپنے شوہر کے متعلق سلاگر کو جب معلوم ہوا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا وہ دیو پیکر آدمی پولیس کا ایک اعلیٰ آفیسر بھی ہے تو اس کے اوسطان خطا ہو گئے یوں بھی اسے محسوس ہو گیا کہ وہ شخص اسے عجیب نگاہوں سے گھور رہا ہے۔

سلاگر کا دل دھڑکنے لگا یہ غیر متوقع آفات نہ جانے کہاں سے نازل ہو گئی تھیں..... وہ جن صوفوں پر اطمینان سے نیم دراز تھے ان کے نیچے جولی کی لاش کے مختلف حصے چھپے ہوئے تھے اور پھر اس وقت تو سلاگر کا حلیہ ہی بگڑ گیا جب اچانک اس کی نگاہ عورت کے قدموں پر پڑی۔ وہاں خون کی باریک سی لکیر نمودار ہو رہی تھی۔

اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا صوفے کی طرف گیا پھر عورت کے پہلو میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا اس دوران اس کا دایاں پاؤں سرکتا ہوا خون کی لکیر تک پہنچا اور اس نے غیر محسوس انداز میں اسے مسل کر قالین میں جذب کر دیا۔

''کمروں کی حالت ابتر ہو رہی ہے کیا تمہیں ہمارے آنے کی توقع نہیں تھی؟'' عورت نے پوچھا۔

''نہیں مادام..... جولی نے تو مجھ سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔''

''حیرت ہے؟''

''ممکن ہے بھول گئی ہو، وہ آج کل میرو تفریح میں لگی ہوئی ہے۔''

''یہ تو اس کی پرانی عادت ہے۔'' عورت مسکرائی اور اپنے شوہر کا باقاعدہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''خیر تم ہمیں نہیں جانتے، ان سے ملو یہ میرے شوہر مسٹر ہارڈی ہیں۔''

سلاگر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مسٹر ہارڈی نے بھی مسکرائے بغیر سر کو اثبات میں جنبش دی تھی سلاگر نے فوری طور پر اپنا ذہن جولی کی لاش سے ہٹایا اور

خوب یکسوئی سے گفتگو کرنے لگا وہ کسی بات سے انہیں مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسز ہارڈی کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جولی کی پرانی اور بے تکلف سہیلی ہے۔ لہٰذا وہ اسے اپنی سہیلی کا شوہر سمجھتے ہوئے خوب ہنس ہنس کر باتیں کئے جا رہی تھی۔

''سگریٹ پئیں۔'' مسٹر ہارڈی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

سلاگر نے ایک سگریٹ لے کر سلگایا اور دھیرے دھیرے کش لگانے لگا اس نے غیر ارادی طور پر کوٹ کی جیب کو ٹٹولا اور پھر اس کے جسم میں ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی اس کا ہاتھ جولی کے ہاتھ سے ٹکرا گیا تھا۔ کٹا ہوا ہاتھ جسے اس نے فوری طور پر جیب ہی میں چھپا لیا تھا۔

''تم کچھ الجھے الجھے سے دکھائی دے رہے ہو۔'' مسز ہارڈی نے کہا۔ ''کیا جولی تمہاری مناسب دیکھ بھال نہیں کرتی؟''

''وہ بہت اچھی بیوی ہے۔'' سلاگر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جولی کے کٹے ہوئے ہاتھ کو ٹٹولتے ہوئے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ اب وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

''اسے اچانک محسوس ہوا جیسے اس کے جوتے چپک رہے ہوں غالباً کچھ خون پاؤں کے نیچے جمع ہو گیا تھا۔''

مسٹر اور مسز ہارڈی ایک دم خاموش ہو گئے ان کی توجہ سلاگر ہی کی جانب تھی۔ مسٹر ہارڈی نے گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر دبے دبے لہجے میں اپنی بیوی سے کچھ کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے جولی مزید کچھ دیر لگا دے گی؟'' مسز ہارڈی نے دریافت کیا۔

''معلوم نہیں۔'' سلاگر نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو انتظار کی اس قدر کوفت برداشت کرنی پڑے گی تو اسے جانے سے روک لیتا۔''

''بات انتظار کی نہیں مسٹر سلاگر۔'' مسز ہارڈی نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم یہاں کچھ دن قیام کرنے کی غرض سے آئے ہیں اور کل میں نے اسے اطلاع بھی دے دی تھی کیا جولی نے اس بات کا بھی تذکرہ نہیں کیا؟''

''قیام کرنے کا ارادہ ہے؟'' سلاگر نے دہرایا۔

''ممکن ہے وہ بھول گئی ہو۔''

بھولنے کی بات ایک ہی رہی۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے مسٹر ہارڈی نے منہ بنا کر کہا۔

سلاگر نے دل ہی دل میں دونوں کو گالیاں دیں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آنے والوں کو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ انہوں نے آ کر اس کے تمام منصوبے کو درہم برہم کر دیا تھا اسے سوچ بچار کے لئے وقت اور تنہائی کی ضرورت تھی۔ اگر وہ غور نہیں کر سکا تو بلاشبہ پھانسی کا پھندا اس کی گردن میں ہو گا۔

اچانک باہر دروازے پر دوبارہ دستک سنائی دینے لگی۔

''کیا سب کے سب اندھے ہو گئے ہیں۔'' سلاگر زیر لب بڑبڑایا اس کی آواز اس قدر مدھم تھی کہ کمرے میں موجود دونوں افراد سمجھ نہ سکے۔ البتہ ہارڈی فوراً گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میرا خیال ہے سامان پہنچ گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کہیں جولی نہ ہو۔'' مسز ہارڈی نے خیال آرائی کی۔

''اگر وہ ہوتی تو کال بیل کو نظر انداز نہ کرتی۔'' سلاگر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''نہ جانے لوگ گھنٹی کو کیوں بھول جاتے ہیں؟''

''دراصل اطلاعی گھنٹی کا بٹن نمایاں جگہ نہیں لگا ہے۔ اس لئے ہم نے بھی اسے نظر انداز کر دیا تھا۔'' مسٹر ہارڈی نے مسکرا کر کہا۔

''خیر میں ذرا سامان دیکھ لوں۔''

وہ کمرے سے باہر نکل گیا مسز ہارڈی نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ سلاگر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے جوتے کے نیچے کافی خون جمع ہو گیا تھا۔ ان کے جاتے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اس وقفے میں اسے کیا کرنا ہے؟

اس نے جلدی سے کوٹ اتارا اور صوفے کی پشت پر ڈال دیا اور پھر صوفے سے زور آزمائی کرنے

میں مصروف ہوگیا۔ صوفہ کچھ آگے سرکا کر وہ گوشت کے ٹکڑوں کو درست کرنے لگا اس کے ہاتھ اور بازو خون میں لتھڑ گئے۔

''کیا کر رہے ہو؟'' نسوانی آواز سنائی دی۔

وہ چونک کر پلٹا، اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ ''میں میں چیزوں کو ترتیب سے رکھ رہا تھا!'' اس نے بمشکل تھوک نگل کر کہا۔

''ارے..... تم نے تو اپنے بازو زخمی کر رکھے ہیں۔ کیا ہوا۔ ہر طرف خون ہی خون کیسے پھیل رہا ہے؟'' مسز ہارڈی نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔'' اس نے جلدی سے بہانہ تراشا۔

''لاؤ۔ مجھے دکھاؤ، پٹی باندھ دوں۔''

''میں اپنے کام ذاتی طور پر کرنا پسند کرتا ہوں شکریہ۔''

''احمقانہ باتیں نہ کرو۔'' مسز ہارڈی اس کی طرف بڑھی لیکن سلاگر نے جلدی سے کوٹ اٹھایا اور کمرے سے نکل کر کچن کی طرف بھاگا مسز ہارڈی تعجب ہوئی اس کے تعاقب میں دوڑی اس نے جاتے ہی کچن میں چھری سے اپنا ہاتھ کاٹ لیا اور خون آلود ہاتھ کو دھونے میں مصروف ہوگیا۔

وہ اس وقت کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے مسز ہارڈی بڑے اطمینان سے بوٹیاں دانتوں میں دبا دبا کر نوچتی ہوئی کھا رہی تھی اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''یہ سلاگر بھی چھپا رستم نکلا۔ کیسے لذیذ کھانے پکاتا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ گوشت پکانے میں صرف جولی ہی ماہر ہے۔''

''ہاں۔ واقعی لذیذ کھانا ہے۔'' مسز ہارڈی نے لقمہ منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

''گوشت کہاں سے حاصل کرتے ہو؟'' مسز ہارڈی نے دریافت کیا۔ ''میں نے فریج میں گوشت کی کافی مقدار دیکھی ہے۔''

''ہم ایک ماہ کا راشن اکٹھا خرید لیتے ہیں۔'' سلاگر نے جواب دیا۔ ''یہ ہنٹر بیف ہے جولی کچھ اس انداز سے اسے مسالے لگا کر رکھتی ہے کہ ایک ماہ تک گوشت خراب نہیں ہوتا۔''

''اس نے بہت دیر لگادی آج دوسرا دن ہے۔''

''لیکن اسی لاپرواہی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''

''وہ جیسی ہے آپ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر اسے جانتی ہیں۔'' سلاگر نے کہا۔

''ہاں۔ اس کی طبیعت میں لاپرواہی ہے اب کوئی تک ہے کہ ہم گھر میں آئے بیٹھے ہیں اور خود غائب ہے۔ خیر میں بھی ایک ہفتے سے پہلے واپس نہیں جاؤں گی..... ارے تم یہ گوشت کیوں نہیں کھا رہے؟''

''میں پرہیزی غذا استعمال کر رہا ہوں۔'' سلاگر نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک مرتبہ بدپرہیزی ہوگئی تو پھر کئی ماہ تک پریشان رہنا ہوگا۔''

''تم اپنی صحت کا خاصا خیال رکھتے ہو؟'' مسز ہارڈی نے کہا۔

''میں تو کیا..... یہ جولی ہی کا کام ہے کہ اس نے غذا کے سلسلے میں میری تمام لاپرواہیوں کو ختم کر دیا ورنہ بے اعتدالیوں کے ہاتھوں مستقل مریض ہو کر رہ گیا تھا۔'' سلاگر نے سبزی کی پلیٹ صاف کر کے الگ رکھتے ہوئے کہا اور پھر میز سے اٹھ گیا۔

دفعتاً مسز ہارڈی اٹھی اور ہاتھ صاف کرتی ہوئی جھک کر کرسی کے نیچے رکھے ہوئے کوٹ کو اٹھانے لگی۔

''یہ کوٹ یہاں کیوں پھینک رکھا ہے؟''

سلاگر کا دل اچھل کر حلق میں آ رہا۔ وہ اس کوٹ کو تو بھول ہی گیا تھا۔ اس کوٹ کی جیب میں وہ خون آلود چاقو موجود تھا جسے اس نے رات جولی کے ٹکڑے کرنے کے بعد رکھ لیا تھا کہ صبح کسی وقت باہر کھیتوں میں دفن کر دے گا۔

وہ تیزی سے لپکا اور مسز ہارڈی کے ہاتھ سے کوٹ جھپٹ لیا مسز ہارڈی حیرت سے ٹھٹک کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''اوہ..... غالباً اپنی چیزوں کو چھونے کے معاملے میں تم بہت حساس ہو۔''

''ہاں کچھ عجیب سی عادت پڑ گئی ہے۔'' سلاگر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی سلاگر نے کوٹ کی جیب ٹٹولی چاقو اس وقت بھی جیب میں موجود تھا۔ اس نے کوٹ لیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہارڈی الجھن آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ''عجیب شکی آدمی ہے۔'' وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''مجھے تو کچھ کریک معلوم ہوتا ہے۔'' مسز ہارڈی نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

''ممکن ہے وہ اپنی کسی دوست کے ہاں رک گئی ہو۔''

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ دونوں سونے کے لئے اوپر چلے گئے۔ سلاگر نیچے ہی رہا۔ اس وقت وہ کمرہ نشست میں بیٹھا اطمینان سے ایک ناول پڑھ رہا تھا، جب اسے اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ اس کے بن بلائے مہمان سو گئے ہیں تو وہ کتاب رکھتا ہوا اٹھ گیا۔

کمرے سے نکل کر وہ سیدھا کچن میں جا گھسا فریج کھول کر اس نے گوشت کے پارچوں کو دیکھا اور پھر بوتل کھول کر ان پر مسالہ چھڑکنے لگا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد سلاگر نے اسٹور روم کا دروازہ کھولا اور جیسے ہی اندر گھسنے لگا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر چونک پڑا۔ دروازے میں مسز ہارڈی کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے سلاگر۔ تم ابھی تک سوئے نہیں۔''

''مجھے کچھ کام تھا، سوچا اس سے فراغت پا کر ہی سونے کے لئے لیٹوں گا۔'' سلاگر نے جواب دیا۔

مسز ہارڈی اسٹور روم کی طرف بڑھی تو وہ یکا یک اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔ ''رک جاؤ ادھر مت جانا۔''

''کیوں۔ کیا بات ہے تم اسٹور میں کیا کر رہے تھے؟''

''وہاں گندگی پھیلی ہوئی ہے۔'' سلاگر نے کہا اور پھر پیشانی تھام لی، مسز ہارڈی چونک کر اس کی طرف بڑھی اور اس کا کندھا تھام لیا۔

''کیا بات ہے یہ تمہیں اچانک کیا ہوگیا ہے؟''

''شدید دردسر.....!'' سلاگر بڑبڑایا۔

میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' مسز ہارڈی نائٹ گاؤن کو درست کرتی ہوئی تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی اور وہ رومال سے پیشانی پر لرزتے ہوئے پسینے کے قطرے صاف کرنے لگا۔ ان لوگوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ زیرلب بڑبڑایا۔ ''خیر کب تک؟ جب جولی کے گوشت کی آخری بوٹی ان کے پیٹ میں اتر جائے گی تو پھر پوری طرح مطمئن ہو جاؤں گا۔'' اس نے دروازہ بند کر دیا اور کچن میں جا بیٹھا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے مسز ہارڈی کی طرف دیکھا جو اسی کی جانب متوجہ تھی۔ اس سے نگاہیں چار ہوتے ہی وہ زیرلب مسکرایا۔ ''اس وقت چائے کا یہ کپ کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔''

''جولی کہاں ہے سلاگر؟'' مسز ہارڈی نے دریافت کیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک پڑا۔

''تمہاری بیوی گھر سے تمہیں اطلاع دیئے بغیر قصبے میں گئی تھی اور آج تین دن ہوگئے وہ واپس نہیں آئی۔ کیا تمہیں تشویش نہیں؟''

''نہیں کیونکہ وہ اکثر ایسا کرتی ہے وہ مجھ سے زیادہ سہیلیوں میں خوش رہتی ہے۔''

''کیا تمہارا آپس میں جھگڑا ہوا تھا۔''

''نہیں، ہم آپس میں کبھی نہیں جھگڑتے۔''

''کیا تمہیں جولی کی یہ روش پسند ہے؟''

''مجبوری ہے مسز ہارڈی۔'' سلاگر نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''گھر میں کوئی بچہ نہیں ہے اس لئے میں اس کی تفریحات کے سامنے دیوار بننا پسند نہیں کرتا۔ جب اس کی گود ہری ہو جائے گی تو وہ خود ہی سنبھل جائے گی۔'' سلاگر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''کہیں تم میں تو کوئی کمزوری نہیں؟'' مسز ہارڈی نے ایک نیا چبھتا ہوا سوال کیا۔

''کیا مطلب؟'' ایک لمحے کے لئے سلاگر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا مگر اس نے فوراً ہی اپنی بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے غصے میں کہا۔

''مسز ہارڈی میں اپنے ذاتی معاملات میں اس قدر بے ہودہ مداخلت پسند نہیں کرتا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا مسٹر سلاگر۔'' ابھی مسز ہارڈی اپنی بات مکمل کرنے نہیں پائی تھی کہ اچانک ایک نئی آواز گونجی دروازے میں ہارڈی کھڑا تھا۔

''آخر یہ چائے نوشی کا کون سا وقت ہے؟''

''میں سوتے سوتے آہٹ سن کر چونک پڑی تھی، نیچے سے آوازیں آ رہی تھیں اس لئے دیکھنے چلی آئی یہاں پہنچی تو سلاگر کے سر میں شدید تکلیف تھی اس لئے چائے کا دور چل گیا۔'' مسز ہارڈی نے وضاحت کی میرا خیال ہے اب سونا چاہئے۔ ہارڈی نے کہا اور بیوی کو اشارہ کرتا ہوا واپس چلا گیا۔ سلاگر ان کے جانے کے بعد بھی کچن میں ہی بیٹھا رہا۔ جب ہر طرف سکوت طاری ہو گیا تو وہ ایک مرتبہ پھر اسٹور کی طرف بڑھا۔

اسٹور میں جولی کی صرف ایک ٹانگ رکھی ہوئی تھی وہ اس پر کام کرنے لگا۔ دو گھنٹے بعد اس نے بوٹیوں سے بھرا ہوا برتن اٹھایا اور کچن میں آ گیا۔ گوشت فریج میں رکھ کر اچھی طرح مسالہ چھڑکنے کے بعد وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھا..... اب وہ پوری طرح مطمئن تھا جولی کی لاش ٹھکانے لگائی جا چکی تھی اور اب اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جولی کی غیر حاضری کے بارے میں ناشتے کی میز پر بھی بحث ہوئی۔ سلاگر کچھ دیر تک تو دونوں میاں بیوی کو مناسب انداز میں جواب دیتا رہا مگر جب مسٹر اور مسز ہارڈی مسلسل سوال کرتے رہے تو اس نے جھلا کر کہہ دیا۔

''جب اسے کوئی فکر نہیں تو آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔''

''اس لئے کہ جولی نے آج تک ہم سے اس قدر بے رخی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ہمیں بلا کر خود غائب ہو جانا انتہائی بدتمیزی کی علامت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جولی اتنی غیر متمدن اور بدتہذیب نہیں۔'' ہارڈی نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' سلاگر کے چہرے سے ناگواری کے تاثرات کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ آج شہر فون کر کے میں اپنے کچھ آدمیوں کو اسے تلاش کرنے پر مامور کر دوں۔'' ہارڈی کا ایک ایک جملہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ بہرحال میں اب اس بے کار موضوع پر ایک لفظ سننا بھی پسند نہیں کرتا۔'' سلاگر نے برا سا منہ بنا کر کہا اور اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا۔

''اس کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ دروازے میں گھر کی پالتو بلی کھڑی تھی۔ بلی کی آمد کوئی غیر متوقع حادثہ نہیں تھا لیکن اس کے منہ میں جو چیز دبی ہوئی تھی اسے دیکھ کر سلاگر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ مسٹر اور مسز ہارڈی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی نگاہیں بھی بلی پر جمی ہوئی تھیں۔ سلاگر نے مہمانوں پر ایک دھندلائی ہوئی نظر ڈالی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

بلی کے منہ میں جولی کا کٹا ہوا ہاتھ دبا ہوا تھا۔

ایک انگلی میں جولی کی شادی کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اس ہاتھ کو دیکھتے ہی مسز ہارڈی ایک دلدوز چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی اور ہارڈی کا ہاتھ بے اختیار گاؤن کی جیب کی طرف رینگ گیا جس میں ریوالور رکھنا اس کی پرانی عادت تھی۔

سلاگر کو یاد آ گیا کہ یہ ہاتھ وہ اپنے کوٹ کی جیب میں بھول گیا تھا جسے بلی نہ جانے کس طرح اڑا لائی تھی۔ لیکن اب یہ سب کچھ سوچنا بے کار تھا کیونکہ وہ ہارڈی کی خونخوار آنکھوں کو اپنے جسم میں اترتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

زرتاش کا راز

سنبل وسیم سیالوی - پنڈی بھٹیاں

حسینہ غضبناک حالت میں باہر نکلی اور چشم زدن میں سادھو کو قتل کر کے اس کی روح کو کتاب میں قید کر دیا اور پھر اپنے مسکن سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں آ گئی۔

ایک ان دیکھی مخلوق کی ستم ظریفی جو کہ نوجوانوں کا خون پی کر حسین رہتی تھی

چھن..... چھن..... چھن چھن.....''

اوپر کی منزل سے پائل کی آواز آنے لگی تو صائم نے مسکراتے ہوئے طٰہٰ کا کمبل کھینچا تو طٰہٰ نے دبے دبے ہونٹوں سے مسکرا کر شازل کو مس کال کی۔ شازل بھی جاگ رہا تھا اور شاید مس کال کا ہی ویٹ کر رہا تھا۔ فوراً اٹھا اور بیڈ نمبر چار پر آیا جہاں طٰہٰ اور صائم پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔

''آ گئی.....؟'' شازل نے صائم کے ساتھ ہائی فائی کیا اور سیڑھیوں پر مکمل اندھیرا تھا، لیکن پھر بھی وہ تینوں دبے پاؤں موبائل کی لائٹ کے سہارے اوپر کی منزل پر جانے لگے۔

فیروزی میکسی پہنے..... ننگے پاؤں وہ ہاتھ میں لالٹین تھامے دھیرے دھیرے چل رہی تھی لیکن اس کی شوخ پائلیں دور تک اس کی حاضری کا اعلان کر رہی تھیں۔

شازل، طٰہٰ اور صائم اپنے سامنے اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس کے روشن چہرے سے پھوٹتی چاندنی ان سب کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

''میں زرتاش ہوں......'' گلاب کی پنکھڑیاں حرکت میں آئیں اور ساتھ ہی اس نے اپنی سمندر جیسی گہری نیلی آنکھوں سے ایک نظر تینوں کو دیکھا تو وہ تینوں جیسے بت بن گئے تھے۔

زرتاش دھیرے سے مسکرائی شاید وہ جان چکی تھی کہ وہ تینوں اس کی خوبصورتی میں ڈوب چکے ہیں۔

زرتاش نے لالٹین بجھادی اور بالکونی پر مکمل خاموشی اور اندھیرا چاگیا۔ ''شازل...... تو ہے یہاں'' طٰہٰ نے اپنے ساتھ کھڑے وجود کو ٹٹولا۔

''ہاں یار...... صائم کیا تو نے بھی دیکھا اسے اور طٰہٰ تو نے...... مجھے تو یقین نہیں آرہا کیا وہ واقعی...... لیکن ہمارے سامنے ہی کیوں......''

شازل پاگلوں کی طرح صائم اور طٰہٰ کے ساتھ کمرے میں جاتے ہوئے سوال پر سوال کررہا تھا لیکن ان سوالوں کے جواب میں وہ دونوں ہی خاموش تھے۔

☆......☆......☆

''سر کیا آپ کو خواہش نہیں ہوتی زرتاش کو دیکھنے کی۔'' طٰہٰ کے سوال پر شازل اور صائم یک دم چونک گئے۔

''ارے بھئی...... یہ جوق نہیں ہے۔ پر ایکچولی مجھے بے حد شوق ہے اور ویسے بھی زرتاش کیا ہے۔ یہ جاننے کا شوق پوری یونیورسٹی کو ہوگیا ہے۔'' سر ارحم کی بات پر ایڈونا نے زور سے قہقہہ لگایا۔ کیونکہ اسی وجہ سے ''زرتاش'' پوری یونیورسٹی کا گرم ترین موضوع بن چکی تھی۔

طٰہٰ نے شولڈر بیگ ٹیبل پر رکھا اور ساتھ ہی دوستوں کو دیکھ کر ایک برگر کے بجائے سات برگرز کا آرڈر دے دیا۔ طٰہٰ کی شروع کی عادت تھی وہ کبھی بھی اکیلا انجوائے نہیں کرتا تھا خواہ وہ کھانا ہو یا تفریحی پروگرام۔ ''کچھ نہیں......''۔

''زرتاش ملی......'' عدن نے فنگر چپس منہ میں رکھتے ہوئے کہا جس کے جواب میں سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔

''جب بھی بلواتے ہیں...... میڈم بس اپنی پائلیں سنا کر چلی جاتی ہیں۔'' سائرہ لفظ پائلیں کہتی ہوئی اچھا خاصا موڈ بگاڑنے لگی۔

''کل رات کس نے ٹرائی کی...... مجھے پائلوں کی آواز آئی تھی۔'' صائم نے برگر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے......'' ایڈونا نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔

''تم تو......'' صائم نے کیچپ کا پیکٹ ایڈونا کی طرف غصے سے پھینکا جس پر اس کا قہقہہ بلند ہوگیا۔

''کیوں کیا ہوا......'' مائرہ مسکراتے ہوئے صائم کی طرف دیکھنے لگی۔ مائرہ نے چند دن پہلے تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن لیا تھا اور اپنی خوش اسلوبی سے بہت جلد گھل مل گئی تھی۔

''یار...... ہوا یوں کہ پندرہ دن پہلے شازل کو لائبریری سے ایک بک ملی۔ وہ اکثر معلوماتی کتابیں پڑھتا رہتا ہے اس لئے...... بک کا ٹائٹل تھا ''زرتاش کا راز۔'' اس کو دلچسپی ہوئی اور لائبریری سے لے آیا بک واقعی میں دلچسپ تھی۔ وہ ایک پانی کی شہزادی ہے جو جس کو ایک بار دکھ جائے وہ اس کی سات خواہش پوری کرے گی اور تو اور ''زرتاش'' سات خواہش پوری کرنے کے بعد اس انسان پر ایک راز آشکار کرے گی۔ بہت بڑا راز۔ مصنف کا کہنا ہے وہ وہ راز بھی جان چکا ہے اور آج وہ دنیا کا امیر ترین انسان ہے چونکہ اس نے دولت کی خواہش کی تھی۔ مصنف نے زرتاش کو بلانے کا طریقہ بھی لکھا ہوا ہے پر زرتاش اپنی پسند کے انسان کے پاس جائے گی اور......''

صائم نے ایڈونا کی بات کاٹ کر کہا۔

''اور اس لڑکی نے یہ ساری بات پوری یونیورسٹی میں پھیلادی۔ اب سب لوگ زرتاش کے پیچھے پڑگئے ہیں۔''

''یہاں تک کہ سر ارحم بھی۔'' شازل نے صائم کی پلیٹ میں کیچپ انڈیلا۔

''جناب فری میں نہیں بتایا...... زرتاش کو بلوانے کا طریقہ...... فی بندہ پانچ سو روپے میں بیچا ہے۔'' ایڈونا کی بات پر طٰہٰ نے سر پکڑلیا۔

''لیکن زرتاش'' کو کیا فائدہ...... آئی میں وہ بدلے مین اگر کسی کی زندگی مانگ لے تو۔'' سائرہ نے بڑی سمجھ داری سے کہا۔

''نہیں...... بک میں لکھا ہے کہ وہ بدلے میں کچھ نہیں مانگتی......'' شازل نے ٹین پیک اوپن کیا۔

''ایسے کیسے ہوسکتا ہے......؟ مطلب جب انسان بنا مفاد کے کسی کے کام نہیں آتے تو وہ تو ہوائی مخلوق ہے۔ یار دیکھ لو۔'' مائرہ نے وارن کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ہوتا اور اگر کسی کی جان مانگ بھی لی تو ایڈونا کس کام آئے گی......'' عدن نے ہنستے ہوئے صائم کی طرف دیکھا جس پر اس نے بھی تائید کی۔

''اچھا تو کسی کے سامنے حاضر ہوئی وہ۔'' اب مائرہ بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔

''نہیں...... وہ ابھی تک کسی کے سامنے نہیں آئی۔'' طٰہٰ نے مائرہ سے کہا تو شازل نے صائم کی طرف بغور دیکھا۔

☆......☆......☆

''تیس سال پہلے وہ مصنف اور اب ہم...... کیا واقعی وہ ہماری خواہش پوری کرے گی۔''

طٰہٰ نے شازل کی طرف دیکھا جو انہماک سے کتاب میں گم تھا۔ ''وہ آئی تو بس ہمارے سامنے ہی ہے...... اب کیا سوچا ہے؟'' صائم نے موبائل آف کرکے سائیڈ پر رکھ دیا۔

''ہم نا بھی بلوائیں تو وہ پھر بھی آجائے گی۔ بوائز اور گرلز ہاسٹل میں کوئی نہ کوئی اسے بلوائے گا۔ مجھے تو اس ایڈونا پر رہ رہ کر غصہ آتا ہے تو سحر حیات کی بک تک مشہور نہیں ہوئی جتنی زرتاش مشہور ہوگئی ہے۔'' شازل اب کتاب بند کرکے بیٹھ گیا۔

''یار مائرہ کی بات میں وزن لگتا ہے۔ واقعی میں ہمیں کوئی قیمت نہ ادا کرنی پڑجائے۔'' طٰہٰ اب پریشان سا ہونے لگا تھا۔

☆......☆......☆

''چھن چھن...... چھن......'' اوپر کی منزل جہاں سر ارحم کا روم تھا۔ پائل کی آواز سنائی دی۔ صائم طٰہٰ اور شازل یک دم الرٹ ہوگئے۔

''ہم نہیں جائیں گے......'' طٰہٰ نے فیصلہ کن انداز میں دونوں کو دیکھا۔ پائل کی آواز قریب آنے لگی تھی۔

''اوئے پائل کی آواز آرہی ہے......'' عدن موم بتی لے کر آیا۔ شازل نے اس کو سر تا پاؤں دیکھا اور سمجھ گیا کہ عدن ہی زرتاش کو بلوانے کا عمل کررہا تھا۔

''اٹھ نا...... چلیں......'' عدن نے شازل کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ہم نہیں جارہے...... لالچ اچھی نہیں ہوتی یار...... چھوڑ بس۔'' صائم کہتے ہی کمبل منہ تک اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ''اور ویسے بھی......'' روشنی کی تیز چمکار نے صائم کی بولتی بند کردی تھی۔

وہ فیروزی میکسی پہنے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھ میں لالٹین لئے مسکراتی ہوئی ان کو دیکھ رہی تھی۔

''اپنی خواہش بتاؤ...... مجھے بلوانے کی وجہ۔''

زرتاش نے اپنے لب ہلائے اور پھر تصویر کی طرح ساکت ہوگئی۔ حالانکہ وہ ابھی بھی ان کے سامنے ان کا جواب سننے کے لئے کھڑی تھی۔

''ہماری پہلی خواہش یہ ہے کہ تم ہم تینوں میں سے کسی کی زندگی نہیں مانگوگی بلکہ کسی بھی طور زندگی نہیں مانگوگی۔'' شازل نے بڑی چالاکی سے کہا۔

''دوسری......'' زرتاش نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ہم تینوں کو سی ایس ایس میں ٹاپ کروادو۔'' شازل زرتاش کی نیلی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

''تیسری......'' زرتاش مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہماری جاب کنفرم کروادو۔''

''چوتھی......؟'' ''مجھے فارن سیٹ کروادو فیملی سمیت۔''

''پانچویں......؟'' ''میرے دوستوں کو ویل سیٹڈ لائف چاہیے۔''

''چھٹی......؟'' شازل نے آہستہ آہستہ اپنی ساری خواہشیں زرتاش کو بتادیں۔

''ساتویں......؟'' آخری خواہش پر شازل کے وجود پر سکتہ طاری ہوگیا۔

''میں مرنے سے پہلے ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔'' شازل کی بات سن کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی اور لالٹین بجھادی۔

''خوش ہو......؟'' شازل نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟''

''یار سنا نہیں میں نے ساری خواہشیں بتادیں اسے......'' طٰہٰ کے سوال پر شازل نے جواب دیا۔

''ہم نے سچ میں نہیں سنا...... وہ اتنی خوب صورت ہے کہ اسے دیکھنے کے بعد کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔'' صائم نے وضاحت دی تو شازل نے ان دونوں کو ساری خواہشیں بتادیں۔

''اور ساتویں......؟'' طٰہٰ نے بے چینی سے پوچھا۔

''ساتویں...... ساتویں...... یاد نہیں آرہا...... ساتویں...... پتہ نہیں پر اس نے ہماری خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا ہے۔'' شازل کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

''چل ساتویں چھوڑ...... چھ بھی پوری ہو جائیں تو بڑی زبردست بات ہے......'' صائم کھلکھلا کر ہنسا۔

''عدن کہاں ہے......؟'' عدن کو نہ پا کر صائم نے پوچھا وہ جب روشنی کا چمکارہ پڑا تھا تب سے بے ہوش ہے۔'' طٰہٰ نے پلنگ کے نیچے اشارہ کیا جہاں عدن بے ہوش پڑا تھا۔ صائم اور شازل نے اسے اٹھایا اور اس کے بیڈ پر لٹادیا۔

☆......☆......☆

''اب زرتاش کو چھوڑ کر پیپرز پر دھیان دیں......'' سر ارحم لیکچر دے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔'' سر ارحم بہت ہی اچھے پروفیسر تھے، وہ واحد پروفیسر تھے جو اسٹوڈنٹس کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے دوست بھی تھے۔

''سر آپ نے چھوڑ دیا......؟'' ایڈونا شرارت سے بولی۔

''نہیں...... آپ سے کس نے کہا...... پر وہ لگن نہیں رہی کیونکہ ''زرتاش'' بس اپنی پائلیں سناتی ہے، سامنے نہیں آتی۔'' سر ارحم کی آواز میں دکھ واضح تھا۔

''اس کی حقیقت کا اندازہ تو دو ماہ بعد ہی ہوجائے گا۔ دیکھتے ہیں وہ ہمیں ٹاپ کرواتی ہے یا نہیں۔''

''ہاں واقعی...... صائم نے شازل کی بات میں ہاں ملائی۔

''شازل آپ بتاؤ نا...... آپ نے تو سب سے پہلے وہ بک پڑھی تھی تو آپ کو کیسا لگا۔'' سر ارحم نے شازل سے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں سر...... بس جستجو ہوئی تھی لیکن واقعی میں بس پائلوں کی آواز آتی ہے اور کچھ نہیں۔'' شازل نے مختصر سا جواب دیا۔

''پر سر پائلیں اس کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔'' جو کہ نا سمجھ سے باہر ہیں۔'' مائرہ نے پوائنٹ آؤٹ کیا۔

''تو آپ کا خیال ہے کہ ہمیں اور محنت کرنی چاہیے۔'' سر ارحم نے معنی خیز نظروں سے مائرہ کو دیکھا۔

''بالکل...... وہ آئے گی۔'' مائرہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''پر میرا خیال ہے کہ اب آپ لوگوں کو فائنل کی تیاری کرنی چاہیے۔'' سر ارحم نے اپنا فیصلہ سنایا اور سب خاموش ہوگئے۔ کلاس کا ٹائم ختم ہوگیا تھا اور سب باہر آگئے۔

وقت ایسے ہی گزرتا گیا اور سب کے دماغ میں سے زرتاش اوجھل ہونے لگی۔ اب بلانے پر پائلوں کی آوازیں آنا بھی بند ہوگئی تھیں۔ اس لئے سارے اسٹوڈنٹس اپنی پڑھائی میں مگن ہوگئے تھے۔ سب کو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی جلدی تھی۔ خدا خدا کر کے امتحانات سر پر آگئے اور پھر پیپرز سے فارغ ہو کر سبھی

دوست تفریح پر نکل گئے۔

''ہیلو...... کیا سچ میں......'' طٰہٰ نے فون اٹینڈ کرتے ہی کہا۔ ''یار ہمارا رزلٹ آ گیا ہے۔ نیٹ اوپن کر۔'' طٰہٰ نے فون بند کیا اور صائم سے کہا تو صائم نے یونیورسٹی کی ویب سائٹ اوپن کی اور سب سے پہلے طٰہٰ کا رول نمبر کھولا۔

''واؤ یار...... واٹ آ سکسیس۔ گریٹ نمبرز۔'' طٰہٰ کے نمبرز دیکھ کر صائم خوشی سے بولا۔ اب صائم کا رول نمبر کھلا، اس کا رزلٹ بھی کافی اچھا آیا تھا۔

''شازل کا نمبر اوپن کرو......''

''نہیں ہو رہا......''

''شاید لوڈ زیادہ ہے۔''

''چل یونیورسٹی چلتے ہیں۔'' طٰہٰ نے بائیک اسٹارٹ کی اور وہ کچھ دیر بعد یونیورسٹی میں تھے۔

''ویل ڈن شازل احمد......'' سر ارحم نے شازل کو گرم جوشی سے کہا۔

''ارے طٰہٰ صائم...... آپ کے دوست نے پوری یونی میں ٹاپ کرلیا ہے۔ انفیکٹ ان کو چائنا بھیج رہے ہیں انہیں اسکالرشپ ملی ہے۔'' سر ارحم کی باتیں سن کر صائم اور طٰہٰ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کیونکہ وہ پڑھائی میں سب سے کم تھا۔

''Congratulations شازل......''

صائم نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔ طٰہٰ بھی آگے بڑھا۔

''باقی گروپ کا کیا بنا......'' صائم نے سر ارحم سے پوچھا۔ ''ایڈونا پاس ہوگئی ہے۔ سائرہ کی ایک کتاب میں کمپارٹ آئی ہے اور مائرہ بھی سو سو مارکس سے پاس ہوئی ہے۔ عدن کا رزلٹ تو کافی برا آیا ہے۔'' سر ارحم نے تفصیل بتائی۔

''چلیں بیسٹ آف لک...... فار یور فیوچر۔'' طٰہٰ نے شازل اور صائم سے کہا اور اپنی اپنی منزل پر گامزن ہوگئے۔

☆......☆......☆

''وجی...... وجی...... وجی......'' سارا ہال وجی کی کے لئے چیئرزاپ کر رہا تھا۔ لاسٹ منٹ پر آخری گول وجی کا منتظر تھا جبکہ مخالف ٹیم کا گول کیپر آنکھیں پھاڑے وجی کو گھور رہا تھا۔ وجی نے آنکھیں بند کر کے لمبا سانس لیا اور اگلے ہی سیکنڈز زوردار کک کیا۔ فٹ بال ہوا میں اڑتا ہوا نیٹ کی طرف بڑھا تو گراؤنڈ میں ایک دم خاموشی چھا گئی اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ فٹ بال تیزی سے اڑتا ہوا نیٹ سے ٹکرایا۔ گول کیپر نے فلائنگ جمپ لیا۔ پر بال روکنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ہال میں یک دم شور برپا ہوگیا۔

''وجی وجی......'' سارے پرجوش ہو کر گراؤنڈ میں کود پڑے ان سب میں سب سے آگے ایڈونا تھی جو اپنے بیٹے کی کامیابی پر تقریباً ناچ ہی رہی تھی۔ وجدان بھی ایڈونا کو روکنے کے بجائے اس کے ساتھ مل کر بھنگڑا ڈال رہا تھا جبکہ صائم دور کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔ ''پتہ نہیں کب عقل آئے گی اس کو۔'' صائم منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''پاپا...... ماما کو کیوں روکا...... میرے کالج والے تو ماما کے ڈانس کے فین ہیں۔'' وجدان نے ہنستے ہوئے صائم سے کہا۔ ''پاپا...... میں ایک منٹ آیا۔'' وجدان تقریباً بھاگتا ہوا کالج میں گیا۔ صائم اور ایڈونا کار میں جا کر بیٹھ گئے اور وجدان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں جب وجدان آیا تو صائم نے کار اسٹارٹ کی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ شاندار کوٹھی کے سامنے تھے ایڈونا ملازمہ سے کہہ گئی تھی کہ ان سے پہلے وہ وجدان کی پسند کے سارے کھانے ٹیبل پر سجادیئے۔ سارا گھر کھانے کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

''اف نسیمہ بی بی آپ کا ہاتھ اور آپ کا کھانا میں کسی دن کھاٹ کر ریسٹورنٹ میں مہنگے داموں فروخت کردوں گا۔'' وجدان کے مذاق پر نسیمہ بی بی کی آنکھیں ابل پڑیں جب کہ ایڈونا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''پاپا...... آپ کو پتہ ہے کل میرے فرینڈ کو ایک کتاب ملی۔ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔''

''اچھا.....؟ ہاں اچھی بات ہے انسان میں شوق ادب بھی ہونا چاہیے۔'' صائم نے کباب اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں پاپا..... مجھے کوئی شوق نہیں ہے اصل میں عالین نے بڑی مزے کی بات بتائی ہے وہ یہ کہ وہ بک کسی ''زرتاش'' نامی لڑکی کے متعلق ہے۔ اس کو ''پانی کی شہزادی'' کہتے ہیں۔ صائم وجدان کی بات کاٹ کر بولا۔ ''آپ جانتے ہو.....'' وجدان نے حیرت سے صائم کی طرف دیکھا۔

''رکیے.....'' وجدان جلدی سے اٹھا اور کمرے سے وہ کتاب اٹھا لایا۔ اس دوران ایڈونا اور صائم خاموش رہے۔ وجدان کے ہاتھوں میں کتاب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ صائم نے کانپتے ہاتھوں سے کتاب وجدان کے ہاتھوں سے جھپٹ لی۔

''یہ..... یہ تو میں نے خود..... بلکہ میں اور طٰہٰ ہم دونوں نے جلادی تھی پھر یہ'' صائم حیرت سے کتاب الٹ پلٹ کرتے ہوئے بولا۔

''میں سمجھا نہیں پاپا.....'' وجدان باپ کو تکنے لگا۔

''28 سال پہلے.....'' ایڈونا نے وجدان کو بتانا شروع کیا۔

''تو کیا انکل شازل کی مرادیں پوری ہوگئی تھیں۔'' وجدان نے ایڈونا سے پوچھا۔

''لگتا تو ہے کیونکہ اس نے ٹاپ کرلیا تھا۔ خواہش کے مطابق اس کی جاب بھی لگ گئی۔ اس نے خواہش کی تھی کہ وہ فارن رہائش کرے، وہ بھی پوری ہوگئی جب سے وہ کینیڈا گیا ہے ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں پتہ لیکن تم اس کتاب سے دور رہنا۔'' صائم نے وجدان کے ہاتھوں سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔

''لیکن پاپا شازل انکل کی خواہش تو پوری ہوگئی تھی۔ میرے خیال میں ہمیں ٹرائی کرنا چاہیے۔''

وجدان تو جیسے ڈٹ چکا تھا۔

''میں نے کہا نا..... نہیں۔'' صائم نے وہ کتاب اٹھائی اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صائم نے کتاب ایک طرف کو پھینکی اور خود کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ جس پر ''زرتاش کا راز'' لکھا ہوا دور سے چمک رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا اسے یاد تھا وہ سب، کیونکہ وہ حسینہ فیروزی میکسی میں آسمان سے اتری شہزادیوں کی طرح چھن چھن کرتی وہ بوائز ہاسٹل میں دندناتی پھرتی تھی صائم کو آج بھی زرتاش کا خوبصورت چہرہ یاد تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور کتاب کی طرف بڑھا۔ وہ جانتا تھا کہ شازل کے کینیڈا جانے کے بعد جب اسے بزنس میں مشکلات کا سامنا ہوا تو ایک دن غصے میں آکر صائم نے وہ کتاب جلادی جس کی بدولت شازل نے اپنی زندگی تو سنوار لی پر دوستوں کو دھوکے دیتا رہا۔ صائم نے جلدی سے کتاب کھولی اور پہلی سطر پر نظر پڑی تو دیکھا کہ لفظ بہ لفظ وہی تھا جو 28 سال پہلے پڑھا تھا، صائم نے دوبارہ کتاب بند کرکے رکھ دی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے وہ کتاب پھر اٹھائی اور کانپتے ہاتھوں سے کتاب کا پہلا صفحہ کھولا۔

''مصنف: شازل احمد'' صائم کے پیروں سے زمین ہی نکل گئی صائم کا دماغ چکرا گیا۔ وہ کرسی کے سہارے کھڑا ہوا اور موبائل نکال کر طٰہٰ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

مختلف جگہوں، پبلی کیشنز، سینٹرز یونیورسٹی سے جو بھی پتے لئے سب پر شازل کا کچھ پتہ نہ شازل کی فیملی کینیڈا شفٹ ہوچکی تھی لیکن وہ بھی اب پہنچ سے دور تھے۔ صائم اور طٰہٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ کینیڈا جائیں گے تاکہ شازل کا سراغ مل سکے اور پھر پہلی ہی فلائٹ سے وہ کینیڈا پہنچ گئے۔ جو پتہ شازل کے رشتے داروں نے انہیں دیا تھا وہ وہاں پہنچے۔

وہ کوئی قدیم خوبصورت گھر تھا۔ ''شازل ہٹ.....'' انگریزی میں لکھی نیم پلیٹ کو دیکھ کر طٰہٰ بڑبڑایا۔ بیل بجانے پر کوئی نہ آیا تو صائم نے اندر جانے کا فیصلہ کیا، لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ اندر دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد وہ اندر داخل ہوئے۔

''شازل..... شازل۔'' پورے ہٹ میں خاموشی پا کر وہ شازل کو آوازیں دینے لگے۔ وہ ہٹ پوری لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ کینیڈا میں اکثر لکڑی کی ہٹ بنائی جاتی ہیں جس میں صرف لکڑی کا کام ہوتا ہے۔ فرش، چھت، دروازے، کھڑکیاں سب کچھ لکڑی کا ہوتا اور یہ لکڑی بہت ہی خاص ہوتی ہے جو صرف نقش ونگاری کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ صائم اور طٰہٰ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے۔ ''شازل.....؟ ..... Anybody Here'' طٰہٰ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ اور پھر گھر کا کونا کونا چھان مارنے کے بعد وہ مایوس ہوگئے اور واپسی کے لئے مڑے وہ گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔

''چھن..... چھن چھن.....'' پائلوں کی آواز پر وہ چونک گئے۔ آواز ہٹ کے اندر سے آرہی تھی۔

زرتاش۔ 28 سال پرانی زرتاش کا خیال آتے ہی وہ دونوں پاگل کی تیزی سے اندر دوڑے پائلوں کی آواز چھت سے آرہی تھی وہ دونوں سیڑھیوں پر چڑھے اور پھر آہستہ آہستہ وہ آواز کے قریب چلتے گئے۔

پائل کی آواز ایک ہی جگہ سے آرہی تھی۔ وہاں ایک چھوٹی سی الماری بنی ہوئی تھی۔ پائل کی آواز اس الماری سے آرہی تھی۔ صائم نے طٰہٰ کو دیکھا تو طٰہٰ نے جلدی سے ہاں میں سر ہلایا۔ صائم آگے بڑھا اور الماری کا ہینڈل پکڑ کر اپنی طرف کھینچا چرچراہٹ کی آواز سے وہ الماری کھولی گئی اور ایک بھاری بھرکم انسان صائم پر گرا۔

''اوہ.....'' بے ساختہ دونوں کے منہ سے آواز نکلی۔ ''شازل۔'' صائم کے اوپر گرے ہوئے ضعیف کو طٰہٰ نے پہلی نظر میں پہچان لیا۔

طٰہٰ اور صائم نے مل کر اسے پلنگ پر لٹایا۔ پاس رکھی پانی کی بوتل سے اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

''آہ.....'' اور پھر شازل آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے لگا۔

''آ گئے تم.....؟'' شازل نحیف آواز میں بولا۔

''ہاں..... لیکن تمہیں کیا ہوا..... اور.....''

''مجھے پتہ تھا تم آؤ گے لیکن بہت دیر بعد آئے..... اب تو وقت ہی نہیں رہا۔'' شازل افسردہ لہجے سے طٰہٰ کی بات کاٹ کر بولا۔

''شازل تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے بتاؤ'' اور وہ کتاب، شازل کو مسکراتا دیکھ کر صائم چپ ہوگیا۔

''اب بتانے کا وقت آ گیا ہے..... لیکن تم جاؤ صائم کیونکہ اب وجدان کی جان خطرے میں ہے۔'' شازل ہمت کرکے بیٹھ گیا۔

''کیا بکواس کررہے ہو..... تم شازل ہنسنا بند کرو۔'' شازل کو بدستور ہنستے دیکھ کر صائم کا کھولتا خون بھڑکا۔ ''میرے دوست..... مجھے اپنی بے بسی پر ہنسی آرہی ہے کیونکہ میں بہرا ہو چکا ہوں، زرتاش کی پائلوں نے ایک سیکنڈ کا بھی سکون نہیں لینے دیا۔ مائرہ ٹھیک کہتی تھی یہ سب ہم بہت آسان سمجھ رہے تھے۔ زرتاش..... اف وہ لڑکی اپنی چھنچھناتی پائلوں سے میری ساعتیں لے گئی۔ وہ لڑکی 28 سال سے میرے ساتھ ہے۔ میرے دوستوں میں تمہیں کیا بتاؤں میری زندگی اف.....'' شازل اپنے ذہن میں بولتا جارہا تھا کہ طٰہٰ نے اپنی جیب سے پاکٹ ڈائری نکال کر لکھنا شروع کیا۔

''ہمیں بتاؤ کیا کیا زرتاش نے۔''

شازل زیرلب مسکرایا۔ ''وجدان آج رات میں چاند چڑھنے سے مرجائے گا۔'' شازل نے رکا سا جواب دیا اور کروٹ لے کر سونے لگا۔

صائم نے ایک نظر شازل کو دیکھا اور ایک زوردار لک اس کے پیٹ پر رسید کی۔ ''شازل جواب دو یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔'' شازل نے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور ہنسنے لگا۔

''تمہیں پتہ ہے اس نے پورے بوائز اور گرلز ہاسٹل کو چھوڑ کر صرف مجھے کیوں چنا.....؟ کیوں کہ وہ

کتاب سب سے پہلے میں نے چھوئی تھی میں جب اس کا مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے غلطی سے عمل بھی پڑھ ڈالا، اس کتاب کو مجھ سے پہلے ایک آدمی نے پڑھا تھا اور تقریباً 30 سال پہلے اس کے بعد میں نے اسے ہاتھ لگایا۔ اور میرے بعد وجدان نے۔

لیکن وہ پہلے اپنے شکار کی خواہش پوری کر کے اسے لبھاتی ہے۔ اس کے بعد ساتویں خواہش پوری کرتی ہے جو اس کے عین مطابق ہوتی ہے، اصل میں ساتویں خواہش اس کی اپنی ہوتی ہے جو وہ اپنے شکار سے پوری کرواتی ہے۔ زرتاش کی جان وہ کتاب ہے۔

وہ زرتاش جو برسوں پہلے پانی میں ڈوب کر مر گئی تھی اس وقت ایک سادھو اس سمندر میں پوجا کر رہا تھا اور زرتاش کی لاش نے اس کا عمل توڑ دیا تو اس سادھو نے زرتاش کے جسم کو غصے میں آ کر قید کر لیا اور زرتاش زندہ ہو گئی۔

پھر زرتاش کی روح نے سادھو کو قتل کر کے اس کی کتاب میں قید کر دیا۔ وہ کتاب ادھر سے ادھر ہوتی گئی۔ آخر وہ ایک ڈاکٹر کو ملی، اس کتاب میں زرتاش کی روح کو بلانے کا عمل بھی تھا۔ وہ ڈاکٹر محض تفریح کے لئے وہ عمل کر بیٹھا۔ اور زرتاش کی روح اس سمندر سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں آ گئی۔

زرتاش کو اپنی خوبصورتی سے بہت لگاؤ تھا چونکہ وہ مرنے سے پہلے بے حد خوبصورت تھی اور اس کی موت حادثاتی ہوئی تھی اس لئے اس کی خواہش زندہ تھی۔

میرے جانے کے بعد جب تم نے وہ کتاب جلائی تو زرتاش بہت تڑپی، بہت روئی..... میرے خدایا مجھے یاد ہے وہ یہیں تھی جب میں نے دیکھا کہ اس کو آگ لگ رہی تھی۔ اس کی فیروزی میکسی کالی پڑتی جا رہی تھی۔ اس کی پائلوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پر وہ نظر آنا بند ہو گئی۔

اس کی روح محض اس لئے زندہ تھی کیونکہ میں زندہ تھا۔ اس کی ساتویں خواہش زندہ تھی۔ اور پھر اس کا ہیولہ آ کر مجھ سے کتاب لکھواتا، وہ کتاب جو وجدان کے پاس ہے اور اب نیا سلسلہ شروع ہو گا کیونکہ وہ جاگ چکی ہے۔''

شازل کی سانسیں اُکھڑنا شروع ہونے لگیں تو وہ بولا۔ ''صائم میرے دوست جاؤ، وجدان کو بچالو۔'' شازل نے صائم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دم توڑ دیا۔

☆.....☆.....☆

''ایڈونا..... وجی..... نسیمہ بی بی.....

ایڈونا..... وجی.....'' صائم تقریباً بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ طٰہٰ بھی ان کے پیچھے تھا۔ ''صاحب جی..... وجی صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اس لئے ایڈونا بی بی انہیں اسپتال لے گئی ہیں۔'' نسیمہ بی بی سے ایڈریس لے کر وہ دونوں اسپتال پہنچے۔

''صائم.....'' صائم کو دیکھتے ہی ایڈونا روتی ہوئی آئی۔ ''وجدان کہاں ہے۔'' صائم نے ایڈونا سے پوچھا۔ اتنے میں ڈاکٹر آئی سی یو کے ماسک اتارتے ہوئے باہر نکلا۔ ''ایڈونا جی..... آپ کے بیٹے کی دماغی رگیں پھٹ چکی ہیں۔ آئی ایم سوری..... ہم اسے نہیں بچا سکے۔'' ڈاکٹر آگے بڑھ گیا اور ایڈونا صائم کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☆.....☆.....☆

''پاپا..... آپ انکل شازل کو ڈھونڈنے گئے ہیں نا..... پاپا میں نے عمل کر کے زرتاش سے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ مجھے انکل شازل کے پاس پہنچا دو..... اور دیکھئے اس نے میری خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ واپس آ جائیے، فضول میں خوار ہو رہے ہیں، میں ان سے مل کر سارے جوابات لے آؤں گا۔ پاپا..... کم بیک۔''

صائم نے موبائل پر وجدان کا آخری میسج پڑھا اور روتے ہوئے کتاب جلانے لگا۔

پراسرار چوکی

گلاب خان سولنگی-حیدر آباد

افسر نے اہلکار سے کہا وہ جگہ انتہائی پرخطر اور پراسرار ہے یہاں پر کئی لوگ اپنی جان سے جاچکے ہیں اور ان کا کوئی پتہ نہ چلا کہ وہ مرے تو کیسے مرے لیکن.....

ایک بلا کی داستان حیرت جو کہ گھنے جنگل میں رہتی تھی اور جب وہ سامنے آئی تو.....

میں ''جوزف'' امریکن آرمی سے حال ہی میں ریٹائرڈ ہوا ہوں۔ ویسے تو میں بے شمار مہمات میں حصہ لے چکا ہوں۔ لیکن مہم میری زندگی کی خطرناک ترین مہم ہے۔ میری عمر 40 سال ہے، بیوی دو بچوں کے علاوہ اور بیمار عمر رسیدہ والدہ کے میرا کوئی نہیں۔ لوگ بوڑھے ہو کر نوکری سے ریٹائرڈ ہوتے ہیں لیکن میں اب بھی خود کو جوان اور فٹ سمجھتا ہوں اور شاید یہی وجہ ہے کہ چند ماہ ہی مشکل سے اپنے آبائی قصبے میں فیملی کے ساتھ رہ پایا اور نئی نوکری کی تلاش میں چل پڑا۔ بچوں کی پڑھائی، والدہ کا علاج اور گھر کا خرچہ چلانا کوئی آسان کام نہیں، ویسے بھی انسان آخری سانس تک کچھ نیا کرنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔

اور آخر کار ایک دن انٹرویو کال لیٹر وصول ہوا۔ رات کے کھانے پر سب گھر والے جمع تھے کہ میں گویا

ہوا۔ ''مما! محکمہ جنگلات کیلی فورنیا والوں نے مجھے نوکری کے لئے بلایا ہے اور تنخواہ بھی معقول ہے، میرے خیال میں اب کافی آرام ہوگیا، اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ نوکری جوائن کرلوں؟''

میری مما کافی سمجھدار تھیں، انہوں نے کھانس کر جواب دیا۔ ''بیٹا جوزف! والدین ہر وقت اپنے بچوں کو آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ نوکری پر جاؤ مگر ہر بار جلدی آنے کی سوچنا، ویسے مجھے پہلے ہی سے پتا تھا کہ تم گھر بیٹھنے والے نہیں ہو، پہلے آرمی اور اب محکمہ جنگلات یعنی تمہاری پسندیدہ ایڈونچرل لائف۔''

خیر سب نے اجازت دے دی اور میں تیاری میں مصروف ہوگیا۔ میں ہتھیاروں پر خاص بھروسہ نہیں کرتا اس لئے ہر وقت اپنے ساتھ کمانڈو خنجر ضرور رکھتا ہوں۔ آرمی لائف میں کمانڈو خنجر چلانے کی مہارت حاصل ہے جو کہ اب تک نہیں بھولا۔

کیلی فورنیا کے جنگلات پوری دنیا میں مشہور ہیں اور آئے دن میڈیا پر ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ انٹرویو کے دوران ایک صاحب نے صاف گوئی سے کہا۔ ''دیکھو مسٹر جوزف اپ کو جس جگہ تعینات کیا جارہا ہے وہ جگہ انتہائی پُرخطر اور پراسرار ہے، یہ کوئی عام جنگلات نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ پچھلے 6 ماہ سے کئی لوگ جان سے گئے اور کچھ لاپتہ ہوئے۔ مرنے والے افراد میں ہمارے محکمے کے لوگ بھی شامل ہیں۔ جنگل میں ہر وقت وحشی قبائل کے علاوہ خطرناک چرند پرند اور غیر مرئی مخلوق کا خطرہ رہتا ہے۔''

میرے چونکنے پر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔ ''میں نے پراسرار اس لئے کہا ہے کہ مرنے والے افراد کسی ایکسیڈنٹ کا شکار نہیں ہوئے۔ بلکہ پوسٹ مارٹم سے یہ انکشاف ہوا تھا کہ زیادہ تر افراد دریا خوف کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے، کسی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور کسی کو بری طرح چیر پھاڑ ڈالا گیا تھا۔ جبکہ ڈاکٹرز کے مطابق کسی جانور کی کارستانی نہیں تھی۔ ان جنگلات کی اور بھی کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھاری بھرکم معاوضے اور مراعات دینے کے باوجود بھی کوئی یہ نوکری کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

ہم نے آپ کا پروفائل پڑھا ہے اور آپ کو اس نوکری کے لئے سلیکٹ کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ آرمی کی طرح یہاں بھی اپنی ڈیوٹی احسن طریقے سے سر انجام دیں گے۔''

آفیسر کا خطاب کافی لمبا ہوگیا تھا، سچ پوچھو تو ایسی ڈراؤنی باتیں میرے پلے نہیں پڑیں، وہاں کچھ ضروری کاغذات سائن کئے اور اپوائنٹمنٹ آرڈر لے کر بس اڈے پر آ گیا۔

محکمہ جنگلات کی ٹوٹل 136 چوکیاں تھیں اور مجھے چوکی نمبر 130 پر رپورٹ کرنی تھی جو ہمارے شہر سے چار گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی۔ بس اڈے پر کافی بھیڑ تھی اور دوپہر کا وقت تھا، ایک بس وہاں جارہی تھی لیکن آدھی خالی تھی، شاید وہاں کے لوگ بھی ان جنگلات کی کہانیوں کو سچ مانتے تھے جس طرح وہ آفیسر بتا رہا تھا۔

خیر میں تو ان باتوں کو بکواس سمجھتا تھا مجھے تو صرف اپنی نوکری سے دلچسپی تھی۔ آخر کار بس چل پڑی، بس نے خاصا طویل سفر طے کرلیا تھا، چوکی نمبر 130 کی آوازیں کر میں نے اپنا بیگ سنبھالا، مجھے اتار کر فراٹے بھرتی ہوئی بس چلی گئی۔

سورج ڈھلنے میں ابھی کچھ وقت تھا، راستے کے دائیں طرف سڑک سے ہٹ کر دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت جسے چوکی نمبر 130 کا نام دیا گیا تھا، ایسے گھنے جنگل میں واحد یہ بوسیدہ اور ویران عمارت سر چھپانے کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

میرے استقبال کے لئے دو اہلکار پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مجھے ویلکم کہا۔ ''میرا نام ڈیوڈ ہے، میں یہاں کا لوکل ہوں۔'' دوسرا بولا۔ ''میرا نام متھیو ہے اور میں بھی لوکل ہوں۔'' وہ دونوں میرے ماتحت تھے اور میں ان کا انچارج تھا۔ ایک کمرے میں تین چارپائیاں پڑی تھیں۔ دوسرے کمرے میں کچن، باتھ روم کے علاوہ تین عدد سرکاری بندوقیں اور کارتوس بھی پڑے تھے۔ جو ہمیں اپنی حفاظت کے لئے دی گئی تھیں۔ وہاں کا بغور جائزہ لے کر ہم باتوں میں مصروف ہوگئے۔

''سر آپ تھکے ہوئے ہیں اس لئے آپ آج آرام کریں، ہم نے آپ کا کھانا رکھ دیا ہے۔'' وہ دونوں مقامی افراد تھے اور سرشام ہوتے ہی واپس اپنے اپنے گاؤں چلے جاتے تھے۔ میں یہاں اجنبی تھا اس لئے چوکی نمبر 130 ہی میرا ٹھکانہ تھی۔

ڈیوٹی کچھ اس طرح تھی کہ دن کو باہر کرسیاں لگا کر ہر آنے جانے والی گاڑی اور افراد کی نگرانی کرنی تھی جبکہ مشکوک افراد کو روک کر پوچھ گچھ کرنا بھی ہماری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی وہ دونوں چلے گئے۔ میں نے موبائل پر بیوی بچوں سے بات کی اور اپنی ڈیوٹی کے بارے میں بتایا۔ ممانے بہت ساری دعائیں دیں۔

یہاں بجلی بہت کم جاتی تھی اس لئے دونوں کمرے روشن تھے۔ میں نے پہلے کھانا کھا کر بعد میں سرکاری بندوقیں چیک کیں، وہ تینوں اچھی کنڈیشن میں تھیں اور تیار تھیں۔ بعد ازاں میں نے باہر کرسی لگائی اور کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ اکا دکا گاڑیاں نظر آئیں جبکہ اندھیرا گہرا ہونے پر وہ سڑک مکمل سنسان اور ویران محسوس ہورہی تھی یعنی رات کو یہاں کوئی سفر نہیں کرتا ہوگا۔

خیر میں کافی دیر تک دائیں بائیں جنگل کا جائزہ لیتا رہا اور قریباً 12 بجے بستر پر آ کر دراز ہوگیا۔ ساری رات جنگل سے جانوروں کی آوازیں آتی رہیں لیکن مجھے خوب نیند آئی۔

میرے دونوں اہلکار بھی بیوی بچوں والے تھے اس لئے وہ کھانا کھا کر آتے تھے جبکہ ناشتے سے لے کر لنچ تک میں خود پکا کر کھاتا تھا۔ یہاں سے ایک چھوٹا سا ٹاؤن تھا جو تقریباً جنگل میں ہی واقع تھا اور ہماری چوکی سے چار کلومیٹر کی دوری پر واقع تھا۔

ہر دو ہفتے بعد میں پیدل ہی وہاں سے راشن اور سبزی بھاجی وغیرہ خرید کر کے واپس آتا تھا۔ ٹاؤن کے اکلوتے بینک سے ہر ماہ یکم کو ہمیں سیلری ملتی تھی، اپنا کرچہ نکال کر باقی رقم اپنے گھر والوں کو بھیجتا تھا۔ تین ماہ تک تو سب ٹھیک چل رہا تھا جبکہ کبھی کبھی میں اس آفیسر کے بارے میں سوچتا تھا کہ یہاں آتے وقت کس طرح اس نے ڈراؤنی باتیں کی تھیں۔

ایک رات اچانک چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی، باہر کسی جانور کے کراہنے کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں، میں نے بندوق اٹھائی اور چوکی سے باہر نکل آیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جہاں سے آواز آرہی تھیں وہاں کا رخ کیا۔ سڑک کے کنارے ایک بھیڑیا کا بچہ شدید زخمی حالت میں پڑا درد سے کراہ رہا تھا، شاید کسی چلتی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ یہاں اکثر جنگلی جانور رات کے وقت سڑک پر نکل آتے ہیں اور بعض جانور تیز رفتار کار وغیرہ سے ٹکرا کر یا تو مرجاتے ہیں یا زخمی ہوجاتے ہیں۔

میں مدد کے لئے لپکا تو وہ بچہ ایک آدم زاد کو اپنے قریب پا کر اور زور سے چلایا، میں نے فوراً اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور اندر کمرے میں لے آیا جہاں ہر وقت ایک فرسٹ ایڈ بکس پڑا رہتا ہے۔ آج وہ دوائی کام آ ہی گئی، میں نے پایوڈین سے اس کے زخم صاف کئے اور دوائی لگا کر مرہم پٹی کردی، تھوڑی دیر بعد اسے آرام آ گیا اور وہ سو گیا، میں بھی کچھ دیر سگریٹ کے کش لگاتا رہا، اور پھر میں بھی سو گیا۔ میری طرح ڈیوڈ اور متھیو بھی بھیڑیے کے بچے کا خاص خیال رکھتے تھے، ہم نے اس کی خوراک کا خصوصی بندوبست کر رکھا تھا۔ علاج کے بعد اس کے زخم بھی ٹھیک ہوگئے تھے، ابھی وہ چھوٹا تھا اس لئے رات کے وقت اس کو دوسرے کمرے میں بند کر کے رکھتا تھا تاکہ وہ باہر نہ نکل جائے اور کسی جنگلی جانور کا شکار نہ ہوجائے، باقی دن بھر وہ ہم سے کھیلتا رہتا تھا۔

کافی ماہ گزر گئے تھے اس لئے میں نے کچھ دنوں کی چھٹی لی اور اپنے گاؤں آ گیا۔ میری چھٹی کے دوران ڈیوڈ اور متھیو چوکی نمبر 130 میں سوتے تھے اور فون پر ان سے بات چیت بھی ہوتی رہتی تھی، ہر دفعہ وہ

بھیڑیے کے بچے کی شکایت کرتے تھے، ان کے مطابق وہ بھیڑیا رات کے وقت اچانک زور زور سے چیختا تھا تو ان کے آرام میں خلل پڑتا تھا۔

خیر میری چھٹی ختم ہوگئی اور میں سب گھر والوں سے الوداع کہہ کر واپس ڈیوٹی پر آ گیا اور پھر روز کا روٹین۔ وہ دونوں پہلے کی طرح سرِ شام ہی چلے جاتے تھے۔

کچھ دنوں سے بھیڑیا رات کے وقت زیادہ ہی شور مچانے لگا، میرے سہلانے سے وہ خاموش تو ہو جاتا تھا مگر بے چین ضرور رہتا تھا۔ شاید اب وہ بڑا ہو رہا تھا یا پھر جنگل میں اپنے جیسے بھیڑیوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہو خیر وجہ جو بھی تھی میرے لئے پریشان کن تھی۔

ایک دن میں ضروری سامان لینے کے لئے پاس والے ٹاؤن میں گیا، چرچ سے باہر ہو کر بازار سے ضروری سامان لیا اور واپسی کی راہ پکڑی، شام تو وہیں پر ہوگئی تھی اور اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا میں سامان اٹھائے جنگل کے درمیان پگڈنڈی سے ہوتا اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ یکدم جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہاں پر کوئی نہیں تھا، شاید میرا وہم تھا، خیر میں دوبارہ چل پڑا اس مرتبہ یونہی اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایسے لگا جیسے کسی نے مجھے دیکھ کر درخت کی اوٹ لے لی۔ میں نے فوراً خنجر نکالا شاید کوئی آدم خور جنگلی نہ ہو میں آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس درخت کی طرف بڑھنے لگا، لمحہ بہ لمحہ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے! میں نے خود اپنی آنکھوں سے کسی بندے کو وہاں چھپتے دیکھا تھا، تو آخر وہ کہاں چلا گیا؟ میں نے خود کلامی کی۔

جنگل واقعی خطرناک تھا، بہت قریب سے شیر، بھالو اور ہاتھی کی آوازیں محسوس کر رہا تھا اس لئے خنجر ہاتھ میں ہی پکڑے رکھا اور پاؤں پر زور رکھا لیکن شاید وہ بھی میرے تعاقب میں تھے۔

اچانک جھاڑیوں میں سے ایک شیر نمودار ہوا، میرے پاس بندوق نہیں تھی اور اس خنجر سے ایسے وحشی جانور سے لڑنا بیوقوفی تھی، اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر لپکے میں فوراً ایک گھنے دراز درخت پر چڑھ گیا، شیر کافی دیر غصے سے دھاڑتا رہا اور مجھے گھورتا رہا، وہ بہت بھاری بھرکم تھا اس لئے بڑے درخت پر نہیں چڑھ سکتا تھا اس لئے وہ چلا گیا۔ میں کافی دیر تک درخت پر بیٹھا رہا رہا، تاکہ وہ واپس نہ آ جائے۔ لیکن وہ نہیں آیا اور میں درخت سے نیچے اتر آیا۔

اب مجھے احساس ہو گیا تھا کہ آفیسر نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ جنگل پر خطر بھی ہے اور پر اسرار بھی، کبھی تو یہاں کوئی نہیں آتا۔

چوکی تک پہنچنے تک جیسے کوئی سایہ میرا پیچھا کرتا رہا جبکہ بھیڑیا بھی شدید چیخ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دوڑتا ہوا میرے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ وہ مجھ سے کافی مانوس ہو گیا تھا۔ آج کی رات بڑی مشکل سے کٹی، ساری رات ان واقعات کو لے کر سو چتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح کو ڈیوڈ اور میتھیو نے اس بات کا ذکر کیا، وہ تو پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے، میری بات سن کر وہ بھی سہم گئے اور میری ہمت کی داد دینے لگے۔ ”سر جی! آپ کا حوصلہ ہے جو اس چوکی میں اکیلے سوتے ہیں، آپ سے پہلے جتنے بھی انچارج تعینات ہوئے تھے یا تو وہ بھاگ گئے یا لاپتہ ہو گئے، جبکہ ان میں سے اکثر رات مل پاس والے قصبے میں جاتے تھے جہاں نائٹ کلب میں مستی کرتے تھے جبکہ چوکی خالی رہتی تھی اور وہ صبح کو واپس آتے تھے، یہاں تو کوئی چیک کرنے والا ہے اور نہ ہی محکمے سے یہاں آنا کوئی پسند کرتا ہے، سب ڈرے ہوئے لوگ ہیں، ہم تو صرف دن میں ڈیوٹی کرتے ہیں مگر سلام ہے آپ کو جو رات کو بھی اپنی ڈیوٹی احسن طریقے سے سرانجام دیتے ہیں۔“

”فکر معاش کی وجہ سے یہ سب کرنا پڑتا ہے اور میں کوئی امیر زادہ نہیں، مقامی لوگ تو دن میں بھی فاریسٹ آنے سے کتراتے تھے جبکہ پاس والی چوکیوں کے ایسے ہی حالات تھے، کبھی کبھار دوسری چوکیوں کا بھی چکر لگتا تھا، لیکن وہ بھی چوکی نمبر 130 کو خطرناک

ترین چوکی مانتے تھے۔

ایک رات کا ذکر ہے، میں چوکی میں سو رہا تھا، باہر موسم بہت خطرناک تھا۔ شدید بارش اور طوفانی ہواؤں کے شور کے ساتھ آسمانی بجلی کی چمک نے جنگل کا ماحول پراسرار بنا دیا تھا۔ آج پھر میرا پالتو بھیڑیا چیخ رہا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی، میں نے اسے دوسرے کمرے میں بند کر کے دروازے کی کنڈی لگا دی، سگریٹ کے کش لگانے لگا۔

اچانک باہر کا دروازہ زور سے بجنے لگا، رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے، شاید کسی مسافر کی گاڑی خراب ہوگئی ہو اور اسے میری مدد درکار ہو، میں اٹھا اور دروازہ کھولا، باہر ایک خوبرو لڑکی بارش میں بھیگ رہی تھی۔ ”معاف کیجیے وہ دراصل میری کار خراب ہوگئی تھی مدد کے لئے آپ کے دروازے پر دستک دی۔“ میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی لیکن کار نظر نہیں آئی۔ ”یہ آپ کی کار تو نظر نہیں آ رہی۔“

وہ زیر لب مسکرائی۔ ”دراصل یہاں سے کافی دور میری کار کھڑی ہے، میں کافی دور نکل آئی ہوں، بارش رک جانے تک میں یہاں رک سکتی ہوں کیا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”یہاں کیوں نہیں آپ اندر تشریف لے آئیے۔“ اس کے پاؤں کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی میرا پالتو بھیڑیا جو دوسرے کمرے میں بند تھا زور زور سے چلانے لگا تو وہ لڑکی شدید سہم گئی اور فوراً پیچھے مڑ گئی۔

”ارے میڈم ڈرو نہیں وہ میرا پالتو بھیڑیا ہے، وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا اور وہ دوسرے کمرے میں بند ہے۔“

ڈرتے ڈرتے وہ ایک کونے میں رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑے مکمل طور پر گیلے ہو گئے تھے جبکہ بھیڑیا بدستور شور مچا رہا تھا۔

”دیکھو میڈم آپ کے کپڑے مکمل طور پر بھیگ چکے ہیں، میرے خیال میں آپ کو سب سے پہلے واش روم میں اپنے کپڑے چینج کر لینے چاہئیں، پر یہ تو میرا تو لیہ

ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کی دستیابی

مہران نیوز ایجنسی
حیدرآباد
0222-780128

الفتح نیوز ایجنسی
مہران مرکز سکھر
071-5613548

احمد نیوز ایجنسی
شاہی بازار بہاولپور
0300-6836902

الشیخ نیوز ایجنسی
اخبار مارکیٹ ملتان
0300-7388662

انصاری بک اسٹال
پرنس روڈ کوئٹہ
0333-7842310

اقبال پرویز نیوز ایجنسی
گجرانوالہ سٹی
0333-8103489

اشرف بک ایجنسی
کمیٹی چوک راولپنڈی
051-5531610

اور چادر، میں جب تک لکڑیوں کی آگ جلاتا ہوں۔"

میں نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ واش روم اس کمرے میں ہے۔ یہ سنتے ہی وہ چیخ پڑی۔ "نہیں نہیں، مجھے اس کمرے میں نہیں جانا، میرا مطلب ہے واش روم کی ضرورت نہیں ہے۔" عجیب بات ہے، وہ پھر یہاں کس لئے آئی تھی۔

میں نے کہا۔ "میڈم میں کوئی گاڑی کا مکینک نہیں، اس چوکی کا انچارج ہوں اور یقین مانیں میں ایک شریف انسان ہوں۔"

وہ میری بات سمجھ گئی تھی بولی۔ "ڈر آپ سے نہیں، اندر بیٹھے بھیڑیے سے لگتا ہے۔" وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس کی آواز بہت ہی عجیب اور بے سری تھی، وہ اس طرح بات کرتی تھی جیسے کوئی خونخوار شکار کو دیکھ کر غراتا ہو۔

"آپ کو اس ویران جنگل میں ڈر نہیں لگتا؟"

اس کے سوال پر میں مسکرایا اور سگریٹ نکال کر کش بھرنے لگا۔ "نہیں۔" میرا مختصر جواب سن کر وہ بھی مسکرائی۔ "بہادر لوگ مجھے پسند ہیں لیکن خودکشی کے لئے چوکی نمبر 130 میں کیوں۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "جی! میں سمجھا نہیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور دوسری طرف منہ کر کے کھڑی ہوگئی تب میری نظر اس کے پورے سراپے پر پڑی۔ "اوہ مائی گاڈ! اس کے پاؤں تو الٹے تھے، چھل پیری یعنی چڑیل، میں نے سرعت سے بندوق اٹھائی اور اس کی طرف تان کر کھڑا ہوگیا اور پھر وہ بلا میری طرف مڑی اس کی خوفناک شکل دیکھ کر میرے حواس باختہ ہوگئے۔ وہ زور زور سے ہنسی۔

اور میری بندوق کو کیا ہوگیا۔ ٹریگر دبانے کے باوجود وہ نہیں چلی تو اسے پھینک کر میں نے خنجر نکالا لیکن میرے ہاتھ بھی سُن ہوگئے، میرا پورا جسم جیسے پیرالائز ہوگیا ہو جیسے میں پتھر کا ہوگیا تھا۔

وہ میری کیفیت سے محظوظ ہورہی تھی پھر وہ میرے قریب آئی اور بولی۔ "بھاگ جاؤ یہاں سے یہ جنگل میرا ہے، یہ آخری وارننگ ہے، اگلی مرتبہ اس جگہ کے آس پاس بھی نظر آئے تو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گی......"

وہ کب کی چلی گئی تھی مجھے پتہ ہی نہیں چلا، اس کے جانے کے بعد بھی گھنٹوں میں وہاں بت بنا کھڑا رہا۔

آخرکار مجھے ہوش آگیا اور باہر دیکھا لیکن وہاں کوئی ذی روح نظر نہیں آئی، بارش رک چکی تھی، میں واپس کمرے میں آیا لیکن میری حالت شدید خراب تھی اور بے ہوش ہو کر بستر پر گر پڑا۔

اگلے دن ہوش آیا، میرے ماتحت اہلکار میرے سر کے اوپر کھڑے تھے۔ "سر انہیں کیا ہوگیا ہے آپ کو، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔"

میں اٹھ بیٹھا اور ان کو سارے واقعے سے آگاہ کیا۔

میری بات کر وہ شدید ڈر گئے اور میری حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ مجھے شدید بخار تھا، ڈیوڈ نے فرسٹ ایڈ بکس میں سے بخار کی گولی نکال کر مجھے دی۔

اس چڑیل کی ہیبت ابھی تک میرے حواس پر طاری تھی۔

میتھیو بولا۔ "سر میں نے سنا ہے کہ ہوائی مخلوق یعنی بھوت پریت بھیڑیے سے بہت ڈرتے ہیں اور بھیڑیا ہی وہ واحد جانور ہے جسے جن بھوت دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے لڑتا بھی ہے، تو جس وقت وہ چڑیل لڑکی کے روپ میں آئی تھی وہ ہمارا پالتو بھیڑیا کیا کر رہا تھا؟"

وہ اب بھی دوسرے کمرے میں بند تھا، ہم نے دروازہ کھولا اور بھیڑیا جو ایک کونے میں بیٹھا اور ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر بھاگتا ہوا میرے قدموں میں آکر بیٹھ گیا، شاید اس نے اس چڑیل کی موجودگی کو محسوس کرلیا تھا اسی لئے پوری رات جب تک وہ چڑیل گھر میں موجود تھی وہ زور زور سے چیختا رہا۔

لیکن میں یہ بات کیسے بھول گیا کہ بھیڑیے کو ایسی نادیدہ مخلوق بھی دکھائی دیتی ہے۔

کچھ دن طبیعت خراب رہی پھر آہستہ آہستہ طبیعت بحال ہوگئی، میں نے گھر والوں سے اس بات کا اظہار نہیں کیا، دراصل میں اپنی مما کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ڈیڈ کے گزر جانے کے بعد مما نے بہت مشکلوں سے مجھے پالا پوسا اور پڑھایا تھا۔ اب آخری عمر میں مما کے لئے کوئی بھی صدمہ ناقابل برداشت تھا اسی لئے آرمی سروس کے دوران بڑے مشکل دور میں بھی میں ہمیشہ اپنی مما کو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، حوصلہ دیتا تھا اور اب بھی یہی روٹین ہے جبکہ میری بیوی ہمیشہ مجھے ٹوکتی رہتی ہے کہ مجھے اپنی پریشانی بیان کرنی نہیں آتی۔

آج طبیعت کچھ بوجھل سی تھی اس لئے میں رات دیر تک سڑک پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک عورت پر پڑی جو سڑک کنارے کسی گاڑی کے انتظار میں شاید کھڑی تھی، میں نے سمجھا یہ وہی چڑیل ہے جو دوسرا روپ بدل کر میرے سامنے کھڑی تھی، سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ محاورے کے مطابق مجھے اب ڈر لگ رہا تھا اس لئے میں ڈرتے کانپتے اس کے قریب آیا، پہلے تو میں نے اس کے پاؤں کی طرف غور سے دیکھا جب پوری تسلی ہوگئی کہ اس کے پاؤں بالکل ٹھیک ٹھاک نارمل ہیں تب جا کر کہیں مجھے حوصلہ ملا اور بات کی۔

"میڈم آپ کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں؟ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ "میں راستہ بھٹک گئی ہوں اور کسی گاڑی کی لفٹ کے لئے کھڑی ہوں۔"

شکر ہے چوکی نمبر 130 وہاں موجود تھی جو کبھی کبھار مسافر خانے میں بدل جاتی تھی اور اوپر سے میری ہمدردانہ طبیعت، خیر وہ میرے ساتھ چوکی میں آگئی، اسے دیکھ کر بھیڑیا بھی خاموش رہا پھر جا کر میری پکی تسلی ہوئی کہ وہ چڑیل نہیں تھی۔ اسے کھانا وغیرہ سرو کی اور کافی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔

صبح ہوتے ہی اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی راہ لی۔ حالات معمول پر آگئے تھے۔

ایک رات بدقسمتی سے میرا چوکی کے سامنے سڑک پر ایک ہولناک حادثہ ہوا۔ دو کاریں آپس میں ٹکرا گئیں اور دونوں میں بیٹھے مسافر فوت ہوگئے۔

صبح تک پولیس آگئی تھی، کسی کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسی ویران سڑک پر ایسا خوفناک ایکسیڈنٹ ہونا کیسے ممکن تھا۔

وہ سارے لوگ ایک ہی بات دہراتے تھے کہ پچھلے سارے واقعات کی طرح اس میں بھی کسی غیر مرئی مخلوق کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ خیر جتنے منہ اتنی باتیں۔

اگلے دن محکمہ جنگلات والوں نے ہمیں آرڈر دیا کہ آج کے بعد ہم تینوں اہلکار رات کے وقت اکٹھے چوکی میں ڈیوٹی دینگے۔

میں تو عادی تھا لیکن ڈیوڈ اور میتھیو کو چوکی میں سونے سے مشکل پیش آرہی تھی اور ان کی وجہ بھی جائز تھی، وہ دونوں مقامی تھے لیکن سرکاری ڈیوٹی تھی اس لئے فی الحال مصلحتاً وہ خاموش رہے۔

ایک رات کا ذکر ہے ہم سب سو رہے تھے کہ مجھے خواب میں اپنی مما نظر آئیں۔ میں خواب میں بھی سویا ہوا نظر آرہا تھا کہ مما نے مجھے جگایا۔ "اٹھو بیٹا جوزف آؤ میرے ساتھ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

میں نیند سے اٹھا تب مما میرا ہاتھ پکڑ کر کافی دور لے گئیں اور مجھ سے بولیں۔ "بیٹا یہ نوکری چھوڑ دو۔"

یہ بات سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی اور مجھے اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب خود کو بیداری کی حالت میں چوکی سے بہت دور پایا، میں یہاں کس طرح پہنچا مجھے سمجھ نہیں آیا۔

لیکن جب میں واپس چوکی نمبر 130 میں آیا تو میتھیو، ڈیوڈ سمیت پالتو بھیڑیا کو مردہ پایا، کسی نے تینوں کو بے دردی سے چیر پھاڑ ڈالا تھا۔

ان کی موت کے ساتھ ہی میں نے بھی نوکری چھوڑ دی اور واپس اپنے گاؤں آگیا، مجھے تو مما کی دعاؤں نے بچالیا تھا مگر اس چڑیل نے ان تینوں کو مار کر اپنی دہشت دوبارہ قائم کرلی تھی۔

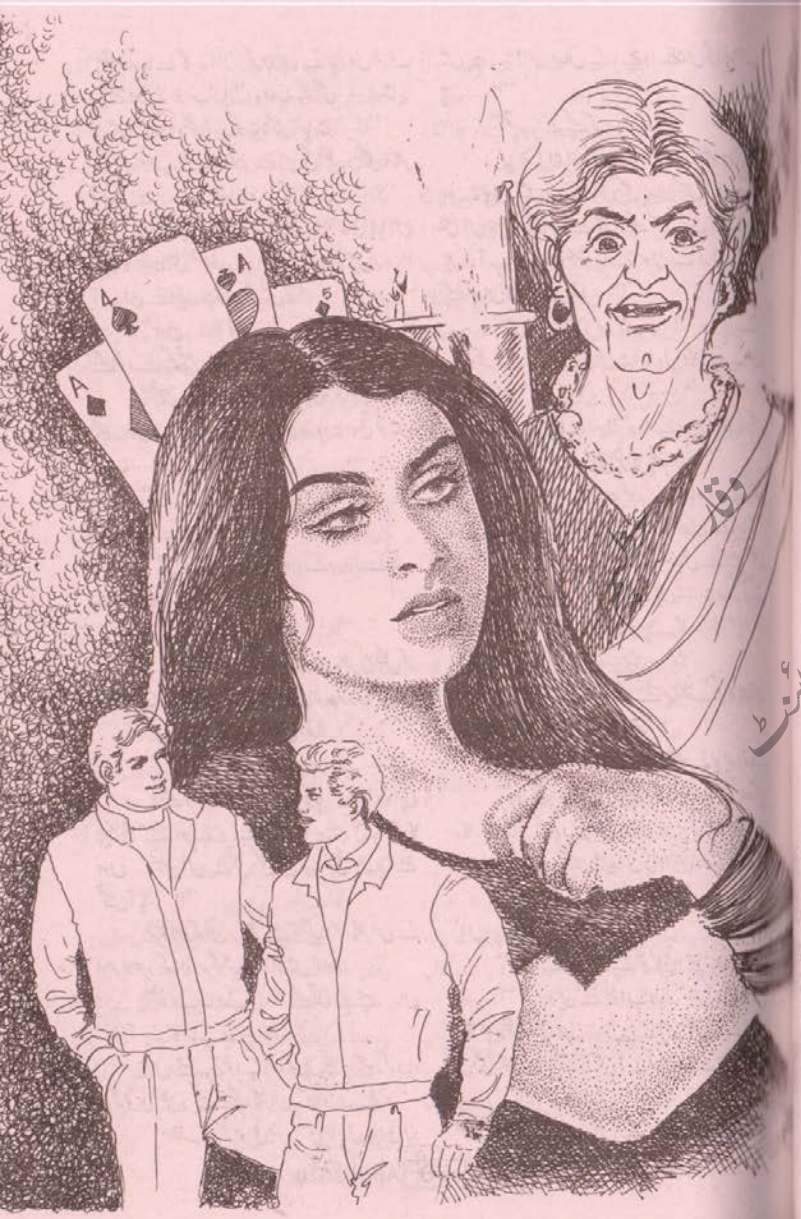

جہنمی دروازہ

راشد نذیر طاہر

قسط نمبر:2

قدم قدم پر حیرت و خوف کے لمحات میں لپٹی ہوئی پراسرار داستان اس دروازے کی کہانی جو کہ عرصہ دراز سے بند تھا کیونکہ اگر وہ کھل جاتا تو..... دروازہ کیوں نہیں کھلتا تھا جس کا راز کہانی میں پنہاں ہے

رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

اس کے چہرے پر چھانے والے خوف نے نواب انور کے ساتھ ساتھ شرفو کو بھی حیرت زدہ کر رہا تھا۔

نواب صاحب کے اس چھوٹے سے جملے کا ردعمل کافی شدید تھا۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح خاموشی سے گزر گئی۔

سکتے کے سے عالم میں کھڑے ہوئے کرم دین کو ایک بار پھر نواب انور نے جھنجھوڑا۔

''کیا ہوا.....؟ تم تو ڈر گئے.....!! اب ایسا بھی کیا.....!!''

''چھوٹے سرکار.....!!'' کرم دین نے ہاتھ باندھ لئے: ''میں نہیں جانتا کہ آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی..... لیکن میں اس سلسلے میں اپنی زبان کھولنے سے قاصر ہوں۔''

''کیوں.....؟'' انہوں نے اسے گھورا: ''آخر ایسا کیا ہے.....؟''

''آپ اس موضوع کو ختم کردیں.....!!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا: ''ورنہ میری زندگی ناگزیر ہوجائے گی..... ہاں.....!!''

''تمہیں بتانا پڑے گا کرم دین.....!!'' نواب انور سنجیدہ ہوگئے: ''ہوسکتا ہے کہ میرے علم میں آنے کے بعد کوئی اچھی اور بہتر صورت سامنے آجائے.....!!''

''ابھی جو کچھ ہے، وہ بہتر ہی ہے سرکار.....!!''

کرم دین نے ایک طویل سانس لی: ''ہاں..... یہ ممکن ہے کہ اگر گڑے مردوں کو اکھاڑا گیا تو شاید کچھ اور جانیں بھی ضائع ہوجائیں.....!!''

''کیا مطلب.....؟''

''اف.....!!'' کرم دین نے اپنا سر تھام لیا ''میں آپ کو کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں.....؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا.....!!''

''تم صرف ایک کام کرو.....!!''

''وہ کیا.....؟'' کرم دین نے انہیں چونک کر دیکھا۔

''تم مجھے اس جہنمی دروازے کے بارے میں بتادو.....'' وہ پرسکون لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہے سرکار.....!!'' کرم دین نے ایک طویل سانس لے کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو اپنی زبان سے تو کچھ بتانے سے قاصر ہوں.....!! البتہ میں آپ کو ایک شخص کا پتا بتادیتا ہوں.....!! وہ یہاں تو نہیں آسکتے البتہ اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو ضرور مل سکتے ہیں.....''

''اچھا.....!! لیکن ان سے ملنے کا کیا فائدہ.....؟''

''آپ کو اس حویلی کے بارے میں بہت کچھ

معلوم ہوجائے گا......!!'' کرم دین نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: ''وہ سب کچھ بھی...... جو شاید ہم میں سے کوئی بھی آپ کو بتانا نہیں چاہتا......!!''

نواب انور نے غور سے اس کی شکل دیکھی، پھر آہستہ سے بولے: ''اچھا بتاؤ...... کون ہے وہ......؟''

''عالی بابا......!!'' اس نے کہا: ''عالی بابا اس قصبے کا بہت ہی ضعیف اور بزرگ انسان ہیں......!! آپ ان سے ایک ملاقات کرلیں۔''

''ہوں......!! نواب انور نے اسے گھورا: ''تم مجھے خود سے کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

''نہیں سرکار......!!'' وہ سر جھکا کر بولا: ''میں مجبور ہوں...... کاش میری زبان کی حدود نہ ہوتی تو میں بتا دیتا......!!''

''خیر......!! وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے: ''عالی بابا سے کہاں ملاقات ہوگی؟''

''میں آپ کو ان کے گھر کے دروازے تک پہنچادوں گا......!!''

''ٹھیک ہے...... اب تم جاؤ......!!''

یہ سنتے ہی کرم دین وہاں سے اس طرح نکل کر بھاگا، جیسے اب تک اسے کسی زنجیر سے باندھ کر رکھا گیا ہو۔

اس کے جاتے ہی شرفو بول اٹھا:

''یہ کیا گورکھ دھندا ہے نواب صاحب......؟''

''مجھے تو خود کچھ سمجھ نہیں آرہا......!!'' وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولے: ''میں تو یہاں کئی بار آچکا ہوں...... لیکن اس سے قبل کبھی بھی ایسا کوئی معمہ سامنے نہیں آیا......!!''

شرفو اٹھ کر ان کے قریب آگیا...... پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور سرگوشیانہ انداز میں بولا:

''نواب صاحب......!! مجھے لگتا ہے جیسے یہاں کسی آسیب کا سایہ ہے......!!''

اس جملے نے نواب انور کو چونکنے پر مجبور کردیا، وہ شرفو کی شکل دیکھنے لگے، پھر ان کے ہونٹ ہلے:

''مطلب یہ کہ حویلی ضرور کسی اوپری ہوا کی زد میں ہے......!! اور یہاں کے رہنے والے اس کی زد میں ہیں......!!''

''تم یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟''

''یہ میرا اندازہ ہے......!!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا: ''میں اس سے قبل کبھی یہاں نہیں آیا، اور نہ ہی اس حویلی کے بارے میں مجھے کسی قسم کی معلومات ہیں۔ آپ ہی زیادہ بہتر جانتے ہوں گے کہ اس سے پہلے یہاں کا کیا ماحول تھا......!!''

''میں نے کبھی غور نہیں......!!'' وہ بولے: ''کیونکہ میں نے کبھی یہاں نہ اپنا دل لگایا اور نہ ہی زمین......!!''

''ارے مالک......!!'' وہ اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولا: ''دونوں میں سے کوئی چیز تو لگا لیتے......!!''

نواب انور نے اسے گھور کر دیکھا، بولے کچھ نہیں تھے......!! پھر جماہی لیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''اب نیند آرہی ہے......!! میرا خیال ہے کہ تم بھی اسی کمرے میں سوجاؤ...... کل دیکھتے ہیں...... نہ جانے یہ عالی بابا کون ہیں...... ان سے ملنا ہی پڑے گا......!!''

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح ان کے لئے پرتکلف قسم کا ناشتہ لے کر آنے والا بھی کرم دین ہی تھا:

''تمہارا ساتھی کہاں ہے......؟'' شرفو نے پوچھا تھا۔

''وہ صبح ہی صبح اپنے گاؤں روانہ ہوگیا سرکار......!!'' کرم دین نے ناشتہ میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا: ''تین روز میں شاید اس کی واپسی ہوجائے۔''

''ہوں......!!'' نواب انور نے ہنکارا بھرا: ''اس اچانک روانگی کا مقصد......؟''

''اس کے منجھلے لڑکے کو کافی تیز بخار ہورہا تھا......!!'' کرم دین نے جواب دیا۔ ''اس لئے وہ پو پھٹتے ہی نکل کھڑا ہوا...... اس نے اس عجلت کے عالم میں بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کو اس بات سے آگاہ کردوں......!!''

''کیا واقعی...... اس کے بچے کی طبیعت خراب تھی؟'' شرفو نے اسے گھورا۔ ''جی ہاں......!! کیوں......؟'' کرم دین چونکا۔

''کہیں وہ جہنمی دروازے کی وجہ سے تو چلا نہیں گیا؟'' شرفو نے بہ غور اس کی طرف دیکھا۔

اگلا لمحہ حیرت انگیز تھا، کرم دین بری طرح چونکا تھا، لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا اور بولا۔

''نہ جی...... ایسا ہرگز نہیں ہے...... اگر آپ لوگوں کو یقین نہ ہو تو اس کے گاؤں جا کر پوچھ سکتے ہیں...... مٹھل نام ہے اس کے گاؤں کا...... اور وہ یہاں سے چار کوس دور ہے......!!''

''یہ مذاق کررہا ہے کرم دین......!!'' نواب انور نے جلدی سے دخل دیا تھا: ''اس کی عمارت ہے......''

کرم دین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اب وہاں سے نکل بھاگنے کے چکر میں ہے۔

نواب انور نے ناشتہ اپنی طرف سرکاتے ہوئے پوچھا:

''تو تم جہنمی دروازے کے بارے میں مجھے آگاہ نہیں کرو گے......؟''

کرم دین کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوگئے۔

''خدا کے لئے سرکار......!! میری جان بخش دیں......!!''

''مطلب کہ میری جان چھوڑ دیں......!!'' شرفو بول اٹھا: ''صاف صاف کہو......!!''

''میں تو ملازم آدمی ہوں......!!'' وہ بولا۔ ''اس حویلی کا نمک برسوں سے کھا رہا ہوں...... اور وہ بھی نواب صاحب کی مہربانی ہے، ورنہ اب سے پہلے اس حویلی میں تھا کون......؟ سب ہی تو دنیا سے نکال دیئے گئے......!!''

''نکال دیئے گئے......!! کیا مطلب......؟'' یہ شرفو تھا۔

کرم دین نے طویل سانس بھر کر اسے دیکھا اور بولا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... عالی بابا ہی اس معاملے پر روشنی ڈالیں گے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' نواب انور آہستہ سے بولے: ''میں ناشتہ کرنے کے بعد اسی طرف جاؤں گا......!!''

''میں راستے کی راہنمائی میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' کرم دین خلوص سے بولا: ''میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو حقیقت کا علم ہوجائے!!''

''ٹھیک ہے......!!'' نواب انور نے سر ہلایا۔

''میں ابھی حاضر ہوتا ہوں سرکار......!!'' کرم دین سر کو خم کرکے وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔

اس کے جاتے ہی نواب انور نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں رات کو حویلی کا معائنہ کروں گا......!! ہاں......!! میں اس جہنمی دروازے کو اپنے طور پر تلاش کرتا ہوں......!!''

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد ہی کرم دین انہیں باہر لے آیا، وہ کافی اچھا ڈرائیور بھی تھا۔

جلد ہی نواب انور کے لئے ایک کار وہاں تیار کھڑی تھی، شرفو بھی اس سفر میں ان کے ساتھ تھا......!!

کرم دین خاموشی سے کار کو حرکت میں لے آیا، جلد ہی وہ قصبے کی سڑکوں پر رواں دواں تھے......!!''

بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد کار ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں داخل ہوگئی۔

نواب انور نے پوچھا۔

''میں قصبے میں کبھی اتنا گھوما پھرا نہیں ہوں...... یہ کون سا علاقہ ہے؟''

''سرکار...... یہ اورنگ آباد کا علاقہ ہے......!! یہ زیب مارکیٹ کہلاتی ہے۔''

''اورنگ آباد......'' وہ بڑبڑائے: ''زیب مارکیٹ......!! یہ نام تو کچھ سنے سنے سے لگ رہے ہیں......!!''

''یہ قصبے کی سب سے بارونق اور مشہور مارکیٹ ہے۔'' کرم دین نے بتایا۔ ''عالی بابا اسی علاقے میں رہتے ہیں.....!!''

''اوہ..... اچھا.....!!'' نواب انور کے منہ سے نکلا۔

ذہن پر زور دینے کے باوجود انہیں یاد نہ آسکا کہ یہ نام انہوں نے کب اور کہاں سنے تھے.....!!

جلد ہی کار ایک گلی میں داخل ہو کر ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئی۔ اس کے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا.....!!

کرم دین نے وہیں گاڑی روک دی اور گھوم کر نواب انور سے بولا:

''یہ آستانہ نما گھر عالی بابا کا ہے.....!! آپ دروازے پر پہنچ کر انہیں آواز دیں..... میں تھوڑی دیر بعد آپ کو لینے آجاؤں گا۔''

''ارے..... تم بھی ساتھ چلو.....!!'' شرفو بول اٹھا: ''تم کہاں بھاگ رہے ہو.....!!''

کرم دین نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولا:

''ہم لوگ اگر بھاگنے والے ہوتے، تو آج آپ لوگوں کو حویلی خالی ملتی..... جب عالی بابا آپ کو حالات سے آگاہ کریں گے تو بس اس وقت میری یہ بات آپ کے سامنے اجاگر ہو جائے گی.....''

''اچھا..... تمہاری باتوں کو بھی آزما لیتے ہیں.....!!''

دونوں کار سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ کرم دین نے کار کو آگے بڑھا دیا۔

شرفو نے اس کی طرف گھوم کر دیکھا اور بڑبڑایا۔

''یہ بھی عجیب ہی بندہ ہے.....!! اور اس کا گرو دلا ور بھی اس سے دو ہاتھ آگے جانا پڑتا ہے.....!!''

''نواب انور نے کوئی جواب نہیں دیا..... کافی بلند آواز میں پکارنے کے بعد قدموں کی چاپ ابھری اور دروازہ ایک جانب سرک گیا۔

دوسرا لمحہ حیرت انگیز تھا، کیونکہ پردہ ہٹتے ہی ایک ایسا چہرہ دکھائی دیا تھا جس سے نواب انور کم وقت میں ہی زیادہ واقف ہو چکے تھے۔ پھر ان کے منہ سے نکلا:

''ارے..... ارسلان بیگ صاحب..... آپ.....؟''

☆.....☆.....☆

ہاں..... یہ وہی بڑے میاں تھے، جو ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں ان کے ساتھ تھے، لیکن پھر ایک خاص قسم کے حادثے نے انہیں کمپارٹمنٹ سے جدا کر دیا تھا.....!!

اب انہیں یاد آیا کہ یہ علاقہ انہیں جانا پہچانا اور سنا سنایا سا کیوں لگ رہا تھا..... کمپارٹمنٹ میں انہوں نے ارسلان بیگ کی جیب سے کارڈ نکال کر یہی پتا درج دیکھا تھا.....!!

ارسلان بیگ انہیں دیکھ کر پلکیں جھپکا رہے تھے، پھر وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولے۔

''میرا خیال ہے کہ ہم کہیں مل چکے ہیں.....؟''

''بالکل.....!! ٹرین کے سفر میں ملاقات ہوئی تھی۔''

''آپ کی چوٹ کیسی ہے.....؟''

ان کے ماتھے پر اب بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

بے ساختہ ارسلان بیگ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور بولے: ''ہاں..... اب تو بہتر ہے..... تم لوگ اندر آجاؤ..... آؤ.....!!''

اور پھر جلد ہی وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں موجود تھے..... جس میں دری بچھی ہوئی تھی اور ایک کونے میں لکڑی کی چھوٹی سی چوکی موجود تھی۔ جس پر کچھ کاغذات اور دوائیں رکھی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

اسی چوکی کے دوسری جانب نرم سی گدی رکھی ہوئی تھی..... شاید ارسلان بیگ اس پر نشست جماتے تھے.....!!

اور پھر وہ اس گدی پر جا بیٹھے..... انہوں نے اپنے سامنے نواب انور اور شرفو کو بٹھا لیا۔

''اب بتاؤ..... کیسے آنا ہوا.....؟''

''میرا نام نواب انور ہے.....!!'' وہ بولے:

''میں حویلی میں رہائش کے لئے آیا ہوں..... اور اب اس کا آخری سپوت ہوں..... میں جن کی اولاد تھا، وہ لوگ تو دنیا سے گزر گئے..... اور اب جو میری اولاد ہے، وہ شاید اس حویلی میں نہ رہ سکے.....!!

''اوہ..... انور میاں.....!!'' ارسلان بیگ عرف عالی بابا چونکے: ''تمہارا نام تو بہت سنا تھا، آج ملاقات بھی ہو گئی.....!! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں.....!!''

''ضرور.....!!''

''حویلی میں کیوں آئے ہو.....؟''

''میں سمجھا نہیں.....!!''

''میں اب اپنی بقیہ زندگی اسی حویلی میں گزارنا چاہتا ہوں.....!!''

اور اگر میں یہ کہوں کہ تم واپس لوٹ جاؤ.....

تو.....؟؟'' عالی بابا کا انداز عجیب سا تھا۔

''میں وجہ جاننا چاہوں گا.....!!'' نواب انور بولے۔

''ٹھیک ہے..... میں بتا دیتا ہوں.....!!'' عالی بابا نے ایک طویل سانس لے کر کہا: ''لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ پھر یہاں نہیں رکو گے.....!!''

''لیکن کیوں.....؟'' نواب انور نے حیرت سے پوچھا: ''آخر ایسا کیا ہے؟''

''یہ ایک طویل کہانی ہے میرے بچے.....!!'' عالی بابا کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی چھلک آئی: ''جس میں ایسے کئی موڑ ہیں، جو ناقابلِ بیان بھی ہیں اور ناقابلِ یقین بھی..... ہاں.....!!''

نواب انور بے چین سے ہو گئے اور پہلو بدل کر بولے:

''آپ مجھے سب کچھ بتا دیں..... کیونکہ میں حویلی میں بھی کافی عجیب سا ماحول دیکھ رہا ہوں.....!! کیا آپ دلاور اور کرم دین سے واقف ہیں؟''

''ہاں.....!! جیسے خود سے آشنا ہوں، اس طرح.....!!'' جواب ملا۔

''اوہ.....!! وہ دونوں بھی کچھ لایعنی سی باتیں کر رہے ہیں.....!! جو میری سمجھ سے بالاتر ہیں.....!!''

''انہوں نے ضرور جہنمی دروازے کا ذکر کیا ہوگا.....!!''

''آپ نے درست فرمایا.....!!''

''وہ حقیقت میں جہنمی دروازہ ہے.....!!'' عالی بابا کا لہجہ پراسرار سا ہو گیا: ''اگر تم حویلی میں رہ رہے ہو، تو پھر اس دروازے کی طرف جانے سے باز رہو.....!!''

''کیا دروازہ.....؟ کون سا دروازہ.....!!''

''کیا تم جانتے ہو کہ حویلی میں ایک تہہ خانہ بھی موجود ہے.....!'' عالی بابا نے اچانک پوچھا۔

''تہہ خانہ.....؟'' نواب انور نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔

''ہاں.....!! اس تہہ خانے کا دروازہ ہی جہنمی دروازہ کہلاتا ہے۔''

''اب میری بے چینی عروج پر ہے۔'' نواب انور نے اپنے ہاتھوں کو مضطربانہ انداز میں مسلا: ''برائے مہربانی مجھے اس داستان سے آگاہ کر دیں۔''

''ضرور.....!!'' انہوں نے سر ہلایا: ''میں مختصراً تمہیں بتا رہا ہوں..... تم ایک طویل عرصے سے حویلی اور اس کے مکینوں سے دور ہو..... شاید یہی وجہ ہے کہ ان پر اس دوران جو مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے تھے، تم ان سے لاعلم ہو.....!!''

''مصیبتوں کے پہاڑ.....؟'' نواب انور حیرت سے بولے۔

''ہاں بیٹا.....!!'' عالی بابا کے لہجے میں تاسف تھا: ''بس یوں سمجھ لو کہ حویلی میں ایک بلا تھی، جو ایک طویل عرصے سے وہاں منڈلا رہی تھی.....!! یہاں تک کہ اس خون خوار عفریت نے حویلی کے تمام لوگوں کو موت کی گہری نیند سلا دیا..... ہاں بیٹا.....!!''

''یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟'' نواب انور کے منہ سے نکلا۔

شرفو بھی ہونقوں کی طرح عالی بابا کی شکل دیکھ رہا

تھا......!!''ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں......!! تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی بچت صرف اس بنیاد پر ہوئی کہ تم لوگ اس بلا کی پہنچ سے اور اس کی حد سے دور رہے......!! ورنہ شاید...... تمہارا بھی وہی انجام ہوتا، جو تمہارے ماں باپ اور دیگر بہن بھائیوں کا ہوا تھا......!!''

''ہوں......!!'' نواب انور نے ہنکارا بھرا: ''تو اب وہ بلا کہاں ہے؟''

عالی بابا نے چند لمحے توقف کیا اور پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولے:

''اسے میرے مرشد نے تہہ خانے میں قید کردیا ہے...... جہنمی دروازہ اسی حویلی کے تہہ خانے کا نام ہے...... اب وہ عفریت اسی میں قید ہے......!!''

☆......☆......☆

موت کا سا سناٹا اس چھوٹے سے کمرے میں طاری تھا، نواب انور، شرفو اور عالی بابا تینوں ہی اب خاموش ہوکر اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

کافی دیر بعد اس سکوت کو نواب انور نے اپنے الفاظوں سے توڑتے ہوئے عالی بابا کو مخاطب کیا:

''وہ عفریت آخر ہے کیا......؟ کون ہے......؟ کہاں سے نمودار ہوا......؟''

''میں کل حویلی میں آؤں گا......!!'' عالی بابا نے جیسے ان کے سوالوں کو نظر انداز کردیا: ''اب باقی تفصیل وہیں پر بیان کروں گا......!! بس تم ایک بات کا دھیان رکھنا......!!''

''جی...... بولیں......؟''

''جہنمی دروازہ مت کھولنا......!!'' عالی بابا کے لہجے میں التجا تھی، خوف تھا...... ''کیونکہ میرے مرشد نے اسے جان جوکھوں میں ڈال کر اس تہہ خانے میں قید کیا تھا......!!! اب اگر وہ بلا پھر سے باہر نکل آئی تو...... اب اور کوئی نہیں ہے، جو اس سے ٹکر لے سکے...... کیونکہ میرے مرشد بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے......!!''

☆......☆......☆

سیما نے جھٹ سے ہاتھ آگے بڑھایا اور نادر کے ہاتھوں سے کتاب چھین لی۔

نادر مطالعے میں بری طرح غرق ہونے کی وجہ سے اس اچانک ہی افتاد پر وہ چونک اٹھا۔

پھر وہ قدرے جھنجھلا کر بولا:

''یہ کیا حرکت ہے......؟''

''میں بور ہو رہی ہوں اور آپ کتاب کے کیڑے بنے ہوئے ہیں......!! بس اب میں آپ کو پڑھنے نہیں دوں گی......!!'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''ارے اینڈ چل رہا ہے...... لاؤ......!!'' نادر نے ہاتھ آگے بڑھایا: ''بس میں دس منٹ میں اس کتاب سے فارغ ہونے والا ہوں......!!''

''نہیں...... بس اب آپ اسے آفس میں لے جاکر پڑھیے گا......!!''

''افوہ......!!'' نادر جھنجلا اٹھا: ''تم بھی حد کرتی ہو......!! اچھا بابا اب نہیں پڑھ رہا...... لاؤ میں صفحے پر نشانی لگادوں......!!''

''میں خود لگادیتی ہوں......!!''

''یہ کہہ کر سیما نے صفحہ موڑا اور کتاب کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا، پھر وہ مسکراتے ہوئے نادر کی طرف گھومی اور بولی:

''اب آپ مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں......!!''

''مذاق اڑا رہی ہو......؟''

''نہیں بابا......!!'' سیما نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔

''اس گھر میں ہے کون......!! ابو جان اور شرفو کے جانے کے بعد سے تو مجھے یہ گھر کھانے کو دوڑ رہا ہے......!! اب وہ لوگ نہ جانے کب لوٹیں گے......!!''

''شرفو تو انہیں چھوڑنے گیا تھا...... اسے تو اب تک آجانا چاہئے......!!'' نادر کے لہجے میں تشویش تھی......!!

یہ سن کر سیما ہنسی اور بولی:

''لگتا ہے کہ اسے بھی قصبے کی ہوا لگ گئی ہے......!!''

''ہاں...... ممکن ہے...... خیر...... میں فون کرتا ہوں......!!'' نادر کچھ سوچ کر بولا: ''شرفو سے پوچھوں گا کہ وہ کب روانہ ہوگا......!!''

''ارے آجائے گا خود ہی......!!'' سیما بولی۔ ''اس گھر کی رونق اور چہل پہل کے لئے شرفو ہی لازمی نہیں...... اگر ہمارے ہاں اولاد ہوتی تو پھر مجھے کسی قسم کی بھی کوئی کمی محسوس نہ ہوتی......!!''

نادر نے ایک طویل سانس لی اور آہستہ سے بولا:

''اب اس سلسلے میں توجہ کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے......!! جب نصیب میں لکھا ہوگا، ہوجائے گا......!!''

''کبھی کبھی نصیب بنانا بھی پڑتا ہے نادر......!!'' سیما اس کی طرف غور سے دیکھ کر بولی۔

''کیا مطلب......؟''

''ہماری شادی کو اب تیسرا سال لگ چکا ہے......!! لیکن میری گود خالی ہے......!! کیا میں اسی حالت میں رہوں گی......؟ کیا میرے دامن میں ہمیشہ ویرانی رہے گی......؟''

''مایوسی کی باتیں کیوں کررہی ہو؟'' نادر جلدی سے بولا: ''یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔''

''میں کیا کروں......!!'' سیما غمزدہ انداز میں بولی: ''جب میں باہر نکلتی ہوں اور دوسری عورتوں کے کندھوں پر لدے ہوئے بچے دیکھتی ہوں تو میرے دل پر چھریاں سی چلنے لگتی ہیں...... آہ......!! میں آخر کیا کروں......!!''

''سوائے صبر کے اور کیا ہوسکتا ہے......!!'' نادر نے ایک طویل سانس لی: ''ہم دونوں بس یہی کرسکتے ہیں......!!''

''کوشش بھی تو کی جاسکتی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کوشش......!! مطلب......؟'' نادر چونکا۔

''میں نے آپ کو امی کی کہی ہوئی ایک بات......''

''بس رہنے دو......!! نادر نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیا بات کرنے والی ہو......!!''

سیما نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا، نادر نے دوسری طرف کروٹ بدلی اور پھر جلد ہی اس کے خراٹوں سے کمرہ گونجنے لگا تھا۔

سیما کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھی رہی، پھر اس نے ایک نگاہ نادر پر ڈالی اور اٹھ کر کمرے سے دبے پاؤں باہر نکل آئی۔

اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا، جہاں نیم اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

سیما نے اندازے سے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک بٹن دبادیا۔ کمرہ اب روشن ہوچکا تھا۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور سائیڈ میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھالیا۔ جلد ہی وہ کمرے سے باہر محتاط انداز میں جھانکتے ہوئے کسی کے نمبر ڈائل کررہی تھی۔

دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ سیما کو کافی انتظار کرنا پڑا، اور پھر ایک بھرائی ہوئی سی نسوانی آواز ابھری۔

''ہیلو......!! کون......؟''

''امی...... میں سیما بول رہی ہوں......!!''

''ہاں سیما بیٹی...... بولو......!!''

''کیا آپ سو رہی تھیں......؟''

''نہیں...... بس لیٹی ہوئی تھی......!!'' جواب ملا: ''تم بتاؤ...... سب خیریت ہے نا......! کیا نادر سے پھر جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''تو پھر...... کیا ہوا؟''

''کل آپ گھر آنا......!!'' وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں......!!'' بہت ضروری کام ہے......!!''

☆......☆......☆

علی بابا کے گھر سے واپسی ہوئی تو کئی طرح کے

سوالات ان کے ذہن میں گردش کررہے تھے......!!

کرم دین گھر کے باہر ہی گاڑی میں ان کا منتظر تھا، نہ جانے وہ کب واپس لوٹا تھا۔

شرفو نے آگے بڑھ کر نواب انور کے لئے دروازہ کھولا اور ان کے بیٹھنے کے بعد خود کرم دین کے برابر والی نشست پر براجمان ہوگیا۔

کرم دین کچھ کہنے کے لئے مضطرب تھا، وہ کن انکھیوں سے بیک مرر میں نواب انور کی طرف دیکھتے ہوئے کار کو آہستہ روی سے آگے بڑھانے لگا۔

نواب انور کسی سوچ میں گم تھے، پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولے۔ ''کرم دین......!! کیا یہ حقیقت ہے کہ حویلی میں کچھ غیر معمولی واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں......؟''

''جی......'' وہ چونکا۔ پھر جلدی سے بولا: ''جی ہاں......اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔''

''کیا تم اس دوران وہیں تھے......؟''

''جی...... بالکل......!!'' وہ بولا: ''سب کچھ میری ان آنکھوں کا دیکھا بھالا ہے......!!''

''کیا تم اب بھی کچھ بتانے سے گریز کروگے؟''

کرم دین خاموش رہا......نواب انور غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایسے میں شرفو بول اٹھا۔

''ارے بھائی......!! کیا تم دلاور سے ڈرتے ہو؟''

''نہیں......!!''

''تو پھر......؟ اس کے علاوہ کون سی ایسی وجہ ہے کہ جس کی بناء پر تم اپنی زبان کو تالا لگائے بیٹھے ہو......!!''

''وجہ بس یہی ہے کہ ان باتوں کو سننے کے بعد نواب صاحب پریشان ہوجائیں گے، جبکہ دلاور یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ لوگ پریشان ہوجائیں......!!''

''لیکن لاعلمی بھی مجھے کافی پریشان کررہی ہے......!!'' نواب صاحب نے جواب دیا۔

کرم دین نے کوئی جواب نہیں دیا، جلد ہی وہ لوگ حویلی پہنچ گئے۔

کرم دین نے کمرے کے دروازے تک ان کا ساتھ دیا اور نواب انور سے مخاطب ہوکر بولا:

''کھانے کا وقت ہونے والا ہے...... میں آپ کے لئے مرغابی کا گوشت بنواتا ہوں......!! اس کا بھنا ہوا گوشت یقیناً آپ کو لذیذ محسوس ہوگا۔''

پھر وہ چلا گیا تھا۔ کمرے میں آنے کے بعد نواب انور نے شرفو کے کان میں سرگوشی کی:

''آج رات...... جہنمی دروازے کو دیکھنا ہے......!!''

☆......☆......☆

شرفو نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا:

''جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں......!!''

''بولو......!!'' نواب انور نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کل عالی بابا یہاں آئیں گے......میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کا انتظار کرنا چاہئے......!!''

''کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''

''نہیں بڑے سرکار......!!'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں کیوں ڈروں گا......!! بس بات یہ ہے کہ جب ہمیں ساری تفصیل معلوم ہوجائے گی اور حقیقت کا علم ہوجائے گا تو ہر قسم کا راستہ ڈھونڈنے میں آسانی ہوجائے گی......!! نہ جانے کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ......!!''

''ویسے تمہارا کیا خیال ہے......!! یہ سب کیا ہے؟''

''ان دونوں کی باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ حویلی میں کوئی زبردست قسم کی گڑبڑ ہے......!! ممکن ہے کہ کچھ ایسا ہی معاملہ ہو......!!''

''خیر......!! اب تم کہتے ہو تو کل تک انتظار کرلیتے ہیں......!! ویسے میرا خیال ہے کہ میں نے اتنے عرصے اس حویلی سے دور رہ کر اچھا نہیں کیا......!!''

''تو کیا واقعی آپ کے سامنے کسی قسم کا کوئی حادثہ یا پھر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا؟''

''میں حویلی میں رہا کب تھا......!! نوعمری میں ہی نکل کھڑا ہوا......!! اس کے بعد میں جب بھی یہاں آیا، کسی نہ کسی کی لاش میری منتظر ہوتی تھی۔''

''میں سمجھا نہیں......!!''

''میں صرف ان لوگوں کے جنازوں میں شریک ہوسکا، جو میرا خون تھے...... میرے گھر کے قریبی رشتے دار تھے......!! میں نے اپنے دادا، پھر ماں باپ اور پھر اس کے بعد اپنے بہن بھائیوں کو یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا ہے......آہ......!! میں ان سے ان کی زندگی میں کبھی امنگ سے نہ مل سکا......!!......آہ......!!''

''اس بات کا آپ کو دکھ تو ہوگا......!!''

''دکھ بھی اور پچھتاوا بھی......!!'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ پھر انہوں نے چونک کر کہا: ''میں نے تم سے کچھ کہا تھا......؟''

''جی...... کہا تھا......!!''

''میں جہنمی دروازہ دیکھنا چاہتا ہوں......!!'' وہ بولے: ''نہ جانے کیوں مجھ سے اب کل تک کا انتظار نہیں ہو رہا......!!''

''چلیں پھر......!! باہر نکلتے ہیں۔'' شرفو واقعی اٹھ کھڑا ہوا: ''اگر اب میں نے آپ کو روکا تو واقعی بزدلی مجھ پر ثبت ہوجائے گی......!!''

نواب انور اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے۔ پھر وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''میرا خیال ہے کہ سب لوگ سو چکے ہیں......!!''

''جی ہاں......سناٹا تو یہی کہہ رہا ہے۔''

''اوہ...... تم تو ماحول کی زبان بھی سمجھتے ہو......!!''

شرفو کچھ نہ بولا، واقعی چاروں طرف نیم تاریکی اور گہرے سناٹے کا راج تھا......!!!

''کدھر کا رخ کریں......؟''

نواب انور نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جہاں آپ کا دل کہے......!!''

''ہوں...... آؤ...... ذرا پہلے کھلے حصے کا چکر لگائیں......!!''

اور پھر وہ حویلی کے کھلے اور کشادہ حصے میں آگئے...... جہاں ایک کونے میں باغیچہ تھا۔ جس میں کئی طرح کے پھول پودے اور سایہ دار درخت سرسرا رہے تھے......!!

ہوا کے دوش پر ان کی شاخوں کو دیکھ کر یوں گمان ہو رہا تھا جیسے وہ سرور اور مستی سے مخمور ہوکر رقص کررہے ہوں، ان کے جھومنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا۔

اس باغیچے کے دوسری جانب کھلے ہوئے حصے میں وہ قدیم کنواں بھی موجود تھا، جو کہ اس حویلی کی روایت میں شامل تھا۔

برس ہا برس گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ کنواں سوکھ جانے کے بعد بھی ایک خاص قسم کی اہمیت کا حامل تھا......!! شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کنواں بھی اسی حویلی کے وجود میں شامل تھا......!!!

کنوئیں کے نزدیک پہنچ کر شرفو نے ساتھ میں لائی ہوئی ٹارچ کو روشن کردیا......!!

وہ کافی دلچسپی سے کنوئیں کا جائزہ لے رہا تھا...... یہ اس قدر گہرا تھا کہ ٹارچ کی روشنی تہہ تک پہنچنے میں ناکام تھی۔

''بڑے سرکار......!! کنواں تو کافی گہرا معلوم ہوتا ہے......!!''

''ہاں شرفو......!! بہت گہرا ہے......!! سمندر کی طرح......!!''

کچھ دیر وہیں کھڑے رہنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے ہٹے ہی تھے کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کنوئیں میں سے کسی قسم کی آواز ابھری ہو۔

وہ چونک اٹھے اور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے......!! آواز ایک بار پھر ابھری۔

''یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی چوپائے قسم کا کوئی جانور ڈکرایا ہو۔

☆......☆......☆

نادر اس وقت گھر میں نہیں تھا، جب سیما کی والدہ آئی تھیں۔

شکل وصورت میں وہ کافی حد تک سیما سے مماثل تھیں، بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ سیما اپنی ماں کی ہو بہو ہم شکل تھی۔

گورا چٹا جسم اور عمر کے اس حصے میں بھی اب تک وہ چاق وچوبند تھیں.....!! ان کا نام کوثر جہاں تھا۔

سیما انہیں اپنے کمرے میں بٹھا کر جلدی سے چائے بنانے چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو کوثر جہاں کو دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کی طرف متوجہ دیکھا۔

یہ کئی طرح کے فریم تھے، نادر کو تصویریں آویزاں کرنے کا بہت شوق تھا..... چنانچہ جہاں ددو خوب صورت قدرتی مناظر کی سینریاں لگی ہوئی تھیں، اسی کے قریب چند اور بھی تصویریں آویزاں تھیں۔

جن میں نادر کے دادا مرحوم کے ساتھ ساتھ نواب انور کی جواں سال اور مسکراہٹ سے بھرپور تصویر موجود تھی۔

''اسی جان.....!!'' سیما نے انہیں محو دیکھ کر آواز لگائی۔

''آں.....!!'' وہ چونک کر مڑیں۔

پھر جلدی سے بولیں۔

''نادر میاں گھر میں نہیں ہیں؟''

''جی نہیں۔'' اس نے جواب دیا: ''اسی لئے تو میں نے آپ کو بلایا ہے، تاکہ آرام سے بات کرسکوں۔''

''مسئلہ کیا ہے؟''

''بات تو کافی پرانی ہے.....!!'' سیما نے اداس انداز میں مسکراتے ہوئے کہا: ''اور اب میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا چاہتی ہوں۔''

''کیا نواب صاحب کے جانے کے بعد تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' کوثر جہاں کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ارے نہیں.....!!'' وہ ہنسی: ''نادر تو اپنی نوکری میں اس حد تک مصروف رہتے ہیں کہ انہیں تو ڈھنگ سے بات کرنے کی ہی فرصت نہیں ہوتی، وہ مجھ سے کیا خاک لڑیں گے.....!!''

''تو پھر.....!!''

''بات دراصل یہ ہے امی جان کہ مجھے اب اپنی تنہائی اور اکیلے پن سے بیزاری ہونے لگی ہے۔'' وہ چائے ان کی طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔ ''اگر ہمارے ہاں اولاد ہو جاتی تو مجھے نہ اپنی فکر رہتی اور نہ ہی وقت کی..... جو کہ اب کاٹنے کو دوڑتا ہے.....!!''

''ہاں..... یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولیں۔ ''لیکن اب کیا کریں..... ساری بات مقدر کی ہے.....!!'' جو کچھ نصیب میں ہوگا، وہی ملے گا.....!! لیکن اپنے وقت پر.....!!''

''کیا ہم کوشش نہیں کرسکتے.....؟''

''کوشش..... مطلب.....!!'' وہ چونکیں۔

سیما نے کچھ دیر سوچا، پھر ایک طویل سانس لے کر بولی:

''میرے پاس ایک عورت آئی تھی۔ وہ اکثر ہی مجھ سے ملنے آجاتی ہے۔ دراصل اس کا تعلق نواب انور اور نادر کے آبائی قصبے سے ہے..... شہر میں اس عورت کے بھائی وغیرہ رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ جب بھی شہر میں آتی ہے تو مجھ سے ضرور ملتی ہے..... اس نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے گھر میں اولاد ہو سکتی ہے.....!!''

''کیا مطلب.....؟'' کوثر جہاں کے چہرے پر حیرت طاری ہوگئی۔

''مطلب یہ کہ مجھے کسی عامل کے پاس جانا ہوگا.....!! سیما بولی۔

''وہ اس عورت کے واقف کار ہیں.....!! وہ بتا رہی تھی کہ ان بابا کے پاس بہت زبردست علم ہے..... اگر مجھ میں کوئی کمی یا کوئی مسئلہ ہوگا تو ان کی عملیات سے سب کچھ ہو جائے گا اور میں ماں بن جاؤں گی۔''

''کیا کہہ رہی ہو.....؟'' وہ بولیں: ''یہ کس

طرح ممکن ہے؟''

''مجھے نہیں پتا.....!!'' سیما نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے: ''لیکن مجھے اس عورت کے لہجے میں سچائی کی جھلک دکھائی دی تھی.....!!''

''لیکن وہ ہے کون.....'' کوثر جہاں الجھ کر بولیں: ''کہاں رہتی ہے؟ اور تمہیں کس کے پاس لے جائے گی.....؟''

''اس کا نام وحیدہ ہے۔'' سیما نے بتایا: ''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ قصبے میں ہی رہتی ہے..... بات دراصل یہ ہے کہ میں ہر حال میں اس کے ساتھ بابا جی کے پاس جانا چاہتی ہوں.....!! اور میں نے ایک کام اور بھی کر دیا ہے.....!!''

''وہ کیا.....؟''

''میں وحیدہ آنٹی کے ساتھ جاؤں گی، لیکن میں نے آپ کا حوالہ نادر کو دیا ہے.....!! تاکہ اگر یہ بات ان کے علم میں آجائے تو آپ میرے لئے ڈھال بن جائیں..... میں تو نادر کے ساتھ ہی جاتی لیکن وہ ان سب چیزوں کے قائل ہی نہیں ہیں.....!!''

''اوہ..... یعنی تم اب نادر سے مجھ کو لیکچر سنوانے کے موڈ میں ہو.....!!''

''میں آپ کی بیٹی ہوں۔'' سیما سنجیدہ ہوگئی۔ ''اب آپ ہی میری خاطر کچھ کرسکتی ہیں.....!!''

یہ سن کر کوثر جہاں خاموش ہوگئیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد انہوں نے آہستہ سے کہا:

''ٹھیک ہے..... لیکن ذرا دھیان اور ہوشیاری سے کوئی قدم اٹھانا، تم جانتی ہو کہ آج کل زمانہ کس رخ پر جا رہا ہے.....!!''

''اس کی آپ فکر مت کریں۔'' سیما گردن اکڑا کر بولی: ''میں کوئی لڑکی نہیں ہوں، ایک مرد کی بیوی ہوں.....!! میں تو صرف اپنے مقصد کی کامیابی چاہتی ہوں.....!!''

کوثر جہاں نے اثبات میں سر ہلایا اور پر کسی سوچ میں گم ہوگئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئیں۔

سیما ابھی دروازہ بند کر کے چند قدم ہی برآمدے کی طرف چل کر آئی ہوگی کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔

''یہ..... اس وقت کون آ گیا.....؟'' وہ بڑبڑائی۔

دستک ایک بار پھر ہوئی، سیما دوبارہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے بلند آواز میں پکارا۔

''کون ہے.....؟''

''میں وحیدہ ہوں.....!! دروازہ کھولو بیٹی.....!!''

☆.....☆.....☆

شرفو کے جسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی سی لہریں دوڑنے لگیں، وہ ہونقوں کی طرح نواب انور کی طرف دیکھنے لگا، جبکہ نواب انور خود بھی کم حیران نہیں تھے۔

''یہ..... یہ کیسی آواز تھی.....؟'' شرفو کے منہ سے نکلا: ''یہ تو کسی جانور کی آواز سے مشابہ تھی.....!!''

''نواب انور نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کنوئیں کی طرف جھک گئے، جہاں ہنوز لامتناہی اندھیرا پھیلا ہوا تھا.....!!

یہ سایہ کرم دین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا:

''کیا ہوا سرکار.....!!'' وہ سوالیہ انداز میں بولا: ''آپ لوگ اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہیں؟''

''تم خود اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟'' شرفو نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کرتے ہوئے اسے گھورا۔

کرم دین ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا: ''کل دلاور آجائے گا، جب تک اس کی جگہ مجھے ہی سنبھالنی ہے.....!!''

''مطلب.....؟''

''مطلب یہ کہ وہ رات بھر جاگ کر گویا پہرے داری کرتا ہے..... اس حویلی کی حفاظت اور کسی قسم کے بھی معاملات کی ہم لوگوں پر ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے..... اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا، تو اس کی پوچھ تاچھ بھی ہم سے ہوگی.....!!''

''ہوں.....!!'' شرفو نے سر ہلایا: ''بقول تمہارے کہ حویلی میں کئی غیر معمولی واقعات رونما ہوئے، تو کیا تم لوگ اس دوران سویا کرتے تھے؟''

یہ سوال کافی تلخ تھا۔ چند لمحے تو کرم دین سے کوئی جواب نہ بن پڑا، پھر وہ آہستہ سے سر ہلا کر بولا:

''جو شے دکھائی دے اور پھر کاری وار بھی کرے، تو اس سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے، لیکن ہوا سے لڑنا تو کسی پہلوان کے بھی بس کی بات نہیں ہے.....!!''

''اب اس بات کا مطلب بھی سمجھا دو.....!!'' شرفو بولا۔

''عالی بابا کی آمد کے بعد مجھے کچھ بتانے اور آپ کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی..... بس کل کا انتظار کرلیں.....!!''

''اچھا..... ٹھیک ہے.....!!'' شرفو نے کندھے اچکائے۔

پھر نواب انور نے دخل دیا۔

''ہم لوگ نیند نہ آنے کے باعث ذرا ٹہلنے نکلے تھے، لیکن کنوئیں کے قریب آ کر ایک عجیب بات ہوئی۔''

''وہ کیا.....؟''

''ہمیں کسی جانور کے ڈکرانے کی آواز سنائی دی تھی۔''

''اوہ.....!!'' کرم دین کے چہرے پر خوف پھیل گیا: ''تو وہ آواز آپ نے بھی سن لی.....!!''

''وہ آواز..... کیا مطلب.....؟''

''یہ اسی عفریت کی آواز ہے.....!!''

کرم دین کا لہجہ سرسراہٹ آمیز تھا: ''جس نے اس حویلی کو اجاڑا ہے.....!!''

''عفریت.....؟''

''جی..... جی ہاں.....!!''

''میں اس کے بارے میں پوچھوں گا تو تم چپ کا روزہ رکھ لوگے۔'' یہ شرفو تھا۔

''کاش میں بتا سکتا.....!!''

''اچھا چھوڑو.....!!'' نواب انور کچھ سوچ کر بولے: ''ہم دراصل جہنمی دروازے کا سراغ لگانے نکلے ہیں.....؟''

کرم دین کے لئے یہ الفاظ کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھے، وہ لرز اٹھا اور بولا:

''سرکار.....!! کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہے ہیں..... اب اسے اپنے ذہن سے نکال دیں.....!!''

''ٹھیک ہے.....!!'' نواب انور کا لہجہ نرم تھا: ''میں اپنے تئیں پوری کوشش کروں گا کہ اسے ذہن سے نکال دوں..... لیکن فی الحال ایک اور مسئلہ درپیش ہے.....!!''

''جی..... حکم.....!!''

''اس کنوئیں سے کسی جانور کے ڈکرانے کی آواز سنائی دی ہے.....!!'' نواب انور نے کہا: ''کیا تم نے اس میں کوئی چوپایہ بند کر رکھا ہے؟''

یہ سن کر کرم دین کا چہرہ تاریک ہوگیا، وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سیما کو کافی حیرت ہوئی تھی، بہرحال اس نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے اپنے مخصوص لبادہ سے لباس میں وحیدہ موجود تھی، اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

''اندر آجائیں آنٹی.....!!'' سیما بھی جواباً مسکرائی: ''بہت لمبی عمر ہے آپ کی.....!!''

''لمبی عمر.....!!'' وحیدہ کے منہ سے نکلا تھا، پھر اس نے فوراً ہی اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی: ''عمر تو جتنی بھی ہو، آخر ایک دن تو موت کے چنگل میں پھنسنا ہی ہے.....!!''

''ارے ایسی باتیں نہ کریں.....!!'' سیما نے اسے راستہ دیا: ''اندر تو آجائیں، دروازے پر کب تک

کھڑی رہیں گی.....!!''

وحیدہ خاموشی سے اندر چلی آئی..... سیما غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی پھر وہ بولی:

''کیا بات ہے..... آج آپ کچھ چپ چپ سی ہیں.....!!''

''ہاں.....!! بعض اوقات سفر بھی تھکا دیتا ہے۔''

''ڈرائنگ روم میں وحیدہ ایک صوفے پر بیٹھتی تو سیما فوراً ہی بولی۔

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں.....!!''

''ارے نہیں۔'' وحیدہ فوراً بولا: ''اس کی ضرورت نہیں.....!!''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' سیما کو برا لگ گیا: ''آپ جب بھی میرے گھر پر آئی ہیں، آپ نے کبھی نہ کچھ کھایا اور نہ پیا.....!! کیا آپ کے خیال میں میرے گھر کی چیزیں خراب ہوں گی؟''

''ارے نہیں بیٹا.....!!'' وحیدہ بے ساختہ ہنس پڑی: ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں کھانے پکانے کا بہت شوق ہے اور تم بناتی بھی بہت لذیذ ہو.....!!''

''تو پھر..... لاؤں چائے.....؟''

''ابھی رکو.....'' وحیدہ سر ہلا کر بولی: ''پہلے اہم بات کرلی جائے..... اب پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے میرے ساتھ چلنے کے بارے میں کیا سوچا.....؟''

''جی..... میں تیار ہوں۔'' سیما بولی۔

''ٹھیک ہے.....!!'' وحیدہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی: ''تو پھر میں جمعرات کی شام میں آجاؤں گی، تم میرے ساتھ چلنا.....!!''

''شام میں.....!!'' سیما تذبذب میں پڑ گئی۔

''میں شام میں نہیں جا سکتی.....''

''کیوں.....؟''

''میرے شوہر گھر پر ہوتے ہیں.....!!''

''اوہ.....!!''

''کیا کسی اور وقت نہیں جا سکتے..... میرا مطلب ہے کہ دن میں کسی وقت چلیں، جب وہ گھر میں موجود نہ ہوں.....!!''

''نہیں..... شام کا وقت ہی بہتر ہے.....!!'' وحیدہ بولی۔ ''اسی وقت ان سے ملاقات ہو سکے گی.....!!''

''لیکن میں شام میں نہیں جا سکتی.....!!''

''میرے پاس ایک ترکیب ہے.....!!''

''وہ کیا.....؟''

وحیدہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''تم اپنی ماں کے گھر کے بہانے سے نکل آؤ.....!! میں گلی کے کونے پر ہی تمہارا انتظار کروں گی.....!!''

''ٹھیک ہے..... میں ایسا ہی کروں گی.....!!''

''شاباش.....!!'' وحیدہ خوش ہوگئی: ''اب اگر تم اپنے لئے چائے بنا لو تو میں یہاں انتظار کر رہی ہوں.....!!''

''میں تو آپ کے لئے بناؤں گی.....!!''

''نہیں بیٹا.....!!'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولی: ''میں صرف رات میں ہی کھاتی پیتی ہوں.....!! اگر میں دن میں کچھ بھی کھا پی لوں تو میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے.....!!''

یہ سن کر سیما اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

''ٹھیک ہے..... میں چائے کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں.....!! آپ بیٹھیں میں آتی ہوں.....!!''

''ہاں..... ہاں..... تم جاؤ.....!!''

سیما کمرے سے نکل گئی..... اس کے جاتے ہی وحیدہ اٹھی اور سامنے دیوار میں لگے ہوئے فریم میں نواب انور کی تصویر کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔

وہ غور سے نواب انور کی اس وجیہہ اور باوقار تصویر کو دیکھ رہی تھی، پھر اچانک ہی اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر معدوم ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

نواب انور کے ساتھ ساتھ شرفو بھی اسے غور

سے دیکھ رہا تھا۔

پھر شرفو نے کہا:

''بھائی......! تم کتنے کمزور دل کے مالک ہو...... ذرا ذرا سی بات پر تمہارے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے......!!''

''آپ میرا مذاق اُڑالیں...... میں برا نہیں مانوں گا......!!''

''تم اس عفریت کے بارے میں بتادو...... آخر اس کا کنوئیں میں کیا کام ہے......؟''

''پراسرار آواز تو حویلی میں اکثر گونجتی ہے......!! کبھی صحن میں، کبھی باغیچے میں اور کبھی کسی کمرے میں اس آواز کو بہت سے لوگوں نے سنا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے......!!'' نواب انور نے موضوع بدلا: ''اب صبح عالی بابا سے ہی بات ہوگی...... تم آرام کرو......!!''

کرم دین نے کافی تیزی سے قدم اٹھائے تھے اور پھر وہ صحن کے ساتھ موجود سرونٹ کوارٹرز والے حصے میں گم ہوگیا۔

''یہ حویلی تو مجھے گھن چکر معلوم ہوتی ہے۔'' شرفو بڑبڑایا۔ ''میں تو صبح شہر کے لئے روانہ ہوجاؤں گا...... چھوٹی بی بی بھی مجھے یاد کررہی ہوں گی......!!''

''کیا ڈر لگ رہا ہے......؟'' نواب انور مسکرائے۔

''نہیں سرکار......!!'' شرفو نے جلدی سے سر ہلایا: ''مجھے بی بی جی کی فکر ہورہی ہے......!! وہ پورے گھر کے کاموں میں بری طرح تھک رہی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے......!!'' نواب انور بولے: ''تم ناشتہ کرکے نکل جانا......!!''

شرفو نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن کی صبح کافی خوشگوار تھی، ہلکی ہلکی خنک ہوا اور فضاء میں چھائی ہوئی دھند کافی دلکش منظر پیش کررہی تھی۔

ناشتے کے بعد نواب انور نے شرفو سے کہا:

''چلو...... تم تیاری کرلو......!!''

''کس بات کی......؟'' وہ چونکا۔

''ارے بھئی تم نے ہی تو شہر جانے کا کہا تھا......!!''

''نہیں...... میں نہیں جارہا......!!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں......؟''

''بس...... فی الحال میں آپ کے ساتھ ہوں......!!'' وہ سنجیدہ ہوکر بولا: ''میں نے محسوس کیا ہے کہ اس حویلی کی بھول بھلیوں میں آپ کے لئے کسی کا ساتھ ضروری ہے......!!''

نواب انور نے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک نوجوان ملازم اندر داخل ہوا اور بڑے ادب سے سر کو خم کرتے ہوئے بولا:

''بڑے سرکار......!! عالی بابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں......!!''

''اوہ...... اچھا......!!'' نواب انور نے چونک کر کہا: ''ٹھیک ہے انہیں مہمان خانے میں بٹھاؤ اور چائے وغیرہ پیش کرو......!! میں آتا ہوں......!!''

نوجوان چلا گیا......!! نواب انور نے شرفو کی طرف دیکھا اور بولے:

''چلو...... شاید کچھ خاص باتیں سامنے آنے والی ہیں......!! آؤ!!''

☆......☆......☆

دوسرے دن اتفاق سے نادر نے ناشتے کے دوران کہا:

''میں شاید آج دیر سے لوٹوں گا......!!''

''کیوں......؟'' سیما نے سوالیہ انداز میں پوچھا: ''کیا کہیں جائیں گے......؟''

''ہاں......!!'' نادر نے سر ہلایا: ''ایک خاص میٹنگ میں شریک ہونا ہے......!!''

سیما نے ایک طویل سانس لی اور بولی:

''ہاں...... میرے لئے تو آپ کے پاس اب

وقت ہی نہیں ہوتا......!! جناب عالی کسی نہ کسی میٹنگ میں ہی مصروف رہتے ہیں......!!''

نادر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر جلدی سے بولا:

''بس کیا کروں...... میری نوکری ہی کچھ اس قسم کی ہے......!! دراصل مجھے مارکیٹنگ کے حوالے سے بہت سے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے......!! کمپنی میں ترقی کی پلاننگ بنانے اور اسے لاگو کرنے کی میری ہی ذمہ داری ہے......!!''

''تو میں نے کب انکار کیا ہے......!!'' سیما مسکرائی۔ ''میں تو صرف ایک چھوٹی سی حقیقت بیان کررہی ہوں......!!

''یہ حقیقت نہیں بلکہ شکوہ ہے......!!''

''اپنوں سے ہی ہوتا ہے شکوہ، شکایت اور جگہ...... سب کچھ اسی سے وابستہ ہوتا ہے، جو زندگی کا شریک ہو......!!''

یہ سن کر نادر نے ایک طویل سانس لی اور بولا:

''آج تم اپنی امی کے گھر چلی جاؤ......!!''

بے ساختہ سیما کی آنکھیں چمک اٹھیں، بن مانگے ملیں موتی، مانگے نہ ملے خاک...... لیکن اب ایک اور بھی مسئلہ تھا، اور وہ یہ کہ وہ وحیدہ سے کس طرح رابطہ کرے گی...... وہ تو خود ہی آتی تھی، اس سے رابطہ کرنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہیں تھی۔

اسے خاموش دیکھ کر نادر بول اٹھا۔

''کیا سوچنے لگیں۔''

''آں......'' وہ چونکی۔ ''کک...... کچھ نہیں......!!''

''کچھ تو بات ہے......!!''

''نہیں......'' وہ جلدی سے بولی: ''اچھا یہ بتائیں کیا رات میں آپ مجھے لینے آئیں گے؟''

''مشکل ہے......!!''

''کیوں......؟''

''مجھے زیادہ دیر بھی ہوسکتی ہے......!!'' وہ بولا۔ ''تم خود ہی آجانا...... ویسے بھی میں کھانا وغیرہ کھا کر آؤں گا!!''

یہ کہہ کر نادر نے اپنا سامان اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ سیما اب کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

حویلی کے مہمان خانے میں ارسلان بیگ عرف عالی بابا۔ ''جلوہ افروز'' تھے۔ ان کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

انہیں دیکھ کر عالی بابا بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے، نواب انور نے فوراً ہی آگے بڑھ کر ہاتھ اٹھایا۔

''ارے...... تشریف رکھیں...... کیوں شرمندہ کررہے ہیں......؟''

''میں عرصہ دراز سے اس حویلی کا نمک خوار ہوں۔'' عالی بابا نے کہا۔ ''اور اب حویلی کے اجارہ داروں میں صرف آپ ہی کا وجود باقی ہے...... آپ میرے لئے باعث عزت ہیں......!!''

''یہ آپ کی عزت افزائی ہے عالی بابا......!!''

یہ کہہ کر نواب انور ان کے سامنے بیٹھ گئے، شرفو نے بھی ایک نشست سنبھال لی تھی۔

عالی بابا نے کچھ سوچا اور پھر ان کے ہونٹ ہلے:

''سب سے پہلے میں جو بات کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کا تعلق ایسی باتوں سے ہے، جن پر یقین کرلینا بہت ہی مشکل کام ہے......!!''

''اس کی وجہ......؟''

''وجہ......!!'' عالی بابا نے ایک طویل سانس لی۔ ''وجہ یہ ہے کہ جو واقعات حویلی سے وابستہ ہیں، وہ عام اور معمولی ہرگز نہیں...... اور ان پر یقین کرلینا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے......!!''

''آپ...... کیا کہنا چاہتے ہیں......؟''

''میں مختصر بات کروں گا......!!'' عالی بابا بولے: ''دراصل بات یہ ہے کہ اس حویلی کے مکینوں پر عرصہ دراز سے ایک بدروح نے قبضہ کررکھا تھا......''

''بدروح......؟'' نواب انور کے منہ سے نکلا۔

شرفو بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں انور بیٹے.....!!'' عالی بابا نے ٹھنڈی سانس بھری: ''تمہارے دادا مرحوم کو کالے ہرن کے شکار کا جنون کی حد تک شوق تھا..... ایک دن وہ بھول کے جنگل میں گئے اور وہیں اس بدروح نے ان کے وجود پر قبضہ جمالیا.....!! یوں وہ تمہارے دادا جان کے ساتھ اس حویلی میں داخل ہوگئی.....!!''

''اوہ..... پھر کیا ہوا.....؟'' نواب انور نے چونک کر پوچھا۔

''یہ بہت لمبی اور طویل داستان ہے.....!!'' عالی بابا نے جواب دیا تھا: ''اسے پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھو..... قصہ مختصر یہ کہ حویلی میں داخل ہونے کے بعد اس نادیدہ ہستی نے حویلی میں پہلے تو خوف اور وحشت پھیلائی تھی.....!! وہ جگہ جگہ لوگوں کو عجیب و غریب حلیے میں دکھائی دیتی تھی.....!! بعض اوقات اس کی شکل اتنی خوفناک ہوتی تھی کہ دیکھنے والوں کے دل دہل جاتے تھے.....!! آہستہ آہستہ اس نے حویلی پر اپنا قبضہ جمالیا..... یہاں ناانفاقی پھیل گئی..... نفرتوں کی آگ آہستہ آہستہ پھیلتی چلی گئی..... آخر کار سب اپنے اپنے کمروں تک محدود ہو کر رہنے لگے.....!! کسی کو کسی کی خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد بدروح کا اصل کام شروع ہوا.....!!''

یہ کہہ کر عالی بابا خاموش ہوگئے۔

''کیسا کام.....؟'' نواب انور بے تابی سے بولے۔

''حویلی میں رہنے والے لوگ آہستہ آہستہ موت کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ اور پھر یہ حویلی ویران ہوتی چلی گئی.....!!''

''اوہ..... پھر کیا ہوا.....؟''

''آپ کے والد مرحوم کی موت کے بعد میرے مرشد نے اتفاق سے حویلی کا رخ کیا..... اس بدروح سے انہوں نے باقاعدہ جنگ لڑی اور اپنے عملیات کے ذریعے اس کو اپنے قابو میں کرلیا..... اس جگہ میں میرے مرشد بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، لیکن وہ بدروح آج بھی اس حویلی کی قید میں ہے.....!!

''اگر آپ کے مرشد نے اسے زیر کرلیا تھا، تو پھر وہ اپنی جان سے ہاتھ کیوں دھو بیٹھے تھے.....؟'' شرفو بول اٹھا۔

''انہوں نے یہ جنگ جیت لی تھی۔ لیکن اس بدروح کو قید کرنے کے بعد انہیں ایک خطرناک اور جان لیوا بیماری نے گھیر لیا.....!! اس بیماری کی تکلیف میں وہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئے.....!!''

اتنا کہہ کر عالی بابا خاموش ہوئے تو کمرے میں جیسے موت کا سا سناٹا طاری ہوگیا..... اس وقت اگر ایک چھوٹی سی سوئی بھی پھینکی جاتی تو شاید اس کا بھی دھماکہ سنائی دیتا..... ایسا ہی سکوت طاری ہوگیا تھا.....!!

اتنی دیر میں وہی نوجوان ملازم کمرے میں داخل ہوا، اس کے ہاتھوں میں چائے اور لوازمات کی ٹرے موجود تھی.....!!

اس نے نہایت خاموشی سے ٹرے میز پر رکھی، سب کو چائے پیش کی اور دوبارہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

پھر اس سکوت کو نواب انور نے توڑا۔

''عالی بابا.....!! کیا اس بدروح کا خاتمہ ہو چکا ہے.....؟''

''نہیں بیٹے.....!!'' ان کے لہجے میں تاسف تھا: ''مرشد کو ایک خاص وقت کا انتظار تھا، کیونکہ اسی وقت اس کا خاتمہ ممکن تھا..... لیکن..... اس سے قبل ہی وہ بے چارے دنیا سے رخصت ہوگئے.....!!''

''تو پھر.....!! وہ بدروح اب کہاں ہے.....؟''

عالی بابا چند لمحے رکے اور پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔ ''اسے مرشد نے تہہ خانے میں بند کردیا تھا۔ اور وہ آج تک اس تہہ خانے کے کالے اور جہنمی دروازے کے عقب میں قید ہے.....!!''

عالی بابا ایک بار پھر خاموش ہوگئے..... واقعی ان کی سنائی ہوئی داستان حد درجے پراسرار اور خوف و

دہشت سے بھرپور تھی..... شرفو نے نواب انور کی طرف دیکھا جو گم صم بیٹھے ہوئے تھے۔

ان کی دلی کیفیت کے بارے میں تو شرفو کو اندازہ نہیں تھا۔ البتہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ خود اس کے سینے میں دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں.....!!

''اور اب..... ایک آخری بات.....!!'' عالی بابا کا لہجہ کافی تنبیہ آمیز ہوگیا: ''میں خود ہی نہیں جانتا کہ اب اس بدروح سے کون مقابلہ کرسکتا ہے..... کیونکہ خود میرے مرشد بھی بے حد طاقتور اور باکمال عامل تھے..... چنانچہ وہ بھی اس کے خاتمے کے لئے ایک خاص وقت کے منتظر تھے..... لیکن وہ دنیا سے رخصت ہوگئے..... بدروح اب بھی اسی حویلی میں قید ہے..... وہ یقیناً اس تہہ خانے سے باہر آنا چاہتی ہوگی.....!! لیکن جب تک تہہ خانے کا دروازہ بند ہے۔ وہ بے بس اور محتاج ہے.....!! اب اگر اس جہنمی دروازے کو کھولا گیا اور وہ آزاد ہوگئی..... تو پھر شاید اس قصبے میں سوائے ہلاکتوں کے اور کچھ نہ ہوگا.....!! ہاں..... میں سمجھتا ہوں اور میرا ادنیٰ سا علم یہ کہتا ہے کہ جب تک وہ دروازہ بند ہے تو چاروں طرف امن اور شانتی ہے.....!! لیکن اسے کھول دیا گیا، تو شاید.....''

عالی بابا بولتے بولتے رک گئے..... نواب انور بے چین ہوگئے اور پھر جب عالی بابا خاموش ہی رہے تو وہ بول اٹھے۔

''آپ نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی.....؟ بولیں.....!!''

''ہاں.....!! میں ان الفاظ کو ادا کرنے کی اب ہمت نہیں کر پا رہا۔''

''ایسی کیا بات ہے.....!! بتائیں.....!!''

عالی بابا نے ایک طویل سانس لی اور بولے:

''قید سے نکل آنے کی صورت میں اس کا سب سے پہلا شکار..... تم ہوگے میرے بچے..... ہاں..... تم.....!!''

☆.....☆.....☆

اور پھر جب دوپہر ڈھلنے لگی تو سیما کی اضطرابی کیفیت میں اضافہ ہوگیا۔

وہ اب اپنے اپ کو ہی برا بھلا کہہ رہی تھی۔ وحیدہ اتنی بار اس کے گھر پر آئی تھی۔ لیکن اس کے گھر کے بارے میں پوچھنے کا سیما کو خیال ہی نہیں آتا تھا۔

اب اگر اس نے وحیدہ کا پتا پوچھ لیا ہوتا، تو آج کے اس بہترین موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اس کے گھر پہنچ جاتی.....!!

لیکن صد افسوس کہ وہ اپنی لاپروائی اور بے توجہی کی بناء پر کبھی وحیدہ سے اس کا ایڈریس پوچھ ہی نہ سکی.....!!

بہرحال اب سوائے پچھتاوے کے کیا حاصل تھا..... وہ ایک طویل سانس لے کر کچن میں گھس گئی۔

اسے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی.....!! اس نے پتیلی میں پانی ڈالا اور اسے چولہے پر چڑھا دیا۔

عین اسی وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پکارا ہو: ''سیما.....!! سیما بیٹی.....!!''

وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کچن سے باہر نکل آئی۔ یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی تھی اور کافی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

بالکل ایسا گمان ہو رہا تھا جیسے باہر کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو اور اب کوئی شناسا اندر آکر اسے آواز دے رہا ہو.....!!''

اس نے بے ساختہ برآمدے میں دیکھا، پھر وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

لیکن یہاں تو کوئی تھا ہی نہیں.....!! پھر یہ آوازیں کہاں سے آئی تھیں.....!!

''مجھے ضرور وہم ہوا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر قدم آگے بڑھا دیئے اور دروازے کے قریب جا کر بولی:

''کون ہے.....؟''

''بیٹی میں ہوں.....!!'' یہ وحیدہ کی آواز تھی:

''میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں.....!!''

''آوازیں.....!!'' اس نے حیرت سے دہرایا:

''لیکن.....!!''

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ وحیدہ گھر میں داخل ہوگئی اور اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ہاں..... میں نے تمہیں کافی آوازیں دیں..... تم شاید کسی کام میں مصروف تھیں.....!!''

''نہیں..... میں تو چائے بنانے جارہی تھی.....'' سیما بولی: ''مجھے آوازیں آئی تھیں..... لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے قریب سے ہی کسی نے مجھے پکارا ہو..... میں تو گھر کے اندر ہی آواز دینے والے کو ڈھونڈ رہی تھی.....!!

یہ سن کر وحیدہ عجیب سے انداز میں مسکرا کر رہ گئی پھر بولی:

''دیکھ لو..... میں نے تمہیں دل سے آواز دی تھی..... اور دل میں رہنے والے بہت قریب ہوتے ہیں.....!!''

''آپ نے ٹھیک کہا.....!!'' سیما بھی مسکرا دی: ''آپ کمرے میں بیٹھ جائیں۔

''اچھے موقعے پر آئی ہیں..... میں چائے بنا رہی تھی!!''

''ہاں..... لیکن تم جانتی ہو کہ میں نہ کچھ کھاتی ہوں اور نہ ہی پی سکتی ہوں۔'' وحیدہ نے معصوم سی شکل بنالی۔

''آخر کیا وجہ ہے.....؟''

''مجھے عجیب و غریب قسم کی بیماری ہے.....!!''

وحیدہ بولی: ''اگر میں دن میں کچھ کھا پی لوں تو فوراً ہی قے ہو جاتی ہے.....!!''

''اوہ.....!! یہ کیسی بیماری ہے؟'' سیما حیرت سے بولی۔

''خدا جانے.....!!'' وحیدہ نے طویل سانس لی۔ پھر وہ بولی: ''کیا تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو.....؟''

''ہاں.....!! لیکن ایک مسئلہ ہے.....!!''

''وہ کیا.....؟''

''میں نے نادر کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی: ''میں اس کی وجہ سے الجھن میں ہوں۔''

''کیسی الجھن.....؟'' وحیدہ نے اسے غور سے دیکھا۔

سیما نے پہلو بدلا اور پھر بولی۔

''یہ تو ایک طرح سے دھوکا ہوگا.....!! حالانکہ میں نادر کی موجودگی میں اس بات کی خواہش مند تھی کہ وہ آج دیر سے آئیں اور پھر تم بھی یہاں آجاؤ..... تاکہ ہم دونوں جاسکیں.....!! یہ دونوں ہی باتیں اتفاق سے پوری ہوگئیں.....!!''

''تو پھر..... کیا مسئلہ ہے؟''

''لیکن اب میرا دل نہیں مان رہا۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔ ''اگر یہ معاملہ نادر کے علم میں آجائے تو بہتر ہے۔''

''تم اچھے مقصد کے لئے گھر سے نکل رہی ہو.....!!''

''یہ بات ٹھیک ہے..... لیکن میرا دل نہیں مان رہا.....!!''

''دل کو سمجھاؤ.....!!''

''میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ دھوکا ہے.....!!''

''دھوکا.....!!'' وحیدہ نے عجیب سے انداز میں دہرایا۔

پھر وہ ہنسی اور بولی۔

''کیا تم جانتی ہو کہ دھوکا کسے کہتے ہیں.....؟''

''ہاں.....!! کہا کچھ جائے اور کیا کچھ جائے تو اسے دھوکا کہتے ہیں.....!! میں امی کے گھر کا بول کر کہیں اور چلی جاؤں تو یہ دھوکا ہے.....!!''

''ہوں.....!!'' وحیدہ کا انداز معنی خیز تھا: ''اچھا..... اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا شوہر کہاں ہے.....!!''

''کمپنی.....!!''

''ہوں..... وہ رات کو دیر سے گھر آئے گا؟''

''ہاں.....!!''

''کیوں.....؟''

''آج کوئی میٹنگ ہے.....!!'' سیما نے بتایا۔

''اس لئے انہیں دیر ہو جائے گی.....!!''

''نادان لڑکی.....!! یہ بھی تو دھوکا ہے.....!!'' وحیدہ مسکرائی۔ ''بلکہ میری نظر میں یہ ایک بڑا دھوکا ہے.....''

''کیا کر رہی ہو.....؟'' سیما نے اسے گھورا: ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔''

''نادر نے جو کچھ کہا ہے..... وہ حقیقت ہرگز نہیں ہے۔'' وحیدہ نے جواب دیا۔

سیما نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم..... کہنا کیا چاہتی ہو.....؟''

وحیدہ نے چند لمحے توقف کیا اور پھر آہستہ سے بولی۔

''وہ کسی میٹنگ میں ہرگز نہیں گیا.....!!''

''تو پھر..... کہاں گئے ہیں؟'' سیما نے حیرت سے پوچھا۔ ''اور پھر یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟''

''اب اپنے دل کو ذرا مضبوط کر کے سنو.....!!'' وحیدہ نے کڑے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تم کو بتانا نہیں چاہ رہی تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کچھ عرصے سے تمہارا شوہر ایک خوب صورت لڑکی کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے.....!!''

''کیا.....!!'' سیما اچھل پڑی۔ اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا: ''یہ..... تم کیا کہہ رہی ہو.....؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں.....!!'' وحیدہ کا لہجہ مضبوط تھا: ''تم ابھی میرے ساتھ چلو..... میں تمہیں دکھا دوں گی.....!!''

''لیکن تم یہ سب کیسے جانتی ہو.....؟'' سیما نے اسے غور سے دیکھا: ''لیکن تم مجھے اپنے شوہر سے بدگمان تو نہیں کر رہی ہو؟''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے تمہارا دل خراب کر کے کیا ملے گا.....!!'' وحیدہ نے جواب دیا: ''میں تو تمہیں بتانا چاہ رہی ہوں کہ دھوکا کسے کہتے ہیں.....!!''

''اچھا..... اب یہ بتا دو کہ تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا.....؟''

''اتفاق سے تمہارا شوہر جس لڑکی سے مل رہا ہے، میں اسے اچھی طرح سے جانتی ہوں.....!!''

''اوہ.....!!'' سیما دل دھک سے رہ گیا۔

''آؤ..... تم میرے ساتھ چلو.....!!'' وحیدہ اٹھتے ہوئے بولی: ''میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ وہ اس وقت کون سی میٹنگ میں ہوگا..... اٹھو.....!!''

سیما گم صم انداز میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وحیدہ جب کمرے سے نکلی تو اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی، جو عقب میں موجود سیما کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔

☆.....☆.....☆

عالی بابا کے یہ الفاظ کافی سنسنی خیز تھے، وہ خاموش ہوئے تو کافی دیر بعد نواب انور کے ہونٹ ہلے:

''وہ بدروح ہے کہاں.....؟''

''تہہ خانے میں.....!!''

''اور تہہ خانہ کہاں ہے.....؟''

''اگر میں نے تمہیں بتا دیا تو تم اپنی فطرت کے مطابق اسے کھولنے کی خواہش کا اظہار کرو گے.....!! جبکہ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اب حویلی میں اس خاندان کا کوئی اور فرد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے.....!!''

''میں ایسا کچھ نہیں کروں گا.....!!'' نواب انور بولے: ''میں صرف معلوم کرنا چاہتا ہوں.....!!''

''اس تہہ خانے کا راستہ دو جگہوں سے نکلتا ہے.....!!''

''کون سی جگہیں.....؟''

''ایک راستہ تو حویلی کے آخری کونے میں واقع ایک خالی کمرے سے نکلتا ہے.....!! عالی بابا نے بتایا: ''جبکہ دوسرا راستہ کنوئیں کے اندر موجود ہے.....!!''

"اوہ.....!!" نواب انور کے منہ سے نکلا۔

"کیا ہوا.....؟" عالی بابا نے پوچھا۔

جواباً نواب انور نے رات والا واقعہ بیان کردیا۔ عالی بابا نے سر ہلایا اور بولا:

"یقیناً یہ اسی عفریت کی آواز تھی.....!! وہ اس تہہ خانے سے باہر نکلنے کے لئے کافی عرصے سے بے چین ہے.....!! لیکن مرشد نے اس کے گرد جو دائرہ کھینچا ہے، اسے توڑنا اور اس کے حصار کو زائل کردینا اس بدروح کے بس کی بات نہیں ہے.....!!"

"اور اگر وہ دروازہ غلطی سے کھل گیا تو کیا ہوگا.....؟"

"ایسا نہیں ہوسکتا.....!!" عالی بابا نے نفی میں سر ہلایا: "جب تک اس دروازے کو کھولا نہ جائے گا، وہ بند ہی رہے گا.....!! ہاں.....!!"

ایک بار پھر عالی بابا کے خاموش ہونے پر سکوت کا عالم چھا گیا۔ یہ کوئی اپنی اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا.....!!

نواب انور کو اب حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس کا بھی سامنا تھا..... اور اس افسوس میں پچھتاوا بھی اپنے عروج پر تھا.....!!

خون آخر خون ہوتا ہے..... اور جب اپنا خون جوش مارتا ہے، تو پھر بات ہی اور ہوجاتی ہے.....!!

نواب انور سوچ رہے تھے کہ ان کے گھر والوں کو نہ جانے کس کرب سے اور کن پریشانیوں سے گزرنا پڑا تھا.....!! ہاں.....!!

اتنا کچھ یہاں ہوتا رہا، نہ جانے کتنی زندگیوں کا خاتمہ ہوا اور خود نواب انور اس سے لاعلم رہے، وہ تو بس اپنی ہی دنیا میں گم تھے.....!!

آج ان کے سامنے کتاب کا یہ ورق کھلا تھا، تو اب چاروں طرف گزرتے ہوئے خون ریز ماضی کی سیاہی چاروں طرف بکھر کر رہ گئی تھی۔!!

بدلا.....!! ہاں بدلہ لینا تو اب ان کا پیدائشی حق تھا، ان کے خاندان کا دشمن اسی حویلی میں موجود تھا اور باقاعدہ زندہ بھی تھا..... اتنے لوگوں کا خون کرنے کے بعد وہ اب بھی اپنی اصلی جون میں رہائی کے لئے برسر پیکار تھا.....!!

ان کے جسم میں ٹھنڈا ٹھنڈا سا پسینہ جسم کے مساموں سے پھوٹ پڑا.....!!! ایسے میں شرفو کو یاد آیا:

"عالی بابا.....!! ٹرین کے سفر کے دوران آپ کے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا.....؟ آپ کے سر میں چوٹ کیسے لگی تھی.....؟"

عالی بابا چونکے، پھر جلدی سے بولے:

"میں خود اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں.....!! البتہ....."

"البتہ کیا.....؟"

عالی بابا نے ایک طویل سانس لی اور بولے:

"میں نے سفر کے دوران کسی ماورائی وجود کو محسوس کیا تھا.....!!"

"کیا مطلب.....؟"

"مطلب یہ کہ ہمارے کمپارٹمنٹ میں ایک ایسی ہستی سفر کررہی تھی کہ جس کا انسانوں میں ہرگز شمار نہیں ہوسکتا.....!! دراصل میں ان چیزوں کو فوراً محسوس کرلیتا ہوں.....!! اپنے مرشد سے تھوڑا بہت سیکھنے کو ملا تھا.....!! اس میں یہ صلاحیت بھی شامل ہے کہ میں اثرات اور ماورائی مخلوق کے ان دیکھے وجود کو فوراً ہی محسوس کرلیتا ہوں اور مجھے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہیں.....!!"

"اوہ.....!!" نواب انور کے منہ سے نکلا: "لیکن آپ کے سر کی چوٹ سے اس کا کیا تعلق تھا؟"

"بہت ہی گہرا تھا.....!!" وہ مسکرائے۔

"میں سمجھا نہیں.....!!"

"مجھے چوٹ اسی مخلوق نے لگائی تھی.....!!" انہوں نے انکشاف کیا: "اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کمپارٹمنٹ میں اسے محسوس کرلیا تھا..... اس کے بعد میں تو بے ہوش ہوچکا تھا.....!! اس لئے مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کہاں گئی تھی.....!!"

"اوہ.....!!"

"ہاں میرے بچوں.....!!" عالی بابا کا انداز ناصحانہ تھا: "ہم ان چیزوں کو نہ تو نظر انداز کرسکتے ہیں اور نہ ہی ان کا انکار ممکن ہے..... ان دیکھی مخلوق کا وجود اٹل حقیقت ہے..... جیسے ہم فرشتوں کو دیکھنے سے قاصر ہیں..... اسی طرح جن اور دوسرے اثرات کا موجود ہونا ایک مثبت سچ ہے.....!! جو لوگ ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں، وہ نادان اور ناتجربہ کار ہیں.....!! اور جب تک کسی کا واسطہ نہیں پڑتا، تو اس کی سمجھ میں یہ حقیقت ہرگز آتی نہیں.....!!"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے.....!!" شرفو نے سر ہلایا۔

نواب انور کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، پھر وہ بولے۔

"کیا آپ ہمیں وہ دروازہ دکھائیں گے.....!! جہاں وہ عفریت قید ہے؟"

"ہاں..... ضرور.....!! لیکن....."

"لیکن کیا.....؟"

"تم وعدہ کرو کہ اس دروازے سے کسی قسم کی کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کروگے، کیونکہ میرے خیال میں تو اب میرے مرشد کے بعد میری نگاہ میں کوئی ایسا مرد مجاہد نہیں ہے، جو اس پر دوبارہ قابو پاسکے.....!! میں خود تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہوں.....!!"

"ٹھیک ہے.....!!" نواب انور نے سر ہلایا: "میں صرف اسے دیکھنے کا خواہش مند ہوں.....!!"

"اچھا تو پھر چلو.....!!" عالی بابا اٹھتے ہوئے بولے: "میں تمہیں اس جہنمی دروازے سے آگاہ کردوں..... تاکہ تم اس سے دور رہو..... کہیں ایسا نہ ہو کہ لاعلمی کی بناء پر تم اسے کھول بیٹھو اور پھر مصیبتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوجائے.....!! آؤ..... میں تمہیں دکھاتا ہوں.....!!"

☆.....☆.....☆

سیما نے ایک آٹو رکشہ کو ہاتھ دیا تھا، اور پھر دونوں اس میں سوار ہوگئیں۔

"کہاں چلنا ہے جناب.....؟" رکشہ ڈرائیور نے سیما کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

وحیدہ نے آہستہ سے اس کے کان میں سرگوشی کی:

"لال باغ.....!!"

سیما نے جلدی سے اس کے الفاظ دہرائے..... رکشے والے نے سر ہلایا اور رکشے کو حرکت میں لے آیا:

سیما کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی، نادر کے متعلق جو انکشاف ہوا تھا، اس سے ایک بھونچال سا آگیا تھا.....!!

رکشہ اپنا سفر طے کررہا تھا، ایسے میں سیما نے وحیدہ سے پوچھا: "آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہے کہ نادر اسی جگہ ملیں گے.....؟"

یہ سن کر وحیدہ مسکرائی اور بولی:

"اس نے وہی مخصوص جگہ بنائی ہوئی ہے..... جہاں وہ کول سے ملاقاتیں کرتا ہے اور گھنٹوں دونوں وہاں بیٹھے رہتے ہیں.....!!"

"اوہ.....!!" سیما کے دل کو دھچکا سا لگا: "لیکن نادر ایسا کیوں کررہے ہیں؟ وہ تو مجھ سے شدید محبت کرتے ہیں.....!! ہاں.....!!"

"محبت.....!!" وحیدہ کا لہجہ زہر خند تھا: "اب محبت کا کوئی وجود نہیں رہا، یہ دنیا اب صرف مطلب اور مقصد پر چلتی ہے، تم نے اپنے شوہر کا مقصد پورا نہیں کیا، تو وہ اب کسی اور کی طرف مائل ہورہا ہے.....!!"

"میں سمجھی نہیں.....!!"

"کیا تم اسے اولاد دے سکی ہو.....؟" وحیدہ بولی: "شاید تمہاری بانجھ کوکھ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے.....!! تم سے ناامید ہوکر وہ اب کسی اور طرف مائل ہورہا ہے.....!! تب ہی وہ دوسری عورت پر اپنا وقت ضائع کررہا ہے.....!!"

"اوہ.....!!" سیما کے دل کو ایک اور دھچکا لگا..... وہ اب خود کو احساس کمتری کا شکار محسوس کررہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وحیدہ بولی:

"بس..... تم مجھ سے ایک وعدہ کرو.....!!"

"ہاں..... بولو.....!!"

"دیکھو میری بچی.....!! اگر تم دھوکے والی بات نہ کرتیں، تو میں یہ راز تمہیں کبھی نہ بتاتی.....!! لیکن میں نے مجبور ہو کر تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے.....!! اب تم مجھ سے ایک وعدہ کرو.....!!"

"بولو.....!!"

"لال باغ میں اپنے شوہر کو دیکھ کر تم اسے متوجہ ہرگز نہیں کرو گی.....!!"

"کیوں.....؟"

"ہاں.....!! یہ ضروری ہے.....!!" وحیدہ کا لہجہ سخت تھا۔ "اگر تم نے ایسا کیا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی.....!! کیونکہ جب بات کھلے گی تو پھر مجھ پر برائی آ جائے گی.....!!" بس تم دور سے دیکھنا اور چپ چاپ واپس ہو لینا.....!!"

"اچھا.....!!" سیما نے ٹھنڈی سانس بھری، میں ایسا ہی کروں گی۔

"شاباش.....!!" وحیدہ خوش ہو گئی: "تم واقعی ایک سمجھ دار لڑکی ہو..... اور مجھے پوری امید ہے کہ تم جب اس بابا کے پاس جاؤ گی اور وہ اپنے علم کے ذریعے تمہارا علاج کر دے گا، تو تم جلد ہی نادر کو دوبارہ اپنی طرف متوجہ کر لو گی.....!! ہاں.....!!"

"سیما نے خیالی کے سے عالم میں اس کی طرف دیکھا تھا، جلد ہی یہ سفر طے ہوا اور رکشہ ایک خوب صورت سے باغیچے کے دروازے پر رک گیا.....!!

سیما نے اتر کر کرایہ دیا اور لال باغ کی طرف دیکھنے لگی.....!! چونکہ شام کا وقت تھا، اس لئے یہاں کافی رونق دکھائی دے رہی تھی۔

وہ وہیں کھڑی کسی سوچ میں گم تھی کہ وحیدہ نے اسے ٹہوکا دیا:

"کہاں کھو گئیں.....؟"

"آں.....!!"

"اندر چلو....."

"ہاں..... چلو.....!!" سیما چونک کر بولی۔

جلد ہی دونوں باغ میں داخل ہو گئیں..... یہ کافی بڑا باغ تھا، جس میں ہر طرف گھانس اور قد آور گھنے درختوں کا سلسلہ تھا.....!!

جگہ جگہ بیٹھنے کے لئے بنچیں موجود تھیں..... ایک کونے میں کھانے پینے کے کچھ اسٹال لگے ہوئے تھے..... جہاں کافی گہما گہمی تھی.....!!

سیما چاروں طرف متلاشی نگاہوں سے دھک دھک کرتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھ رہی تھی.....!!

اس کی عجیب سی حالت تھی، وہ بے تابی سے اپنے زندگی کے ایک خاص اور اہم ترین فرد کو دیکھنے کے لئے آئی تھی، لیکن وہ دل ہی دل میں یہ دعا کر رہی تھی کہ خدا کرے یہاں نادر نہ دکھائی دے اور یہ وحیدہ کا جھوٹ ثابت ہو۔

کیونکہ اگر یہ بات سچ ثابت ہوتی، تو اس صورت میں سیما کے لئے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

وہ بے چین سی ہو کر وحیدہ کی طرف دیکھی۔

"مجھے تو نادر کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے.....!!"

یہ سن کر وحیدہ مسکرائی اور بولی:

"وہ اس ہجوم میں کہاں.....!! دل کی باتوں کو زبان تک لانے کے لئے سکون اور سناٹے کی جگہ درکار ہوتی ہے..... سامنے والی لائن میں دور درخت دیکھ رہی ہو.....؟"

یہ کہہ کر وحیدہ نے انگلی سے اشارہ کیا:

"ہاں.....!!" سیما کے منہ سے نکلا۔

"اسی کے عقب میں ایک بنچ پر دونوں موجود ہوں گے.....!! جاؤ..... تم دور سے دیکھ آؤ..... میں ادھر ہی ملوں گی.....!! جاؤ.....!! لیکن خبردار.....!! تم صرف دور سے ہی انہیں دیکھ کر واپس آ جانا.....!! شاباش.....!!"

سیما نے بے اختیار قدم آگے بڑھا دیئے..... وہ تیزی سے اسی جانب چل پڑی۔

(جاری ہے)

عجیب واقعات

نثار فاطمہ۔ بہلول پور

اکثر نا سمجھی اور غلط فہمی کی بنا پر انسان زندہ درگور ہو جاتا ہے، اس کی عمر پچیس سال تھی مگر دیکھنے والوں کو وہ صرف سات آٹھ سال کی لگتی تھی مگر حقیقت جب سامنے آئی تو.....

ایسے واقعات جسے دیکھ کر ہر آنکھ دنگ رہ جاتی تھی، ناقابل فراموش حقیقی روداد

قارئین کرام! میں جو دو کہانیاں آپ کو سنانے جا رہی ہوں میں نہیں جانتی کہ آپ لوگ کس حد تک میری بات کو سچ سمجھیں گے اور اس پر یقین کریں گے لیکن میں جانتی ہوں کہ میں جو بتانے جا رہی ہوں یہ بالکل سچ پر مبنی کہانیاں ہیں جنہیں میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھا اور اب بھی ان دو لوگوں کو دیکھتی ہوں، جب بھی میں اپنے گاؤں جاتی ہوں تو ان پر نظر پڑتی ہے۔ ان کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔

ان دو عورتوں کی کہانی جو آج میں بتاؤں گی لکھنے سے پہلے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی اور پھر ایک بزرگ سے میں نے سب پوچھا اور ساتھ میں لکھنا بھی اسٹارٹ کیا حقیقی نام کہانی میں لینے سے قاصر ہوں، اس کی معذرت چاہتی ہوں۔

بابا جی سے میں نے پہلی عورت کی کہانی پوچھی تو انہوں نے کچھ یوں بتانا شروع کیا۔

بابا جی کی زبانی۔

آج سے 25 سال پہلے محمد کفیل ایک خوبصورت لڑکی کو بیاہ کر اپنے گھر لے کر آیا وہ واقعی بہت خوبصورت تھی، خوبصورت ہونے کے ساتھ پڑھی لکھی بھی تھی۔ بڑوں کا احترام کرنے والی اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی اس کا نام شمع تھا۔ گھر میں آتے ہی اس نے سارے گھر کو سنبھال لیا۔

کفیل دن بھر ضروری کام کرتا تھا اور رات کو گھر واپس آتا۔

شادی کے دو سال بعد اللہ نے ان کو ایک بیٹے سے نوازا، سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا وہ دونوں اپنے بچے کے ساتھ اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔

ایک دن شمع کو اپنی ماں کی یاد ستانے لگی تو اس نے اس کا ذکر شوہر سے کیا تو شوہر نے بلا چوں چراں کے مان لیا اور کہا۔ ''دو دن بعد وہ اسے ماں کے گھر لے کر جائے گا۔ شمع کفیل کے ساتھ دو دن بعد اپنی ماں کے گھر جانے کے لئے تیار ہوگئی۔

اس کی ماں کے گھر کے پاس ایک پیپل کا بڑا پیڑ تھا جس کے نیچے جانے سے اس کی ماں اسے ہمیشہ روکتی تھی کیونکہ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ ''اس پر اثرات ہیں۔''

شمع اپنی ماں کے گھر تھوڑے دن رکنا چاہتی تھی۔ اس لئے کفیل اسے چھوڑ کر گاؤں واپس آ گیا۔

ایک دن بہت گرمی پڑی وہ گرمیوں کے دن تھے۔ شمع کی ماں چارہ لینے کے لئے کھیتوں میں گئی ہوئی تھی۔

چھوٹا بچہ گرمی سے نڈھال ہو کر رونے لگا، شمع اس کو چپ کرانے کی ہر کوشش ناکام رہی تو اس کا دھیان پیپل کے درخت پر گیا۔

ماں تھی ہر چیز کو بھول کر اس نے چارپائی درخت کے نیچے بچھا دی اور بچے کو لے کر وہاں بیٹھ گئی تھوڑی ہی دیر بعد بچہ سو گیا تو وہ بھی اس کے پاس لیٹ گئی۔

اس کی آنکھ تب کھلی جب اس کی ماں نے اسے آ کر اٹھایا۔ ''شمع اٹھ یہ تو نے کیا کر دیا بچے کے ساتھ پیپل کے نیچے سو رہی ہے میں نے تجھے کتنی بار سمجھایا تھا۔''

''اوہو اماں کیا بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو کچھ نہیں ہوا مجھے میں ٹھیک ہوں۔'' شمع کی ماں دونوں کو لے کر گھر کے اندر آ گئی اور شام کو نظر بھی اتار دی جس سے اس کی ماں کو یہ احساس ہو گیا کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔

خیر دونوں رات کو سو گئیں، رات کے کوئی 12 بجے شمع کی ماں کسی کی چیخوں کی آواز سے اٹھ کر بیٹھ گئی اس نے دیکھا کہ شمع بچے کو گود میں لئے چیخ رہی ہے اور اس کے بال بھی کھلے ہوئے تھے۔ اس کی ماں نے اس کے پاس جا کر دیکھا بچے کو لیا تو بچہ مر چکا تھا۔ بچے کے گلے پر ہاتھوں کے نشان تھے جیسے کسی نے گلہ دبا کر مارا ہو۔ اس کی ماں کو سمجھ آ گئی کہ وہ ہو گیا جس کا اسے ڈر تھا۔

شمع کا شوہر محمد کفیل جب یہ خبر سن کر وہاں گیا تو بچے کو دفنا دیا گیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ بیمار تھا۔

اس کے بعد شمع کو لے کر گھر آ گیا اب شمع کو اکثر دورے پڑنے لگے تھے اور انہیں دوروں کے دوران اس نے بچے کی موت کا بھی کفیل کو بتا دیا۔

لیکن کفیل اپنی بیوی کی حالت دیکھ کر چپ رہا سارے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ یہ پاگل پن کے دورے ہیں۔

اللہ نے شمع کو دو بیٹے دیئے جو بالکل ٹھیک تھے، پھر ایک بیٹا ہوا جسے وہ لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تو بچہ راستے میں ہی فوت ہو گیا پہلے بچے کا صدمہ تھا، پھر یہ سمجھا گیا کہ اس بچے کو شمع نے ہی مارا ہے۔

لیکن یہ سب تو کوئی اور ہی کر رہا تھا۔

لیکن لوگ شمع کے پاگل پن کو اس کا قصوروار سمجھتے تھے۔

اس کے بعد اس کی بیٹی پانچ سال کی ہو کر فوت ہو گئی۔ اس کی موت کی وجہ بھی کسی کو پتہ نہیں چلی۔

بیٹی کی موت کے بعد شمع گاؤں میں روتی پھرتی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ آتے جاتے لوگوں سے یہ کہتی کہ ''میں نے اپنے بچوں کو مارا ہے۔''

جبکہ ایسا کچھ بھی نہ تھا۔

کفیل نے شمع کی حالت دیکھی تو کنٹرول سے باہر تھی، پھر محلے والوں سے مشورہ کر کے شمع کو پاگل خانے میں داخل کروا دیا گیا۔

6 ماہ کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے سر کے بال مونڈھ دیئے گئے تھے۔ وہ اب نارمل تھی، دو ماہ تقریباً ٹھیک رہی، سب نے کہا کہ اب شمع ٹھیک ہو گئی ہے۔

لیکن پھر کچھ عرصے بعد اسے وہی دورے پڑنے لگے، اب تو وہ سگریٹ بھی پینے لگی تھی۔

کفیل نے ایک بار پھر اسے پاگل خانے بھیجا پھر 6 ماہ بعد واپس آئی تو اس بار تین، چار ماہ ٹھیک گزر جانے کے بعد دوبارہ اس کو دورہ پڑا، اب کی بار وہ کفیل کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتی۔ وہ جہاں کام پر جاتا وہاں اس کے پیچھے چلی جاتی اور کہتی۔ ''مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ، بیٹوں سے بھی یہی کہتی۔ لیکن وہ دیہاڑی دار بندے تھے، دل بھر انہیں کام کرنا پڑتا پھر رات کو کچھ کھانے کے لئے گھر لے کر آتے اور دن میں شمع کو پھر گھر میں بند کر جاتے جس سے وہ سارا دن گھر میں شور مچاتی رہتی اور یہ کہتی کہ ''مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

لوگ بھی زیادہ دھیان نہ دیتے کیونکہ سب اسے پاگل سمجھتے تھے اس دفعہ شمع کی حالت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے کفیل نے ایک بار پھر اسے پاگل خانے میں داخل کروایا، جس میں اس کی مدد گاؤں والوں نے بھی کی، کیونکہ کفیل کے پاس اب اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ یہ خرچ اٹھا پاتا۔

پھر شمع ایک سال پاگل خانے میں رہی لیکن کفیل اور اس کے بیٹے اسے لے کر نہیں آئے۔

ایک دن پاگل خانے سے کال آئی تو وہ گیا اور شمع کو ساتھ لے آیا۔

پاگل خانے والوں نے بھی اب شمع کو داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ہم اس کا علاج ہر طریقے سے کر چکے ہیں لیکن یہ کسی بھی طرح نارمل نہیں ہو رہی اور یہاں پر موجود دوسری عورتوں اور اسٹاف پر حملہ ہے جس سے وہ لوگ زخمی ہوئے ہیں، پھر شمع نے گاؤں میں بھی لوگوں پر پتھر برسانے شروع کر دیئے تھے، جو بھی اس راستے سے گزرتا تو وہ اس پر پتھر پھینکنا شروع کر دیتی۔

کفیل اسے گھر میں بند کر دیتا لیکن اس میں کبھی اتنی طاقت آ جاتی کہ کفیل بھی اس کے آگے کچھ نہیں کر پایا تھا بس وہ سارا دن کفیل سے پیسے مانگ کر سگریٹ پیتی رہتی، نہ کچھ کھاتی اور نہ کچھ پیتی تھی۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ اس نے بالکل چپ سادھ لی۔

اب اس میں طاقت نہیں، اس کا رنگ بالکل سیاہ ہو گیا ہے جیسے کوئی کالا کپڑا ہو، دانت سگریٹ پینے کی وجہ سے کالے ہو گئے اور سارا دن گلی میں لیٹی رہتی ہے۔

اور پھر ایک دن ایک اللہ والے بزرگ گاؤں میں آئے۔ سبز چغہ پہنے ہوئے تھے۔ وہ جب اس گلی سے گزرے تو دکھا کہ ایک جگہ شمع لیٹی تھی تو انہوں نے وہاں پر موجود دکان والے سے اس کے بارے میں پوچھا تو دکاندار نے ساری کہانی ان بزرگ کو بتائی تو انہوں نے بتایا کہ ''اس بچی کی زندگی تباہ کر ڈالی لوگوں کی ناسمجھی نے جو یہ کہتے ہیں کہ جن، بھوت، چڑیلیں نہیں ہوتیں یہ کوئی پاگل نہیں اس پر ایک چڑیل کا سایہ ہے جس نے اس کے بچوں کو مارا اور اس کی یہ حالت بنا دی اور تم لوگ اسے پاگل سمجھ کر اسے پاگل خانے میں ڈالتے رہے۔

لیکن افسوس کہ اب میں بھی کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ چڑیل اس کے اندر اپنا گھر بنا چکی ہے وہ اسے تب چھوڑے گی جب یہ اس دنیا سے چلی جائے گی۔

وہ دکان والا کفیل کو بھی بلا لایا تھا جس نے بابا جی سے کہا۔ ''کوئی راستہ تو بتائیں۔'' تو بابا جی نے ایک تعویذ بنا کر دیا کفیل کو کہ یہ تعویذ شمع کو سوتے ہوئے پہنانا تھا وہ جب اسے تعویذ پہنانے لگا تو پاس اس کا بیٹا چائے بنا رہا تھا چولہے میں لکڑی جلا کر۔

شمع نے اسے زور سے دھکا دیا تو اچانک تعویذ آگ میں گر گیا۔ پھر کوئی بھی شمع کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ اس کی اپنی ماں نے یہ سب چھپایا کیونکہ وہ بھی سب کچھ

جانتی تھی، اپنی بیٹی کا گھر بچانے کے لئے اپنی ساری زندگی تباہ کرلی۔ شمع جو سنہرا خواب لے کر بیاہ کر آئی تھی۔ مگر کوئی سکھ نہ دیکھ سکی۔

اس کی ایک چھوٹی سی غلطی سے سب کچھ تباہ ہوگیا۔

اب ہر وقت شمع گلی میں لیٹی رہتی ہے، نہ گھر جاتی ہے اور نہ کچھ کھاتی پیتی ہے اور نہ ہی اب کسی کو کچھ کہتی ہے۔

اس لئے کہا گیا ہے کہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو، اور بڑوں کی باتوں کو گرہ میں باندھ لیا کرو، کیونکہ بڑے زمانہ شناس ہوتے ہیں..... کاش کہ شمع اپنی ماں کی بات مان لیتی تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔

☆.....☆.....☆

یہ دوسری اور عجیب کہانی جسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس لئے اس پر یقین کرتی ہوں اور اس واقعہ کے بارے میں تصدیق بھی بہت سارے لوگوں سے کرچکی ہوں۔

یہ کہانی ایک ایسی لڑکی کی ہے جو اپنے بہن بھائیوں کی اکلوتی اور سب سے چھوٹی بہن تھی میں نے اپنے بچپن سے ہی اسے ایسے ہی دیکھا۔ تھوڑی سی باؤلی، کالی رنگت اور چھوٹے سے قد کی اور ہاتھ پاؤں ایسے سوکھے ہوئے جیسے کہ لکڑی پر سوکھی کھال چڑھا دی گئی ہو۔ ہم بچپن میں کھیلتے تو وہ اکثر دکان پر جاتی ہمیں نظر آتی یا پھر اپنی گڑیا کو لئے اپنے گھر کے دروازے کے باہر بیٹھی ہوتی تو ہم اس سے کہتے۔ ''سعدیہ ہمارے ساتھ کھیلوگی۔'' تو ہر بات پر ایک ہی جواب دیتی تھی۔ ''گھر سے باہر نکلوں گی تو اماں مارے گی، وہ گھر کا دھیان رکھنے کا کہہ کر گئی ہے۔''

کچھ بچے جان بوجھ کر اس کا مذاق اڑاتے تو وہ پتھر لے کر ان کے پیچھے بھاگتی۔ وہ کھاتی نہیں بلکہ سارا دن چائے پیتے گزر جاتا۔ اور دودھ کے لئے کوئی بیس مرتبہ دکان پر آتی۔ لوگ پوچھتے کہ ''سعدیہ اتنی چائے کیوں پیتی ہو۔'' تو جواب دیتی۔ ''پہلی بار تو پی رہی ہوں۔''

یہ تو ہوگیا سعدیہ کا تعارف، سعیدہ کوئی پیدائشی باؤلی نہیں تھی، بہت پیاری سی گوری رنگت، اس جیسی خوبصورت کوئی اور لڑکی محلے میں نہیں تھی۔

ایک دن ایک ریچھ والا گاؤں میں آیا اور پھر گاؤں سے ہوتا ہمارے محلے میں بھی آیا، سارے بچوں کے ساتھ سعدیہ بھی ریچھ کے کرتب دیکھنے کے لئے گھر سے آٹا لے کر آئی اور بچوں کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اور دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ریچھ کی نظریں سعدیہ پر جم گئیں، کسی صورت اس کی نظریں سعدیہ پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں، بلکہ وہ یک ٹک سعدیہ کو ہی دیکھے جارہا تھا اور پھر سعدیہ کے قریب جانے لگا تو اس کے مالک نے اسے اپنی طرف کھینچا لیکن وہ رسی چھڑا کر سعدیہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

وہ بچی تھی خوشی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ تب ریچھ نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اس چھوٹی معصوم بچی کے ہاتھ پاؤں چاٹنا شروع کردیئے، تھوڑی دیر بعد سعدیہ بے ہوش ہو کر اپنی جگہ گر پڑی تو ریچھ کے مالک نے اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر باندھ دیا۔ وہاں پر موجود سارے بچے چیختے چلاتے اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے تو ریچھ والا بھی ریچھ کو لے کر چلا گیا۔

پھر سعدیہ کی حالت بگڑنے لگی۔ سعدیہ کا رنگ کالا ہونے لگا، ہاتھ پاؤں ایسے سوکھنے لگے تھے جیسے کوئی ان سے خون نچوڑ رہا ہو، دماغی حالت بھی اس حادثہ کی وجہ سے خراب ہوگئی بالکل ایسے جیسے کوئی چھوٹا بچہ سات آٹھ سال کا ہو، پھر تین ماہ بعد ایک زبردست دورہ پڑتا، جس کی وجہ سے وہ دو تین دن تک ہوش میں ہی نہیں آتی، اس کی حالت دیکھ کر اس کی بوڑھی ماں روتی رہتی۔

سعدیہ جو کہ اب تیس سال کی ہوگئی ہے لیکن آج بھی وہ سات آٹھ سال کی بچی لگتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سعدیہ کو دیکھا ہے۔ میں اکثر اس کے لئے دعا کرتی ہوں۔ لیکن ایسا کیوں ہوا کسی کو نہیں معلوم، ہر کوئی اسے دیکھ کر افسردہ ہوجاتا ہے۔

ہم سمیت ہر کوئی یہی دعا کرتا ہے کہ اس کی جان اس اذیت سے چھوٹ جائے۔

روح کی چیخ

محمد خالد شاہان- صادق آباد

دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی برف باری ہونے کے بعد مزید برف باری ہورہی تھی جس نے سردی میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا، تمام لوگوں کا گھر سے نکلنا دوبھر ہورہا تھا لیکن.....

دل و دماغ میں خوف کی..... ہلچل مچاتی اور رگوں میں خون منجمد کرتی..... تحیر انگیز کہانی

یہ دسمبر کی سرد رات تھی اس سے دو دن پیشتر شدید برف باری ہوچکی تھی جس نے سردی میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا برف پورے اڑتالیس گھنٹے سے گر رہی تھی جس کی وجہ سے آمد و رفت میں شدید دشواریاں پیش آرہی تھیں اس وقت صبح پانچ بجے سے بادلوں میں روپوش ہوچکا تھا اور اب اٹھنے والے تھے لیکن مین روڈ کو دیکھ کر یوں محسوس ہورہا تھا جیسے رات کے دو بج چکے ہوں کہ اچانک ایک تنگ گلی سے ایک عورت نمودار ہوئی اور مین روڈ کے فٹ پاتھ پر چلنے لگی اور جب وہ چوک پر پہنچی تو اچانک سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کے ٹائر چیخے گاڑی اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر آکر رک گئی، عورت کی آنکھیں تیز لائٹ کی روشنی سے بند ہوگئی تھیں اور چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے تھے۔

گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک دبلا پتلا اور دراز قد

آدمی باہر نکلا اس نے آسمانی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا عورت کے قریب آیا اور کہنے لگا۔
”اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو آپ مسز فراز ہیں۔“

عورت کی آنکھوں میں بھی شناسائی کے آثار ابھر آئے، آپ نے مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی، ڈاکٹر صاحب سنائیں اس وقت کہاں گھوم رہے ہیں۔

میں اپنے آفس سے آرہا ہوں، آپ کو سنسان سڑک پر پیدل چلتے ہوئے دیکھ کر سوچا شاید آپ کی کوئی مدد کرسکوں مگر آپ اتنی سرد اور خوفناک رات میں کہاں گھوم رہی ہیں، میں اپنی خالہ کے پاس ایک ضروری کام سے آئی تھی وہاں دیر ہوگئی اور ہماری گاڑی ورکشاپ گئی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔

میری گاڑی میں بیٹھئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔

”شکریہ ڈاکٹر صاحب مسز فراز نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں اس کا تذکرہ ان سے ضرور کروں گی اور وہ سن کر یقیناً خوش ہوں گے اس میں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں یہ تو میرا فرض ہے۔ فراز میرے اچھے دوستوں میں سے ایک ہے اس کی بیوی کو پیدل چلتے ہوئے دیکھ کر مدد نہ کروں تو یہ ہماری دوستی کی توہین ہوگی۔ فراز کافی دنوں سے نظر نہیں آرہا ہے کہاں ہے آج کل، وہ کسی سرکاری کام سے باہر گئے ہوئے ہیں۔

گاڑی چوک سے واپس گھوم کر اسی سڑک پر دوڑ رہی تھی پھر ڈاکٹر نے ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا دیا اور کہا۔

آپ کا کسی خون آشام سے واسطہ تو نہیں پڑا اگر ایسا ہوتا تو بات دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتا اور مسز فراز مسکرا دیں۔ ڈاکٹر کہنے لگا میری والدہ نے نفسیات پر چند کتابیں لکھی ہیں اس وقت ان کی عمر 100 سال کے نزدیک ہے اگر آپ انہیں دیکھیں تو حیران رہ جائیں گی، اتنی زیادہ عمر میں وہ اس قدر توانا نیک اور پاکیزہ خاتون ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنی والدہ کا اس انداز میں تذکرہ کرکے میرے دل میں فوراً ملنے کا اشتیاق پیدا کردیا ہے کب ملائیں گے اپنی والدہ سے، جب آپ کو فرصت ملے میرے ساتھ چلیئے وہ آپ سے مل کر یقیناً خوش ہوں گی، اگر انہوں نے پسند کیا تو جب تک فراز نہیں آتے ان کے ساتھ میرا وقت اچھا گزرے گا میں تقریباً سارا دن فارغ ہوتی ہوں ٹھیک ہے مسز فراز آپ کل ہی کسی وقت تشریف لے آیئے، مجھے شاید اتنا وقت نہ مل سکے آپ دو بجے میرے دفتر تشریف لے آئیں، میں آپ کو ساتھ لے چلوں گا بہت اچھا ڈاکٹر صاحب کل ٹھیک دو بجے آپ کے دفتر پہنچ جاؤں گی، ڈاکٹر کا دفتر آفندی بلڈنگ کی دوسری منزل پر واقع تھا دو بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے، ڈاکٹر اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑا دیکھ رہا تھا کھڑکی کی طرف غور سے دیکھتے اسے دیکھ لینا ناممکن تھا کیونکہ اس کا جسم کھڑکی کے دروازے سے نکلتے ہوئے ریشمی پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا ٹھیک دو بجے ایک ٹیکسی کھڑکی کے عین نیچے آکر رکی اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر مسز فراز باہر نکلی اور ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر فوراً سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سگریٹ نکال کر سلگالیا پھر میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں کی ورق گردانی کرنے لگا چند لمحوں بعد مسز فراز کے قدموں کی آواز آئی اور پھر جھگڑا اسی کے ساتھ بات کرنے کی آواز سنائی دی وہ چپڑاسی سے ڈاکٹر کے بارے میں پوچھ رہی تھی، چپڑاسی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں مسز فراز کا ملاقاتی کارڈ تھا۔ ڈاکٹر نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی، چپڑاسی سے مسز فراز کو اندر بھیجنے کے لئے کہا دوسرے ہی لمحے مسز فراز پردہ ہٹا کر ڈاکٹر کے سامنے آ کھڑی تھیں، آپ دس منٹ پہلے آگئی ہیں ڈاکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا دراصل میں وقت کا سختی سے پابند ہوں، پورے دو بجے تک مجھے یہ کہانیوں کی فائل مرتب کرنی ہے۔ بہر حال آپ آگئی ہیں تو دس منٹ بیٹھیں میں دو بجے کے بعد آپ کو اپنی والدہ سے ملانے لے چلوں گا۔ مسز فراز کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی یقیناً اس کی وجہ ڈاکٹر کی سرد آواز تھی جو اس لمحے مسز فراز کو اپنی ہڈیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی مگر اس نے فوراً ہی اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس خوف کو جھٹک دیا پورے دو بجے ڈاکٹر نے فائل بند کردی اور مسز فراز کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ میرا کام ختم

ہوگیا ہے اب چلیں مسز فراز نے اس کے کہنے پر کرسی چھوڑ دی ڈاکٹر کہنے لگا شہر کے اندر بھی میری جائیداد ہے۔

اور اب حال ہی میں، میں نے شہر سے باہر ایک دوسری عمارت خریدی ہے جس میں آج کل میری رہائش ہے والدہ صاحبہ کو تو وہ عمارت بہت ہی پسند ہے کیونکہ فطرتاً وہ تنہائی پسند واقع ہوئی ہیں شور وغل سے انہیں شدید نفرت ہے وہ زیادہ تر وقت عبادت میں گزارتی ہیں، بڑی مذہبی قسم کی عورت ہیں۔ ڈاکٹر کی گاڑی نیچے موجود تھی مسز فراز کیلئے اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا جب وہ اندر بیٹھ گئیں تو ڈاکٹر نے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ اور گاڑی کو موڑ کر سڑک پر چھوڑ دیا۔

جانے کیوں مسز فراز کو رہ رہ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس نے زبردست حماقت کی ہو وہ سوچ رہی تھی اس کو اس حد تک اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا اس میں شک نہیں کہ میرے شوہر کے اس سے رسمی قسم کے مراسم ہیں اور میں ان کے ساتھ ایک مرتبہ پہلے بھی اس کے دفتر میں آکر اس سے مل چکی ہوں لیکن اس معمولی سی واقفیت کے بنا پر مجھے اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا اب اگر اس کی نیت خراب ہو جائے تو میں اس کا کیا بگاڑ سکتی ہوں اس کے ذہن میں ایک انجانا سا خوف سر ابھار رہا تھا۔

آخر اس نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھال کر سوچا ڈاکٹر انسان ہی تو ہے کھا تو نہیں جائے گا اگر اس نے مجھ سے کوئی گستاخی کی تو میرے بازو اس قدر کمزور نہیں ہیں کہ میں اپنی عزت اس جیسے مریل آدمی کے حوالے کر دوں، میں آخری دم تک جدوجہد کروں گی، وہ ان ہی خیالات میں گم تھی اور گاڑی تارکول کی چکنی سڑک پر پھسلتی جارہی تھی۔ مسز فراز نے اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات کے لئے مکمل طور پر تیار کر چکی تھی شہر سے باہر نکل کر ڈاکٹر نے گاڑی ایک کچے راستے پر ڈال دی مسز فراز نے چونک کر پوچھا ادھر کہاں جا رہے ہیں اس کی آواز میں لرزش تھی اس کے اعصاب پر چھایا ہوا خوف مزید گہرا ہوگیا ڈاکٹر ہنس پڑا اس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی وہ سامنے میری کوٹھی ہے مسز فراز بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں مسز فراز خاموش ہوگئیں، وہ مزید سوال کر کے خود کو خوف زدہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ گاڑی درختوں میں چھپی ایک عمارت کے گیٹ پر جا کر رک گئی۔ مسز فراز نے خوفزدہ نظروں سے آس پاس دیکھا اس تنہا اور خاموش عمارت کے سوا دور دور تک کسی کا وجود نہ تھا ڈاکٹر نے گاڑی کو ایک سائیڈ پر کھڑا کرنے کے بعد ڈاکٹر نیچے اتر آیا اور پچھلا دروازہ کھول کر مسز فراز سے اترنے کے لئے کہا۔

کیا یہاں پر چوکیدار نہیں ہے مسز فراز نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا اور آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی سناٹے میں دستک کی آواز دور تک سنائی دے رہی تھی، مگر اندر خاموشی تھی ڈاکٹر نے دوبارہ قدرے زور سے دستک دی اسی لمحے اندر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی جو دروازے کے قریب آتی چلی گئی پھر دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا اندر خاصی تاریکی تھی اور اس تاریکی میں سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک عجیب سے چہرے نے دروازے سے دیکھا اسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ عورت ہے یا مرد ڈاکٹر کے ہمراہ مسز فراز کو دیکھ کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اس کے جسم پر زنانہ لباس دیکھ کر کر مسز فراز اسے عورت سمجھنے پر مجبور ہوگئی ورنہ اس کے اوپر والے ہونٹ خاصے لمبے اور موٹے تھے اور کان بڑے بڑے اور ناک لمبوتری تھی، آنکھیں ترچھی تھیں۔ مسز فراز کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوگئی مسز فراز کو اس کے چہرے پر غیر فطری پن کا احساس ہوا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی اس عورت کے چہرے اور ڈاکٹر کے چہرے پر غیر محسوس حد تک مشابہت تھی، جس سے مسز فراز نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی ماں ہے اسے دیکھ کر اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی اور اس بات کی منتظر رہی کہ ڈاکٹر اس کا تعارف اس کی والدہ سے کرائے گا مگر ڈاکٹر نے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اس کی والدہ مسز فراز کی طرف بڑھی تو ڈاکٹر جلدی سے درمیان میں آگیا اور پھر اسی ترتیب سے چلنے لگے۔

اسی طرح چلتے ہوئے وہ راہداریوں سے گزر کر ایک کمرے میں داخل ہوگئے۔ مسز فراز کو پوری عمارت سے

وحشت ہو رہی تھی خاص کر اس عورت سے تو وہ سخت خوفزدہ تھی اس کا دیکھنے کا انداز اتنا خوفناک تھا کہ مسز فراز کو اپنے وجود میں چیونٹیاں سی چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں تاہم اس نے ابھی تک خود کو سنبھال رکھا تھا اور کوشش کر رہی تھی کے اس کی کسی حرکت سے بزدلی کا اظہار نہ ہو کیوں کہ ڈاکٹر ایک مرتبہ پہلے بھی یہ کہہ کر اسے بزدلی کا طعنہ دے چکا ہے کہ آپ کا دل بہت کمزور ہے ڈاکٹر کی اس بات کی اس نے تردید کر دی تھی کہ اب وہ خوف کا اظہار کر کے خود کو چھوٹا ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی ورنہ حقیقت میں وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب ڈاکٹر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ خدا آج خیریت سے گھر پہنچا دے تو پھر کسی غیر شخص پر اس قدر اعتماد کرنے کی حماقت کبھی بھی نہ کروں گی مگر اب دعا قبول ہونے کا وقت گزر چکا تھا یہ لوگ جیسے ہی کمرے میں پہنچے وہ منحوس عورت مسز فراز کی طرف اس انداز میں جھپٹی جیسے چیل مرغی کے بچے پر پر جھپٹتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر مداخلت کرتا اس کے تیز پنجے مسز فراز کے بازو میں اتر گئے تو ڈاکٹر نے جلدی سے اس کے سر کے بال پکڑ کر اسے جھٹکا دیا پھر تو جیسے اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا وہ اچھل کر اٹھی اور دوبارہ پوری شدت سے مسز فراز پر جھپٹ پڑی اس مرتبہ اس کی شکل دیکھ کر مسز فراز کی چیخ نکل گئی کیوں کے اس کے چہرے کے نقوش خوفناک حد تک بدل گئے تھے، کان کھڑے ہو گئے تھے ترچھی آنکھیں اس قدر سرخ ہو گئی تھیں جیسے انگارہ۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئی تھیں دانت خدایا ہونٹ اس حد تک بند ہو گئے تھے کہ ان کا وجود ہی ختم ہو گیا تھا اور دانت مسوڑھوں کے اوپر تک نظر آرہے تھے۔

اگر درمیان میں ڈاکٹر نہ آجاتا تو وہ مسز فراز کو ختم کر دیتی ڈاکٹر کو اس سے الجھتا دیکھ کر مسز فراز راہداری میں بھاگیں تا کہ دروازہ کھول کر باہر نکل سکیں مگر فوراً ہی اسے پتہ چل گیا کہ دروازہ بند ہے اس کے ہینڈل کو پکڑ کر کئی بار جھٹکے دیے اور پھر زور زور سے چیخنے لگی کوئی ہے کوئی ہے خدا کے لیے میری مدد کرو مجھے اس عمارت سے نکال دو۔

کافی دیر تک چیختی رہی، پھر زار و قطار رونے لگی ابھی اس کو اندر سے اس عورت کی وحشت انگیز چیخوں کے سوا بھی سنائی نہ دیا۔

ڈاکٹر اسے ایک کوٹھری کی طرف کھینچ رہا تھا اور بے تحاشا چیخ رہی تھی اس نے ڈاکٹر کی کلائی پر کافی جگہ کاٹ لیا اب ڈاکٹر نے اس کی گردن مضبوطی سے پکڑ لی اس کے باوجود خود وہ باؤلے کتے کی مانند بار بار منہ پھیر ڈاکٹر کو کاٹ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوٹھری کے قریب کر ڈاکٹر نے اسے زور سے اندر گرا دیا اور جلدی سے سلاخوں والا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا کوٹھری سے بڑی نفرت انگیز بدبو آرہی تھی اندر انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دروازے کی سلاخیں پکڑ کر چیخنے لگی مسز فراز بند دروازے کے پاس کھڑی فرار کیلئے کوئی راستہ تلاش کر رہی تھی کہ ڈاکٹر اسے طرف آتا دکھائی دیا وہ اسے دیکھ کر راہداری کے بائیں جانب بھاگ کھڑی ہوئی اور سب سے پہلے آنے والے دروازے زور سے دھکا دیا دروازہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا مسز فراز ہی جھونک میں اندر جا گری اور پھر لڑھکتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

یقیناً وہ تہہ خانہ تھا اس نے اوپر دیکھا ڈاکٹر دروازے کے دونوں کناروں پر ہاتھ رکھے بڑے خوفناک انداز اسے دیکھ رہا تھا تہہ خانے میں اندھیرا تھا اور عجیب سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی مسز فراز کو گرنے شدید چوٹ آئی تھی مگر وہ تکلیف کو نظر انداز کر کے ایک دم کھڑی ہوئیں، کوئی دوسرے ہی لمحے پھر کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اس آنکھوں کے سامنے کالے کالے دائرے گردش کرنے اور اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا اس سے پہلے چکرا کر گر پڑتی ڈاکٹر نے سیڑھیوں سے چھلانگ لگا کر تھام لیا وہ بے ہوش ہو کر ڈاکٹر کے ہاتھوں میں جھول ڈاکٹر اسے اٹھا کر تہہ خانے سے باہر لے آیا۔ تہہ خانے دروازہ بند کیا اور مسز فراز کو لے کر ایک ایسے کمرے میں جس کہ اندرونی حالات کسی آپریشن تھیٹر کے کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی ٹیبل پڑی ہوئی تھی کے ساتھ ایک چھوٹی ٹیبل تھی جس پر تقریباً تمام اوزار تھے بڑی ٹیبل کے اوپر بڑے بڑے دو شیڈ لٹک رہے

ان میں تیز روشنی کے بڑے بڑے 2 بلب لگے ہوئے تھے اس ٹیبل کے دونوں طرف لوہے کے ہک لگے ہوئے تھے جن پر ریشم کی ڈوری بندھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے مسز فراز کو لا کر اسی ٹیبل پر لٹا دیا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھنے لگا اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سوئچ آن کیا جس سے ٹیبل پر لٹکتے ہوئے شیڈو میں بلب جل اٹھے، جن کے جلتے ہی عجیب سی منمناہٹ کی آواز گونجنے لگی کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا ڈاکٹر نے دیوار میں بنی ہوئی الماری کا دروازہ کھول کر اس کے اندر سے شیشے کا جار نکالا جس کے ساتھ بہت سے ٹیوب اور تار لٹک رہے تھے ڈاکٹر نے مسز فراز کے چہرے پر اس طرح سے فٹ کر دیا جیسے کہ خلائی بازوں کے چہرے پر چڑھا ہوتا ہے پھر الماری سے ایک چکور بکس نکالا، بکس کے ایک کونے میں ڈائل بنا ہوا تھا جس پر تیس تک ہندسے بنے ہوئے تھے اور ایک باریک سے سرخ رنگ کی سوئی باکس کے ہلنے کی وجہ سے دیر تک تھرک رہی تھی یقیناً وہ باکس کسی قسم کا میٹر تھا۔

ڈاکٹر نے مسز فراز کے چہرے پر چڑھے ہوئے تمام تار اس میٹر کے ساتھ منسلک کر دیئے چند منٹ مسز فراز کے سینے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا پھر اس کے گریبان کو ایک جھٹکے سے کھینچا باریک کاٹن کا کرتا ہلکی سی چر کی آواز کے ساتھ پھٹ گیا۔ جھٹکا لگنے سے مسز فراز کو ہوش آ گیا تو آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی، زور لگانے سے مضبوط ریشم کی ڈوری اس کی جلد میں اتر گئی، ابھی وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر چہرے پر شیشے کا خول چڑھا ہوا تھا اس وجہ سے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی تاہم اس کی دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ہونٹوں سے نکلنے والی بات کو سمجھانا کچھ زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ ڈاکٹر اس کی طرف توجہ دیئے بغیر اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک بھرپور نظر اس کے سراپے پہ ڈالی اور پھر دھڑکتے ہوئے دل کو تکنے لگا چند لمحے دھڑکنوں کا جائزہ لینے کے بعد ٹیبل پر پڑی ہوئی سرنج منتخب کی جس کے پیچھے ایک پلاسٹک کی نلکی لگانے کے بعد ٹیوب کو دو تین مرتبہ دبا کر کارکردگی کا جائزہ لیا پھر سرنج پکڑ کر مسز فراز کے دھڑکتے ہوئے دل کو ایک مرتبہ پھر غور سے دیکھا اور بغل والی سائیڈ سے سرنج کی سوئی میں مسز فراز کی پسلیوں کے درمیان اتار دی باریک اور لمبی سوئی اس کی پسلیوں سے گزر کر دل کے قریب جب خون کی ایک شریان میں پیوست ہو گئی تو مسز فراز اس لمحے تکلیف کی شدت سے تڑپ کر دوہری ہو گئی اس کی ہڈیاں کڑکڑا گئیں، آنکھیں اُبل پڑیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ ڈاکٹر نے پمپ کرنے والی ٹیوب کو دبا کر آہستہ سے چھوڑا تو ابلتا ہوا سرخ سرخ خون سرنج سے گزر کر پلاسٹک کی تھیلی سے ہوتا ہوا دوسری جانب پڑی ہوئی بوتل میں گرنے لگا، یہی وہ لمحہ تھا جب میٹر کی سرخ سوئی نے تھرکنا شروع کر دیا جیسے اس میں اچانک جان پڑ گئی ہو یقیناً اسی لمحے مسز فراز کی روح اس کے جسم سے خارج ہو کر میٹر میں جمع ہونے لگی تھی جس سے میٹر کی سوئی تیزی سے تھرکتی ہوئی اوپر اُٹھنے لگی تھی۔ پہلی بوتل خون سے بھر گئی تو ڈاکٹر نے پائپ کا سرا دوسری بوتل میں لگا دیا۔

مسز فراز کا رنگ زرد ہوتے ہوتے بالکل سفید ہو گیا اور میٹر کی سوئی آہستہ رفتار سے اُٹھتی ہوئی 25 کے ہندسے پر تھرکنے لگی ابھی خون کا ایک ایک بوند گر رہا تھا چند لمحوں بعد وہ بھی ختم ہو گیا مسز فراز کے جسم میں میں دوڑتے ہوئے خون کا آخری قطرہ تک ان بوتلوں میں جمع ہو چکا تھا تمام خون نکل آنے کے بعد میٹر کی سوئی ایک جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے خون کی بوتلوں پر کارک لگا کر الماری میں احتیاط سے رکھ دیا جہاں ایسی دوسری بوتلیں خون سے بھری ہوئی تھیں، الماری کو لاک کرنے کے بعد مسز فراز کی لاش سے سوئی نکالی اور اسے پانی سے بھری ہوئی ٹرے میں رکھ دیا پھر میٹر کو چیک کرنے لگا اس کے چند اسکرو ٹائٹ کیئے اور تمام نالیاں اور تار اس سے جدا کر دیئے، میٹر کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد خول اس کے سر سے اتار دیا رسی بھی کھول دی جس سے اس کا جسم بندھا ہوا تھا اس کام سے فارغ ہو کر اس نے چھری اٹھائی اور کسی ماہر قصاب کی طرح اس کے دونوں رانوں سے بہت سا گوشت کاٹ کر ٹرے میں رکھ دیا۔

آخری نظر لاش پر ڈال کر مطمئن انداز میں کوٹھری کی طرف بڑھنے لگا جس میں اس نے اپنی والدہ کو بند کر دیا تھا۔

ڈاکٹر کو دیکھتے ہی وہ بے تاب ہو کر چیخنے اور اچھلنے لگی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا تو دیوانہ وار اس کمرے کی طرف بھاگی جہاں مسز فراز کی لاش موجود تھی، جاتے ہی لاش پر بھوکے بھیڑیے کی طرح ٹوٹ پڑی اور اس کا گوشت دانتوں سے نوچنے لگی جب پیٹ بھر گیا تو لاش کو گھسیٹ کر کوٹھری میں لے گئی، اور لاش کو بغور دیکھنے لگی۔

اور ڈاکٹر اتنا لذیذ اور خوبصورت گوشت اسے بڑی مدت کے بعد کھانے کو ملا تھا اسے اپنی بے بسی پر اکثر رحم آنے لگتا تھا وہ ایک انتہائی احتیاط قسم کا آدمی تھا اس کی خون آشام زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا جب اس نے براہ راست کسی انسان پر ہاتھ ڈالا تھا ورنہ وہ ہمیشہ دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانے والا شکاری تھا اس کی بزدلی کی وجہ اسے اکثر وہ پیاس کا سامنا کرنا پڑتا تھا مسز فراز کو اسی رات اغوا کر سکتا تھا جب وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر گئی تھی مگر اس کی محتاط فطرت نے اس کو یہ خطرہ نہ مول لینے دیا تھا ایسے یہ خطرہ تھا مسز فراز کی مرضی کے بغیر اسے لے جانے کی کوشش کی تو وہ چیخنا شروع کر دے گی اس کے تصور میں لکڑی کا کھونٹا گھوم گیا وہ اس کھونٹے سے ہر لمحہ خوفزدہ رہتا تھا جو پسلیوں کو توڑ کر دل میں اتر جایا کرتا ہے اس کے ناتواں کندھوں پر اس کی بوڑھی ماں کا بوجھ بھی تھا جس کیلئے اسے کسی نہ کسی طرح گوشت کا بندوبست کرنا پڑتا تھا ڈاکٹر نے اعلیٰ تعلیم اسی لئے حاصل کی تھی کہ انسانوں کے قریب رہ کر ان کی فطرت کا مطالعہ کیا جا سکے کہ اس نے انسانوں کے قریب رہ کر جو اندازہ قائم کیا تھا وہ اس کی ہمت کرنے کے لیے کافی تھا اسے زندہ رہنے کے لیے ہر قدم نہایت ہی سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑ رہا تھا آخر اس نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا جس سے اس کے لیے خطرات کافی حد تک کم ہو گئے تھے مگر اس کا وہ طریقہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا تھا اس نے ایک تازہ قبر کھود کر ایک مضبوط شخص کا مردہ نکالا اور اسے ایک ایسے سیال کیمیکل میں ڈال دیا جس سے اس کا گوشت گلنے سڑنے سے محفوظ ہو گیا تھا تھا پھر اس نے ایک ایسا میٹر تیار کیا جس میں ہر نئے شکار کی روح کو قید کر لیتا گوشت کھانے اور خون پینے کے بعد وہ اس روح کو مردہ جسم میں داخل کرتا تھا اور اس کے ذریعے شکار کھیلتا تھا اسے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا تھا اس طرح اس کے پہلے خطرات بہت کم ہو گئے تھے مگر اس کا یہ طریقہ پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکا تھا روح کے ساتھ ہر مرتبہ تقریباً ایک خون کی بوتل جسم میں داخل کرنے کے بعد وہ زندہ ہوتا تھا اس کے پکڑے جانے کا خطرہ ہرگز نہ تھا جیسے ہی وہ خود کو خطرے میں محسوس کرتا تھا سانس بند کر لیتا تھا اس کے سانس بند کرتے ہی جسم پر دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتا اور دوبارہ مردہ حالت میں اسی جار میں جا گرتا جس میں سیال کیمیکل بھرا ہوتا تھا اس کے ناکام واپس آنے پر ایک گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ جس سے ڈاکٹر کو اندازہ ہو جاتا کہ وہ ناکام واپس لوٹ آیا ہے زیادہ تر اسے ناکامی کا ہی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جس سے ڈاکٹر کی شدید محنت کے ساتھ ایک بوتل خون بھی ضائع ہو جاتی، ڈاکٹر کے لئے اس کی حیثیت جوئے کے برابر تھی، اگر کامیاب ہوا تو وہ بہت ہی خون حاصل ہوتا اور ناکام ہوا تو ایک بوتل جوئے میں ضائع ہو گئی، جوئے میں وہی لوگ جیتتے ہیں جو خوش قسمت ہوں ڈاکٹر بدقسمت تھا لہٰذا وہ ہارتا اس کے پاس خون کی مقدار کم ہوتی گئی جسے وہ بڑی احتیاط سے استعمال کرنا چاہتا تھا جیسی کہ مسز فراز کو اغوا کرنے کے بعد اسے خود رکھ لینا پڑا تھا بڑی مدت کے بعد ڈاکٹر کو لذیذ اور خوبصورت گوشت نصیب ہوا تھا کیوں نہ ہوتا یہ ڈاکٹر کا اپنا انتخاب تھا، دوسرے کے لائے ہوئے جسم اکثر گوشت سے خالی ہوتے، خون بھی بہت کم نکلتا تھا ڈاکٹر کے خیال کے مطابق کسی کو قریبی اسپتال سے اٹھا لیتا تھا اس وقت اس کے سامنے مسز فراز کے تنے ہوئے گوشت کے بھونے ہوئے تکے رکھے تھے اور جگ میں سوڈا خون بھرا ہوا تھا۔ جس سے گیس خارج ہو رہی تھی وہ بڑے مسرور انداز میں تکے کھا رہا تھا اور خون پی رہا تھا۔

دوسری طرف کوٹھری میں بیٹھی ہوئی اس کی والدہ کسی گہری سوچ میں گم تھی وہ بڑی دیر سے گھٹنوں میں سر دیئے یا آتش دان کے قریب بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی اس کی حرارت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا وقت بھی گزرتا چلا جا رہا تھا ڈاکٹر کے کمرے کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹ چکا

تھا اس کی ماں کوٹھری میں ٹہلنے لگی وہ بار بار ہتھیلیوں کو مل رہی تھی اس کے ہونٹ خشک تھے اور حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا تقریباً دو بجے کے قریب جب اسے مکمل یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر گہری نیند سو گیا ہے تو وہ کوٹھری سے نکلی اور دبے پاؤں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو گئی اس نے ڈاکٹر کی جیب سے چابی تلاش کی مگر اسے ناکامی ہوئی اس نے ڈاکٹر کے سرہانے دیکھا چابی وہاں بھی نہ تھی۔

اچانک اس کی نظر ٹیبل کے قریب رکھے ہوئی میز پر پڑی اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی ابھی زیرو واٹ کے بلب کی روشنی میں جگ کی تہہ میں خون کی تھوڑی سی مقدار نظر آ گئی تھی اس نے جلدی سے جگ اٹھایا اور اسی طرح سے ہونٹوں سے لگا لیا ایک منٹ کی بھی دیر ہو گئی تو ڈاکٹر اس سے چھین لے گا، خون دو گھونٹ سے زیادہ نہ تھا ہونٹوں سے علیحدہ کرنے کے بعد وہ جگ کو انگلی سے صاف کر کے انگلی چاٹنے لگی جگ کو اچھی طرح سے صاف کرنے کے بعد ٹیبل پر رکھ دیا اور گلاس اٹھا کر اسے بھی انگلی سے کھرچنے لگی اسی وقت شیشے کا جگ ٹیبل سے نیچے گر پڑا اور چھناکے کی آواز سے ٹوٹ کر فرش پر بکھر گیا۔

دھماکے کی آواز پیدا ہونے سے ڈاکٹر کی آنکھ کھل گئی، اس نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا سوئچ آن کیا اور اپنی ماں کو گھورنے لگا اس کا دل پوری طرح سے دھڑک رہا تھا اور چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے وہ چیخا اس کی ماں رحم طلب نظروں سے اس کی طرف تکنے لگی وہ انگلیوں پر لگا ہوا خون چاٹ رہی تھی کیا بات ہے ماں کیوں آئی ہو، ڈاکٹر نے سختی سے پوچھا صرف چند گھونٹ خون پلا دو میرا حلق خشک ہو رہا ہے جان نکل رہی ہے۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں ہمدردی کے آثار پیدا ہو گئے مجھے افسوس ہے میں تمہاری پیاس نہیں بجھا سکتا بہاری کی بے وقوفی نے ہمیں سخت مفلوک الحال بنا دیا ہے میں نے زبردست رسک لے کر اپنی کوششوں سے خوراک پیدا کی ہے تم فی الحال ابھی گزارا کرو اور پانی پی کر حلق کو تر کرنے کی کوشش کرو، جلد ہی ہم خود کفیل ہو جائیں گے پھر تم جی بھر کے پیاس بجھا لینا۔

ایسا وقت میری موت کے بعد آئے گا میں پیاس سے مر رہی ہوں خدا کے لیے مجھے صرف چند گھونٹ دے دو۔ اس وقت تو ناممکن ہے میرے پاس خون کا اتنا ذخیرہ نہیں ہے کہ میں تم کو شریک کر سکوں تمہیں کل تک صبر کرنا ہوگا صبح بہاری کو سخت اذیت دوں گا اور اسے مجبور کروں گا کہ وہ اپنا کام بہتر طریقے سے انجام دے۔

میں ایک منٹ بھی صبر نہیں کر سکتی تم دیکھ نہیں رہے میری جان نکل رہی ہے میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا میرے کمرے سے نکل جاؤ او آخری الفاظ استعمال کرتے ہوئے ڈاکٹر کا لہجہ سخت ہو گیا جس کو محسوس کر کے اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ رونے لگی پھر اپنی کلائی پر زور سے کاٹ لیا اس کے دانت اپنے ہی گوشت میں اتر گئے وہ اپنا خون چوستی رہی اور روتی ہوئی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اس کے باہر نکل جانے کے بعد ڈاکٹر نے روشنی گل کر دی اور مسہری پر دراز ہو گیا۔

صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ بیدار ہو گیا سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ راہداری کے دائیں جانب بنے ہوئے تہہ خانے میں اتر کر اس کی بتی روشن کی اور اس لاش کو دیکھنے لگا جسے دیکھ کر مسز فراز کی چیخ نکل گئی تھی لاش برہنہ تھی اور شیشے کے ایک بڑے جار میں پڑی ہوئی تھی جس میں کسی قسم کا گاڑھا مادہ بھرا ہوا تھا ڈاکٹر نے لاش کو باہر نکال کر کندھے میں ڈال لیا اور اسے لے کر تہہ خانے سے باہر نکل آیا اس پر کیمیکل کا گاڑھا مادہ چپکا ہوا تھا۔

گرم پانی سے غسل دینے کے بعد اس کی جلد صاف کی اور جسم چمکدار نکل آیا غسل کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے دوبارہ اٹھا لیا اس مرتبہ اس کا رخ آپریشن تھیٹر کی طرف تھا چند ہی لمحوں بعد ایک لاش آپریشن ٹیبل پر بندھی پڑی تھی۔

آپریشن تھیٹر کے آتش دانوں میں دونوں طرف صرف آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے جس سے کافی گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ لاش کی موجودہ حالت بہت مسز فراز سے ملتی جلتی تھی ڈاکٹر زور زور سے لاش کی مالش کرنے لگا۔ دو گھنٹے کی شدید محنت کے بعد لاش نے حرارت جذب کی اور میٹر کی

سوئی دھیرے دھیرے نیچے کرنے لگی۔ مسز فراز کی روح دھیرے دھیرے اس لاش میں اتر رہی تھی اور اس میں ہلکا ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا جا رہا تھا اب اس کا سینہ باقاعدہ اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا جس سے سانس کی آمد و رفت کا پتہ چلتا تھا۔ جب میٹر سر پر پہنچ گیا تو ڈاکٹر نے میز سے نلکیاں اور تار جدا کر لئے اور خول بھی اس کے چہرے سے ہٹا دیا اب ٹیبل پر لاش کی جگہ ایک زندہ انسان تھا جو آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا چند لمحے تک اس کی آنکھیں ہر قسم کے جذبات سے سے عاری رہیں۔ اچانک ان میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں تو ڈاکٹر مسکرانے لگا۔

☆......☆......☆

بہاری ابھی تمہاری کوتاہیوں کی وجہ سے ہمیں سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہماری اس تکلیف کا تمہیں بھی حصہ دار بننا چاہئے۔ ڈاکٹر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا نشتر اس کی ران میں پیوست کر دیا تو شدت تکلیف سے وہ چیخا مگر اس کے ہاتھ آزاد ہوتے تو وہ یقیناً ڈاکٹر کا گلا گھونٹ دیتا مگر وہ بے بس تھا ڈاکٹر نے نشتر نکال کر دوبارہ دوسری جگہ گاڑ دیا تو وہ زور زور سے چیخا اور ڈاکٹر اس کی چیخوں سے محظوظ ہوتا رہا پھر وہ ڈاکٹر کی منت سماجت پر اتر آیا اور آئندہ حکم عدولی کی تکمیل نہ کرنے کا وعدہ کرنے لگا تب جا کر ڈاکٹر نے اپنا ظالمانہ فعل بند کر دیا۔ اور ڈوریوں سے اس کے ہاتھ اور ٹانگیں آزاد کر دی، رانوں کے زخموں پر مرہم لگا کر پٹی باندھی اور نفیس سوٹ پہنا کر اسے حکم دیا کہ وہ شام سے پہلے ہی کسی صحت مند عورت کو لے آئے۔

اگر وہ آج بھی اس مشن میں ناکام رہا تو پھر اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی الگ کر دی جائے گی۔ ٹھیک بارہ بجکر 35 منٹ پر بہاری نے گاڑی پارک میں کھڑی کر دی اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر تکنے لگا پولیس کی مستعدی اور لوگوں کے محتاط انداز نے اسے ابھی تک کامیاب نہیں ہونے دیا تھا گویا اس کے اس کام کے لئے ابھی کافی وقت تھا سورج غروب ہونے میں ابھی چار گھنٹے پڑے تھے اور اسے امید تھی کہ ان چار گھنٹوں میں کسی نہ کسی عورت پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گا ڈاکٹر بہاری سے یہ کام رات کے وقت بھی لے سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا رات میں عورت گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتی ہیں پھر ان کو اغوا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور یہ معمولی سا کام بہاری نہیں کر سکتا تھا اسی لئے ڈاکٹر نے آج اسے سزا دی تھی جس سے وہ کافی چوکس ہو گیا تھا گو اس کے پاس ابھی چار گھنٹے تھے مگر وہ کیسے بے فکر ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد کسی عورت کو لے کر یہاں سے چلا جائے اور گاڑی سے نکل کر ٹہلنے لگا۔

بہاری کی نظریں اس لڑکی پر پڑیں جو بچہ گاڑی کو دھکیلتی ہوئی ایک سمت لے جا رہی تھی لڑکی کی عمر اٹھارہ سال تھی ظاہری حالت سے وہ کسی کی ملازمہ دکھائی دیتی تھی بہاری جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا وہ شریف آدمی تھا اس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی مجرمانہ حرکت نہیں کی تھی۔ بہاری کی یہ حرکت واضح طور پر نظر آتی تھی وہ اس لڑکی کے پیچھے صرف چند گز کے فاصلے سے اسی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا جس رفتار سے لڑکی چل رہی تھی لڑکی نے دو مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا اور خوفزدہ ہو کر رفتار تیز کر دی بہاری کا خیال تھا کہ سنسان جگہ پر موقع ملتے ہی اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال لوں گا۔ مگر لڑکی جو اس کے تعاقب سے بدحواس ہو چکی تھی آگے جانے کے بجائے کسی اور راستے پر مڑ گئی۔ بہاری نے نئی گاڑی لڑکی کے قریب لے جا کر روکی اور ایک دم دروازہ کھول کر لڑکی پر جھپٹ پڑا لوگ حیرت سے اس شریف آدمی کو دیکھ رہے تھے جو ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر اسے روک پاتا اور معاملے کی نوعیت کو سمجھا جاتا۔

دیکھنے والوں کو ہوش تو اس وقت آیا جب بہاری لڑکی کو گاڑی میں ڈال کر رفتار تیز کر چکا تھا لڑکی کی چیخیں نکل رہی تھیں اس کی چیخیں سن کر ڈیوٹی پر مامور ایک پولیس والا بھی تھا جس کے ساتھ دو اور پولیس والے بھی تھے پولیس والے نے کانسٹیبل کو ہدایت دی کہ فوراً پولیس چوکی پر فون کر کے اس گاڑی کو روکنے کے لئے کہے اور خود موٹر سائیکل پر اس گاڑی کا تعاقب کرنے لگا۔ بہاری کو اپنے تعاقب میں آتے ہوئے پولیس والے کا علم ہو گیا جو پوری رفتار سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا بہاری نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی اور پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تیرنے لگے۔ سامنے سڑک کے عین درمیان ایک جیپ کھڑی تھی اس کے دونوں طرف پولیس والے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ بہاری نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور فیصلہ کن انداز میں رفتار مزید بڑھاتے ہوئے سانس بند کر دیا، سانس رکتے ہی اس کا جسم دھندلا ہو کر بگولے کی مانند فضا میں تحلیل ہو گیا اس کے کپڑے اس طرح سے سیٹ پر موجود رہ گئے۔ غبارے سے ہوا خارج ہو گئی ہو گاڑی پوری رفتار سے سامنے کھڑی پولیس جیپ سے ٹکرائی جس سے زبردست دھماکا ہوا اور آگ کے شعلے دور تک پھیل گئے یقیناً کسی گاڑی کی پیٹرول ٹینکی پھٹ گئی تھی یا ہو سکتا ہے دونوں گاڑیوں کی ٹینکیاں پھٹ گئی ہوں کیونکہ ٹکراؤ بہت شدید تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر آج جلدی ہی آفس سے واپس آ گیا تھا اور اس وقت اپنی ماں کو سمجھا رہا تھا اور اس کی ہمت بندھا رہا تھا کہ بہادری بہاری کسی عورت کو لے آئے گا پھر تم جی بھر کے اس کے خون سے اپنی پیاس بجھا لینا بہاری کی لائی ہوئی عورت تمہارے لئے ہو گی اسے تم جس طرح چاہو استعمال کر سکتی ہو ڈاکٹر کی باتیں سن کر وہ خوش نظر آنے لگی مستقبل قریب کے تصور ہی سے اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا جب وہ عورت لائے گا اور سالم عورت اس کے سپرد کر دی جائے گی وہ اس تصور میں اپنے دانتوں کو اس انداز اور خیالی عورت کو نوچ نوچ کر کھا رہی تھی اور اس عورت کی چیخیں اس کے کانوں میں اس طرح گونجنے لگی، ایک بجے کا وقت ہو گا عین تہہ خانے میں بجنے والی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

جسے سن کر وہ دونوں ایک ساتھ اچھل پڑے ڈاکٹر کی مٹھیاں بند ہو گئیں اور جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں غصے کی زیادتی کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں وہ دوڑتا ہوا تہہ خانے میں پہنچا اس کے پیچھے اس کی ماں بھی تھی، تہہ خانے میں ڈاکٹر کا غصہ عروج پر پہنچ گیا کیونکہ سامنے جار میں بہاری کی لاش تیر رہی تھی، ڈاکٹر سرسری انداز میں اس کے گرد چکر لگانے لگا اور غصے سے اپنا جسم نوچنے لگا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور بہاری کی لاش کو چیر پھاڑ کر کھا جائے آج اس نے بہاری کی ذات سے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اگر اس نے بہاری کے جسم پر اس قدر محنت نہ کی ہوتی تو وہ یقیناً اسے چیر پھاڑ کے کھا جاتا مگر پھر اس کو اس مقصد کے لئے نیا جسم تیار کرنا پڑتا تھا جس کے لئے مہینے درکار تھے اور اس جان لیوا محنت سے وہ سخت خوف کھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسے نقصان پہنچانے کی ہمت نہ کر سکا اب کیا ہو گا اس کی ماں افسوس کے عالم میں ہاتھ ملنے لگی۔ اوہ بہاری آج پھر خالی لوٹ آیا خدا کے لئے مجھے اپنے ذخیرے سے چند گھونٹ دے دو میں زیادہ صبر نہیں کر سکتی میں مر جاؤں گی۔ اگر تم مر سکتی ہو تو شوق سے مر جاؤ مگر میں تمہیں اپنے پاس سے ایک بوند بھی نہیں دوں گا۔

معلوم نہیں آب کتنے دن انتظار کرنا پڑے گا۔

کیا تم چاہتی ہو کہ میں اپنی جمع شدہ پونجی تمہارے حوالے کر کے خود مر جاؤں او یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

میں زیادہ خون کا تقاضا نہیں کر رہی صرف چند بوند سے کوئی خاص کمی واقع نہیں ہو گی ڈاکٹر بہاری کی ناکامی پر ویسے ہی جھلایا ہوا تھا اور مستقبل کے لیے سخت فکر مند ہو گیا تھا اب اس کا حد سے بڑھتا ہوا اصرار دیکھ کر غصے میں بھر گیا اور چیخ کر بولا میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس خون کی مقدار بہت کم رہ گئی ہے اس میں کسی کو حصے دار نہیں بنا سکتا بہتری اسی میں ہے کہ مجھے تنگ نہ کرو اور میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔ سراسر ظلم ہے تم درندے ہو میں اس کے خلاف احتجاج کروں گی تم تنہا میرے ساتھ سامنے بیٹھ کر اپنی پیاس نہیں بجھا سکتے جبکہ میں کئی دنوں کی پیاسی ہوں آخر تم کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا تمہارا دل اس قدر پتھر کیوں ہو گیا ہے بس آج میں اپنا حصہ لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔

تمہاری یہ مجال میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنا حصہ مجھ سے کیسے وصول کرتی ہو ڈاکٹر نے اسے زور سے دھکا دیا وہ اپنی کمزور ہڈیوں کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر جا گری مگر پھر وہ اٹھ کر ڈاکٹر پر جھپٹ پڑی اور زور زور سے چیختے ہوئے نوچنے کھرچنے لگی ڈاکٹر صرف اپنا دفاع کر رہا تھا جب کہ اس کا حملہ جارحانہ تھا مجبوراً ڈاکٹر کو بھی قدم اٹھانا پڑا ان کی لڑائی کا

منظر قابل دید تھا بالکل لڑاکا مرغوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے اور دانتوں سے ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچ نوچ کر جسم سے جدا کررہے تھے کافی دیر تک اسی طرح لڑتے رہے یہاں تک عورت نڈھال ہوکر گر پڑی ڈاکٹر نے اس کی چوٹی پکڑی اور گھسیٹ کر کوٹھری میں ڈال دیا۔ یہاں وہ بڑی دیر تک اپنے زخموں سے خون چاٹتی رہی اور سسکتی رہی اسی عالم میں شام کے اندھیرے چھاگئے۔

اس نے آتش دان میں لکڑیاں بھی نہ جلائی تھیں سردی کی شدت سے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے دانت بج رہے تھے اور رگوں میں خون کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہورہی تھی حالانکہ کوٹھری میں آگ جلانے کے لئے ہر چیز موجود تھی مگر اس میں آگ نہ جلائی ہاں سردی سے ٹوٹتی رہی اگر آگ جلالیتی تو اس کی حرارت سے اسے یقیناً نیند آجاتی مگر وہ سونا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اتنی دیر کی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک اہم فیصلہ کیا تھا انتہائی خطرناک فیصلہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی تو اس کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہوتی پھر وہ ہر چیز کی تنہا مالک ہوتی۔

تقریباً دو بجے کے قریب اس نے آگ جلاکر اپنے جسم کو اچھی طرح سے گرم کیا جب اس کے ٹھنڈے ہاتھ پاؤں کام کرنے کے لئے بالکل تیار ہوگئے تو اس نے آتش دان کے قریب پڑی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک بھاری لکڑی کا انتخاب کیا اور اسے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر دبے قدموں چلتی ہوئی کھڑکی سے باہر آگئی ڈاکٹر اپنے کمرے میں بے خبر سورہا تھا لکڑی کی پہلی ضرب سے ڈاکٹر کی آنکھوں میں سورج اتر آیا جو تیزی سے گھومتا ہوا تاریکی میں غروب ہوگیا اس نے احتیاطاً ایک اور ضرب لگادی جب اسے اچھی طرح سے یقین ہوگیا کہ ڈاکٹر اب حرکت کرنے کے لائق نہیں رہا تو اس کے جسم کو گھسیٹ کر آپریشن تھیٹر میں لے گئی ٹیبل پر اچھی طرح سے کسنے کے بعد اس کے چہرے پر خول فٹ کیا خول کی تمام نالیاں اور تاریں میٹر کے ساتھ ٹھیک جگہ پر لگانے کے بعد ڈاکٹر کے سینے میں سرنج کی سوئی اتار دی، اس پر ڈاکٹر کو ہوش آگیا اس نے آنکھیں کھول کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ ڈاکٹر کو زیادہ دیر تک خوفزدہ رہنے کا موقع نہ مل سکا اس کی روح بڑے آرام سے میٹر میں چلی گئی اور تمام خون بوتلوں میں جمع ہوگیا میٹر کے اسکرو ٹائٹ کرنے کے بعد اس نے تار جدا کیے ڈاکٹر کی لاش کو ڈوریوں سے کھول کر بڑی نفاست سے اس کے ٹکڑے کیے اور لمبے لمبے سلاخوں پر چڑھا کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی جہاں آتش دان میں آگ دہک رہی تھی۔ صبح تک وہ خوشی سے ناچتی رہی ڈاکٹر کے گوشت کے بھنے ہوئے تکے کھاتی رہی۔ صبح تک سوتی رہی جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج غروب ہونے والا تھا اس نے اٹھ کر باقی ماندہ تکوں کو کھایا اور خون کے چند گھونٹ پی کر باہر نکل آئی اور وہ اب اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے باقی حصے پر عمل کرنا چاہتی تھی اس نے تہہ خانے سے بہاری کی لاش آپریشن ٹیبل پر ڈالی اور ڈاکٹر کی روح اس میں اتار دی۔

جب وہ زندہ ہوگیا تو اسے حکم دیا کہ وہ اس کے لیے خون کا بندوبست کرے، گزشتہ کوتاہیوں کی سزا کے طور پر اس نے بہاری کے جسم میں دو تین بار نشتر گاڑ کر نکالا اس بار بہاری تکلیف کی شدت سے چیختا نہیں بلکہ خاموشی سے اذیت برداشت کرگیا تاہم اس کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت کا سمندر طوفانی انداز میں تڑپنے لگا۔ جیسے ہی اس نے بہاری کے ہاتھ کھولے بہاری کا ہاتھ سرکا اور بجلی سی چمکی اور عورت کی طویل چیخوں سے پوری عمارت لرزنے لگی بہاری کے ہاتھ میں پکڑا ہوا لمبا اور موٹا نشتر پوری تیزی سے بار بار اس کے جسم میں داخل ہوکر باہر نکل رہا تھا۔

یقیناً بدنصیب عورت کو معلوم نہیں تھا کہ بہاری کے ذہن پر قبضہ صرف ڈاکٹر کا تھا ورنہ بہاری آج کا کام بہت پہلے انجام دے چکا ہوتا بہاری نے نشتر مار مار کر عورت کا تمام جسم چھلنی کر ڈالا جب اسے یقین ہوگیا کہ بوڑھی عورت کا ناپاک جسم روح سے خالی ہوگیا ہے۔ تو اس نے ایک لمبا طویل سانس لیا پھر تہہ خانے میں جاکر جار کے ٹکڑے کردیئے اور بڑی آزادی سے سانس بند کر کے روح کو اپنے جسم سے خارج کردیا۔

☠

جناتی دنیا

شیخ معین اختر - چنیوٹ

بزرگ نے اپنی پڑھائی کو تیز کردیا تو آگ کا الائو روشن ہوگیا اور پھر جیسے شعلوں کی برسات ہوگئی فضا میں زبردست دھماکے ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خاموشی چھاگئی تو……

جناتی دنیا کی جسم وجاں پر کپکپی طاری کرتی حقیقت پر مبنی ڈراؤنی اور خوفناک کہانی

وہ زبردست طوفانی رات تھی۔ بارش اور تیز ہواؤں نے افہام کو دفتر میں رکنے پر مجبور کردیا تھا جبکہ افہام کی بیوی انعم اپنے بیٹے رومی کو لے کر کمرے میں بیٹھی افہام کا انتظار کررہی تھی۔ ہوا کی وجہ سے لان میں رکھی پلاسٹک کی کرسیاں ادھر سے ادھر اڑ رہی تھیں۔ بڑے بڑے درخت جھوم جھوم کر یہ بتارہے تھے کہ آج بادلوں کو ترس نہیں آنے والا۔

انعم نے گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کردی تھیں لیکن پھر بھی طوفانی ہوا کے بے رحم تھپیڑے رک نہیں رہے تھے۔ ''ٹھک…… ٹھک۔'' دروازے پر زوردار دستک ہوئی تو انعم خوشی سے لبریز ہوکر اٹھی لیکن اگلے ہی لمحے رک گئی۔

''افہام کے پاس تو گاڑی ہے پھر یہ کون ہے۔'' انعم کی چھٹی حس نے اس کے رونگٹے کھڑے

کردیئے۔ دستک بدستور ہورہی تھی، تھوڑی دیر سوچنے کے بعد انعم اس نتیجے پر پہنچی کہ ہوسکتا ہے بارش سے گاڑی خراب ہوگئی ہو اور سیل فون میں چارج نہ ہو۔ انعم تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور لان سے ہوتے ہوئے وہ گیٹ کے پاس پہنچی اور گیٹ کی کنڈی کھول دی۔ باہر کوئی نہ تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے دروازہ بند کرکے اندر آنے لگی۔

''ٹھک...... ٹھک۔'' دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے بری طرح چونکادیا۔ اس نے دروازہ کھولنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ وہ کپکپانے لگی تھی۔ چھتری اس کے ہاتھوں سے گرگئی تھی۔ تیز بارش نے اس کو مکمل بھگودیا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے گیٹ کو تکنے لگی۔ کہ افہام کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو انعم نے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا تو سامنے افہام کار میں بیٹھا نظر آیا، اس کی نظریں انعم پر مرکوز تھیں۔ ''تم تو مکمل بھیگ چکی ہو...... بارش میں بھیگنے کا ارادہ تھا تو چھتری اٹھانے کی زحمت کیوں کی......'' افہام نے رین کوٹ اتارا اور گھر میں داخل ہوا۔

''افہام آپ کے آنے سے پہلے...... گیٹ پر دستک ہوئی تھی اور جب میں نے کھولا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں بہت ڈر گئی ہوں۔'' انعم نے تولیہ افہام کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں تھا اگر کچھ ہوتا تو ہمارے ساتھ ہوتا۔ خیر بہت بھوک لگ رہی ہے کھانا لگاؤ۔''

''اچھا لاتی ہوں۔''

''کیا رومی سوگیا ہے۔'' افہام نے پوچھا۔

''ہاں ابھی ابھی سویا ہے۔'' انعم کھانا ٹیبل پر لگاتے ہوئے بولی۔

''افہام میرے کندھوں میں شدید درد ہورہا ہے۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے بہت سارا بوجھ رکھ دیا ہو کسی نے'' انعم نے کھانا ٹیبل پر رکھ دیا اور ہاتھ سے اپنے دونوں کندھے دباتے ہوئے بولی۔

''میڈم آپ کو کتنی بار تو کہا ہے نوکر رکھ لیتے ہیں سارے گھر کی ذمہ داری لینے کا شوق آپ کو ہی پڑا ہوا ہے چار مہینے کا ہے رومی اس کو سنبھالنا پھر گھر کے ون ٹو آل کام۔'' افہام نے کہا۔

''پہلے بھی تو کرتی تھی نا...... شادی سے پہلے میں اور شبانہ ہی سارے کام کرتی تھیں۔'' انعم نے پانی کا گلاس افہام کو پکڑایا۔

''شادی کے بعد عورت بہت کمزور ہوجاتی ہے فزیکلی۔'' افہام نے نیپکین سے منہ صاف کیا اور ٹی وی آن کرکے بیٹھ گیا جبکہ انعم برتن سمیٹنے لگی۔

☆......☆......☆

بس اب رخصتی کرالیں ناں۔ میں بہت بور ہوجاتی ہوں۔ انعم کی شادی کے بعد دل ہی نہیں لگتا۔'' شبانہ نے کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک سال اور ویٹ کرلو۔'' آواز سنائی دی۔

''نہیں جانو...... انکل کو منالو رخصتی کے لئے۔'' شبانہ کا موڈ بالکل رونے والا ہوگیا تھا۔

''یار کچھ مسئلے ہیں وہ حل ہوجائیں تو رخصتی کرالیں گے اور ویسے بھی شرعی طور پر تم میری بیوی ہو ہمارا نکاح ہوچکا ہے۔'' شاہد کی آواز میں شوخی جھلک رہی تھی۔

''ایک سال میں اگر میں مرگئی تو......؟'' شبانہ کے سوال پر شاہد کو چپ لگ گئی۔

''اور اگر میں مرگیا تو۔'' تھوڑی دیر بعد دوسری سائیڈ سے آواز آئی۔

''اس لئے تو کہتی ہوں جلد رخصتی کرالیں۔'' شبانہ کی آنکھوں میں اب آنسو جھلملا رہے تھے۔

''میری جان کے ٹوٹے...... میری مجبوریوں کو سمجھو۔'' شاہد سمجھ گیا تھا کہ اب شبانہ رونے والی ہے۔ ''اچھا میں کھانا کھالوں...... پھر بات ہوتی ہے۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ کال ڈسکنکٹ کرنے کے بعد شبانہ اٹھی اور کمپیوٹر آن کرلیا۔'' جلدی شادی کے وظیفے کھول کر بیٹھ گئی۔

شبانہ اور شاہد کے نکاح کو ایک سال بیت گیا تھا۔ شبانہ اپنی پھوپھو کی بیٹی انعم کے ساتھ رہتی تھی انعم کے ماں باپ کا انتقال ہوچکا تھا جبکہ شبانہ کے ماں باپ کینیڈا شفٹ

ہوگئے تھے۔ شبانہ کی رخصتی کا سب کو انتظار تھا لیکن شاہد اور اس کے گھر والوں کے کچھ مسائل آڑے آرہے تھے۔

شبانہ موبائل سائیڈ پر رکھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ T.V پر اس کے فیورٹ اینکر کا پروگرام چل رہا تھا جس میں وہ بڑی بہادری سے جعلی عاملوں کو بے نقاب کررہا تھا۔

''شکر یہ کہ نیٹ پر جو وظائف ہوتے ہیں وہ تو ٹھیک ہوتے ہیں۔'' شبانہ نے دل ہی دل میں سوچا اور مسکرادی۔

☆......☆......☆

میرا رومی بڑا ہوگا...... ماما کا شہزادہ دولہا بنے گا اور پھر اس کی دلہن آئے گی پیاری سی۔'' انعم رومی کی مالش کرتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگی۔

''بولو ماما...... بابا آنی......'' انعم رومی کو الفاظ سکھانے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ مالش ختم کرنے کے بعد انعم نے تیل سائیڈ پر رکھا اور ہاتھ دھونے چلی گئی۔

''ماما......'' رومی کی آواز پر اچانک انعم کے بڑھتے قدم رک گئے۔

انعم ڈرتے ڈرتے رومی کو دیکھنے لگی۔ چار ماہ کا رومی ہنستے ہوئے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ انعم آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں رومی زور زور سے رونے لگا۔ انعم نے کانپتے ہاتھوں سے رومی کو اٹھایا وہ ابھی بھی آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی۔

انعم بجلی کی تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہی پھر جلدی سے فون اٹھایا شبانہ کا نمبر ملایا۔ ''ہیلو......'' شبانہ اپنی پرسکون آواز میں بولی۔

''شبانہ یار میرے گھر میں کوئی ہے۔'' انعم چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''کون ہے......''

''کوئی جن بھوت...... یار تم یقین جانو پرسوں رات سے عجیب عجیب ہورہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ گڑبڑ ہے تم پلیز یہاں آجاؤ۔'' انعم رومی کو گود میں اٹھائے لان میں آگئی۔

''ایک سیکنڈ...... جن بھوت تمہارے گھر میں ہیں تو میں وہاں کیوں آؤں۔ تم یہاں آجاؤ نا۔''

''شبانہ دیکھو افہام میرے لئے جاب سے چھٹی لے سکتے ہیں اور رہی بات تمہاری تو تم اکیلی ہو آسانی آسکتی ہونا۔''

''چلو میں شاہد سے اجازت لے لوں پھر۔''

''شبانہ تم اپنی تیاری کرلو۔ شاہد سے اجازت میں خود لے لوں گی۔'' انعم کی بات پر شبانہ مان گئی۔ اب انعم قدرے مطمئن ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

''بریانی بہت مزے کی بنی ہے......'' انعم نے کباب توڑتے ہوئے کہا۔

''مزے کی کیوں نہیں ہوتی...... مسز شاہد نے جو بنائی ہے۔'' شاہد نے ہنستے ہوئے شبانہ کی طرف دیکھا جس پر شبانہ شرما سی گئی۔

''ویسے شاہد کو بلانے کا آئیڈیا کس کا تھا۔'' انعم نے تینوں پر نظر دوڑائی۔

''میرا...... بھئی ہماری ایک ہی تو سالی ہے اور ویسے بھی شرعی طور پر یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ کیوں شاہد۔'' افہام نے بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... لیکن ابھی ان کی رخصتی باقی ہے تو ہمیں ان دونوں پر نظر رکھنی پڑے گی...... ہاہاہا...... کیونکہ آج رات شاہد ادھر ہی رک رہا ہے۔'' انعم نے مسکراتے ہوئے شبانہ کو کہنی ماری جو کافی دیر سے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

''انعم چلو برتن سمیٹیں......'' شبانہ کے شرمانے پر تینوں کے قہقہے سنائی دیئے۔

''گھر میں رونق لگ گئی ہے جب سے تم آئی ہو۔'' انعم چائے چولہے پر چڑھاتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... تم تو کہہ رہی تھی کہ جن بھوت ہیں مجھے تو اب تک کچھ محسوس نہیں ہوا۔'' شبانہ نے کہا۔ ''بھوتوں کو چھوڑو اور یہ چائے شاہد کو دے کر آؤ۔'' انعم بولی۔

''میں......؟''

''ہاں تم۔'' انعم نے پرچ پیالی شبانہ کو تھمادی اور شبانہ خوشی خوشی لے کر شاہد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

''میں اندر آجاؤں......'' دودھ جیسی سرخ رنگت

پر گلابی ہونٹ اور سنہری بال لئے شبانہ نے کمرے میں جھانک کر کہا۔ شاہد نے ہاں میں گردن ہلائی اور شبانہ کو دیکھتا رہ گیا وہ کچھ زیادہ ہی پیاری لگ رہی تھی، کالے رنگ کی کمیض اور ریڈ کیپری میں وہ کوئی الپسرا لگ رہی تھی۔

''آج تو جناب کی بات ہی الگ ہے۔'' شاہد نے شبانہ سے کہا جس پر وہ مسکرا دی۔

''آج آپ کے لئے تیار ہوئی ہوں۔'' شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا جی.....'' شاہد نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن شبانہ پیچھے ہوگئی۔

''کیا ہوا..... کیوں ترسا رہی ہو۔'' شاہد نے بے چارگی سے کہا۔

''جناب ابھی انتظار فرمایئے..... صبر کریں جلدی رخصتی کروائیں۔'' شبانہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''آج میں نے ایک وظیفہ اسٹارٹ کرنا ہے آج سے پھر اللہ کے کرم سے ہم دونوں کی زندگی آسان ہوجائے گی۔'' شاہد کی خاموشی بھانپتے ہوئے شبانہ نے کہا۔

''آمین۔''

☆.....☆.....☆

وضو کرتے ہی شبانہ مصلے پر بیٹھ گئی اور نیٹ سے دیکھا ہوا ''شادی کا وظیفہ'' اسٹارٹ کیا۔ انعم کو پتہ تھا کہ شبانہ نے وظیفے میں بولنا نہیں ہے اس لئے وہ چپ چاپ کام میں مگن تھی۔

صبح کے 10 بجے تھے انعم برتن سمیٹ کر دھونے لگی برتنوں سے فارغ ہو کر اس نے فریج سے قیمہ نکالا اتنے میں رومی کے رونے کی آواز آ گئی۔ انعم ہاتھ صاف کر کے رومی کے کمرے میں چلی گئی۔ رومی کا ڈائپر چینج کرنے کے بعد اسے سلانے لگی۔ انعم نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو 12:30 بج چکے تھے۔ انعم نے رومی کو بیڈ پر لٹایا اور جلدی سے اٹھی، افہام دفتر سے آنے والا تھا لیکن ابھی تک کھانے کا نام و نشان نہیں تھا وہ جلدی سے کچن میں گئی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پورے کچن میں برتن بکھرے پڑے تھے اور ناشتے کے برتن بھی جوں کے توں تھے۔

''عاعا..... عُشہ..... عائشہ۔'' انعم نے شبانہ کو آواز دی لیکن پھر اس کے ذہن میں آیا کہ وہ تو وظیفہ کر رہی ہے۔

انعم جلدی سے کمرے میں گئی اور رومی کو لے کر شبانہ کے قریب بیٹھ گئی۔ شبانہ نے ایک نظر انعم اور رومی کو دیکھا اور پھر پڑھائی میں لگ گئی، کوئی 1 بجے اس کی پڑھائی ختم ہوئی۔ دعا مانگ کر اس نے انعم کو گھورا۔

''کیا بات ہے۔'' شبانہ نے غصے سے پوچھا۔

''شبانہ میں نے کہا تھا نا کہ یہاں بھوت ہیں دیکھو سارا کچن بکھرا ہوا ہے حالانکہ میں نے خود صفائی کی تھی۔'' انعم شبانہ کا بازو پکڑ کر کچن میں لے گئی لیکن کچن تو شیشے کی طرح چمک رہا تھا ہر چیز اپنی جگہ پر نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔

''لو..... اب میڈم کو بھولنے کی بیماری لگ گئی۔''

شبانہ نے ہلکی سی چپت انعم کے سر پر لگائی اور رومی کو لے کر کمرے میں چلی گئی جبکہ انعم اب بھی حیرانگی سے کچن کو دیکھ رہی تھی۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔'' انعم نے دل ہی دل میں سوچا اور آگے بڑھ کر ہانڈی میں جھانکا۔ ہانڈی میں قیمہ رکھا ہوا تھا جسے پہلے انعم رکھ کر گئی تھی۔ انعم نے آیت الکرسی کا ورد اپنے اوپر کیا اور کھانا بنانا شروع کیا۔

☆.....☆.....☆

چلو آج شبانہ کو گھمانے لے چلتے ہیں..... انعم تم سینڈوچز بنالینا۔'' افہام نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

''واؤ..... کدھر چلیں گے بھائی..... اور یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔

''عمر حیات محل.....'' افہام نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''عمر حیات محل..... یہ کہاں ہے۔'' انعم نے تعجب سے پوچھا۔

''چنیوٹ میں..... شاہد نے بتایا تھا۔'' شبانہ نے وضاحت کی۔

''پتہ ہے عمر حیات محل کو پاکستان کا تاج محل کہا جاتا ہے یہ 1922ء میں بننا شروع ہوا اس کا مالک شیخ عمر

خوفناک کہانیاں

جو کہ پڑھنے والوں پر کپکپی طاری کر دیں گی

جسم و جاں کو خوف کے شکنجے میں جکڑ لیں گی

اپنی نوعیت کی دل دہلاتی خوف کے گرداب میں غوطہ زن،

خونچکاں بھونچکاں اپنی مثال آپ کہانیاں

ڈرڈائجسٹ کے مشہور و معروف رائٹروں کی دہشت ناک اور تحیر انگیز کہانیاں

جسے پڑھنے والے اچنبھے میں پڑ جائیں گے اور تھرا جائیں گے۔

ضخیم صفحات

دیدہ زیب آفسٹ پرنٹنگ اور چار کلر سے مزین ٹائٹل

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں۔

قیمت صرف -/300 روپے

ڈرپبلی کیشنز

نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی

رابطہ نمبر:
0333-2384517
021-32744391

حیات تھا۔ پوری شیخ برادری اس بات پر فخر کرتی ہے...... عمر حیات نے اپنے سرمائے کا بھاری حصہ اس محل کی تعمیر پر لگایا تھا، پر افسوس محل مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ انتقال کر گیا۔

اس کی بیوی اور بیٹے کی قبریں بھی اسی محل میں بنائی گئی ہیں۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عمر حیات کو نظر کھا گئی...... بری چیز ہے یہ نظر لگنا بھی۔" افہام نے تفصیلی بتائی۔

"پھر تو ان کی روحیں بھی بھٹکتی ہوں گی۔ مجھے تو بہت شوق ہے جن بھوت دیکھنے کا۔" شبانہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"چلو جی......" انعم نے بیزاری سے کہا اور چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی اور سینڈوچز تیار کرنے لگی۔ شبانہ بھی اپنی بلیک جینز اور پنک فراک نکال کر پریس کرنے لگی۔

دن کے تین بج چکے تھے۔ ساری تیاری مکمل ہوگئی تھی شبانہ نے اپنا شولڈر بے بی بیگ لٹایا اور کار میں بیٹھ گئی انعم بھی ساتھ ہی بیٹھی تھی جبکہ افہام اور شاہد آگے کی سیٹوں پر براجمان تھے۔ کار میں گانوں نے سب کا موڈ فریش کر دیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ سب، عمر حیات محل کے سامنے کھڑے تھے، ایک گائیڈر ان کی رہنمائی کرتا ہوا اندر لے گیا تو خوبصورتی کا شاہکار نمونہ ان کے سامنے تھا۔

"پانی ملے گا......" شبانہ نے گائیڈر سے کہا۔ "جی اس طرف کولر رکھا ہے۔" گائیڈر نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

"کہو تو...... میں سیراب کردوں اپنی جان کے ہونٹ۔" شاہد نے آہستگی سے شبانہ کے کان میں کہا جس پر وہ شرما کر کولر کی طرف چلی گئی۔ پانی پینے کے بعد شبانہ نے اپنے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر بھری اور پھر واپس جانے لگی کہ

"عائشہ......" ایک انجانی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو شبانہ نے مڑ کر ادھر ادھر دیکھا پر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پھر اس نے کندھے اچکائے اور واپس آ گئی۔

"یہ قدیم لائبریری ہے اس کے ساتھ ایک اور کمرہ ہے جس میں اس وقت کی ثقافت کی چند جھلکیاں محفوظ کی گئی ہیں۔ جن میں فریم میں جڑے ناخن نگاری کے چند نمونے اور عمر حیات کے استعمال میں رہنے والی گاڑی کے اوزار وغیرہ شامل ہیں۔ گھریلو ساز و سامان میں بس ایک ٹارچ باقی ہے اور دولہے کا کرتا۔

دولہا کون تھا؟ انعم نے گائیڈر کی بات کاٹ کر پوچھا۔ عمر حیات کا بیٹا گل زار حیات شادی کا دعوت نامہ بھی یہیں بوسیدہ حالت میں موجود ہے۔

"ٹون...... ٹون...... ٹون...... شاہد کے موبائل نے گائیڈر کو روک دیا۔

"ایکسکیوزمی......" شاہد موبائل لے کر سائیڈ پر چلا گیا اور گائیڈر نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

"عائشہ...... شاہد کی سرگوشی پر شبانہ نے مڑ کر دیکھا تو شاہد ہاتھ کے اشارے سے اس کو بلا رہا تھا۔

"انعم میں آتی ہوں۔" شبانہ بہانہ بنا کر شاہد کے پاس چلی گئی۔

"جی جناب......" شبانہ مسکراتے ہوئے شاہد کے پیچھے آ کر کھڑی ہوگئی۔

"جانو...... کیا ہوا ناراض ہو گیا...... میں نے کوئی غلطی کر دی کیا۔" شبانہ نے شاہد سے کہا۔ لیکن وہ بدستور سامنے منہ کئے کھڑا تھا۔ پھر شبانہ خود ہی شاہد کے سامنے چلی گئی۔ شاہد کی آنکھیں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا ڈیئر......" شبانہ نے شاہد کے چہرے پر اپنا ہاتھ لگا کر کہا۔ لیکن شاہد بالکل چپ تھا۔

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ پلیز بولو ناں اور پھر شبانہ رونے لگی۔

کہ اچانک شبانہ کا موبائل بجا تو شبانہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے موبائل کی اسکرین پر دیکھا تو اس کی آنکھیں مارے حیرت سے جیسے پتھرا گئیں۔ موبائل کی اسکرین پر Husband Ji Calling لکھا ہوا تھا۔ شبانہ نے ایک نظر اٹھا کر سامنے کھڑے بندے پر ڈالی تو خوف سے اس کو چکر آنے لگے اب سامنے ایک

سر کٹا انسان کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

2 دن سے بے ہوش پڑی ہے، دعاؤں کا اثر بالکل بھی نہیں ہو رہا ہے ڈاکٹر شگفتہ نے شبانہ کی نبض چیک کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ آپ لوگوں کے ہاسپٹل میں فیک میڈیسنز یوز ہوتی ہیں کیا۔" شاہد جذباتی ہو کر بولا۔

"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن ہوگا تو وہی جو خدا کو منظور ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

اوکے Then I will Transfer to other۔

"ایکسکیوزمی......" ڈاکٹر شگفتہ شاہد کی بات کاٹ کر بولی۔ "یہ ہمارا پروفیشن ہے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم جان بوجھ کر مریض کی حالت بگاڑتے ہیں۔ نرس ان کی مسز کا سامان ان کے حوالے کریں اور آپ فوراً ان کو یہاں سے لے جائیں۔" ڈاکٹر شگفتہ طیش میں آ کر بولی جبکہ شاہد دانت پیستا رہ گیا۔

"آپ کو کیا پڑی تھی ڈاکٹر صاحبہ سے پنگا لینے کی۔ اب دیکھو۔" نرس مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا دیکھو...... شہر میں اور بھی اچھے اسپتال ہیں۔" شاہد نے ایک نظر نرس پر ڈالی اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ایمبولینس ارینج ہوتے ہی وارڈ بوائز نے اسٹریچر کی مدد سے شبانہ کو ایمبولینس میں ڈالا۔ شاہد شبانہ کے پاس ہی بیٹھ گیا اور ایمبولینس چل پڑی۔ رات کے تقریباً آٹھ بجنے والے تھے۔ ایمبولینس اسپتال کی جانب رواں دواں تھی۔

اچانک زور دار بادل گرجنے لگے اور ہوا چلنا شروع ہوگئی اور پھر آہستہ آہستہ ہوا تیز ہوتی گئی۔

"صاحب لگتا ہے طوفان آئے گا۔ گاڑی روکنی پڑے گی۔" ڈرائیور نے شاہد سے کہا۔

"نہیں تم چلاتے رہو۔ ہمارے ساتھ مریض ہے۔ تم چلاؤ جلدی۔" شاہد نے شبانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے ایمبولینس کی رفتار بڑھا دی، اسی اثنا میں مٹی کا طوفان آ گیا تھا ہر طرف مٹی ہی مٹی، سڑک کے کناروں پر لگے درخت گرنا شروع ہوگئے، ایمبولینس تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔

اچانک ایک موٹا درخت ایمبولینس پر گر گیا۔ ایمبولینس ہچکولے کھاتی ہوئی الٹ گئی۔ شاہد نے گاڑی میں لگا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے دیکھا شبانہ اوندھے منہ گری ہوئی ہے۔ سب سے پہلے اس نے خود کو آزاد کیا پھر اس نے اپنا بیلنس برقرار رکھتے ہوئے شبانہ کو باہر کی طرف گھسیٹا۔ ایمبولینس سے نیچے اترتے ہی وہ آہستہ آہستہ شبانہ کو باہر نکالنے لگا۔

"شاہد...... شاہد......" شبانہ بہت ہلکے ہلکے بول رہی تھی جسے سن کر شاہد کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ "شبانہ تم کو ہوش آ گیا۔" شاہد نے خوشی سے لبریز ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ ابھی بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

شاہد نے اسے گاڑی کے سہارے بٹھایا اور ڈرائیور کے پاس گیا لیکن ڈرائیور تو بری طرح زخمی ہونے کی وجہ سے دم توڑ چکا تھا۔ شاہد نے شبانہ کو سہارا دیا اور پیدل چلنے لگا۔ ہوا بہت زوروں پر تھی۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا موبائل سگنلز بھی آف ہو چکے تھے اب وہ اکیلا ہی شبانہ کو لے کر چلنے لگا۔

کچھ دیر چلتے رہنے پر انہیں روشنی دکھائی دی۔ وہ کوئی مکان تھا۔ جس کے باہر بلب لگا تھا جو ہوا کے باعث جھول رہا تھا۔ شاہد شبانہ کو لے کر اس مکان کے پاس آ گیا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ٹھک...... ٹھک...... ٹھک۔"

"آ رہی ہوں۔" مکان سے نسوانی آواز سنائی۔ دروازہ جیسے ہی کھولا تو شاہد کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کیونکہ سامنے ڈاکٹر شگفتہ کھڑی تھی۔

خیریت......؟ ڈاکٹر شگفتہ نے شاہد اور شبانہ کو دیکھ کر کہا۔

"اصل میں طوفان کے باعث ایمبولینس الٹ گئی ہے اور ڈرائیور کی بھی موت ہوگئی حادثے میں ہم بہت

مشکل میں ہیں۔" شاہد شرمندہ شرمندہ بولا۔ "اندر آیئے......" ڈاکٹر شگفتہ نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور شاہد شبانہ کو لے کر گھر کے اندر آ گیا۔ مکان اندر سے کافی خوبصورت تھا۔ شاہد نے شبانہ کو صوفے پر لٹایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر شگفتہ بولی۔ "مریض کو ہوش آ گیا ہے۔"

"ویسے ایک بات پوچھوں۔" شاہد بولا۔

"پوچھیے۔" ڈاکٹر شگفتہ مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی جیسے وہ جانتی ہو کہ شاہد کیا پوچھنے والا ہے۔

آپ ڈاکٹر ہیں...... پرائیویٹ ڈاکٹر۔ سیلری بھی اچھی خاصی ہے پھر یہاں ویرانے اور اس چھوٹے سے مکان میں کیوں رہتی ہیں۔"

"شاہد کی بات سن کر ڈاکٹر شگفتہ نے زور دار قہقہہ لگایا۔ "مسٹر شاہد مجھے پتہ تھا کہ آپ یہ ہی پوچھیں گے۔ اصل میں، میں یہاں اپنے بابا کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے بابا روحانی علاج کرتے ہیں، میں ہاسپٹل میں آپ سے یہ ہی کہنے والی تھی کہ اپنی مسز کو ایک بار میرے بابا سے دم کروائیں...... لیکن آپ تو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔" ڈاکٹر شگفتہ کی بات پر شاہد ہنسنے لگا۔

"لو بابا آ گئے......" سفید داڑھی والے بزرگ کمرے میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر شگفتہ یک دم کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی شاہد بھی کھڑا ہو گیا۔ "السلام علیکم انکل......!" شاہد نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

"بابا یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر میں آپ سے کر رہی تھی۔"

ڈاکٹر شگفتہ کی بات سن کر شاہد نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں...... پہلے دن جب آپ کی مسز کو میں نے دیکھا کہ میڈیسن ان پر اثر نہیں کر رہی اور ان کا بلڈ پریشر بھی معمول سے بڑھتا جا رہا ہے تو مجھے شک پڑا بابا سے تھوڑی بہت جان ماری بھی حاصل ہو گئی ہے۔ میں نے رپورٹس میں دیکھا کہ آپ کی مسز کی دھڑکن اتنی تیز چل رہی ہے کہ جتنی ایک عام انسان کی چلے تو اس کا دل پھٹ جاتا ہے۔

بے ہوشی میں شبانہ کا دماغ جاگ رہا تھا اور مسلسل اپنی باڈی سے بات بھی کر رہا تھا۔

"مطلب......" شاہد نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ ہمارا برین ہماری باڈی کو کنٹرول کر رہا ہوتا ہے لیکن جیسے ہی ہمیں نیند آتی ہے تو ہمارے جسم کے پرزے بھی سو جاتے ہیں لیکن آپ کی وائف کا ہر ایک حصہ جاگ رہا تھا اور اپنا اپنا کام کر رہا تھا۔ آپ کی وائف دوسری دنیا میں جاگ رہی تھی اور ہمارے سامنے بے ہوش تھی۔" ڈاکٹر شگفتہ نے اپنی بات مکمل کی۔

"دوسری دنیا مطلب۔" شاہد نے پھر سوال دہرایا۔

"جنات کی دنیا......" بابا نے شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی پر جنات کا سایہ ہے۔"

"شگفتہ ایک کٹوری میں پانی لے کر آؤ۔" تو شگفتہ فوراً اٹھی اور کچن سے پانی لے آئی۔ بابا نے پانی پر قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا اور شبانہ کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ پانی کی بوندیں شبانہ کے چہرے پر پڑتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھی اب وہ مکمل طور پر ہوش میں آ چکی تھی۔

"بابا یہ کیا کرشمہ کر دیا آپ نے۔" شاہد خوشی سے پاگل ہوئے جا رہا تھا۔

"میں تو کہہ رہی تھی آپ سے پر آپ بھلا سنتے ہیں کسی کی۔" ڈاکٹر شگفتہ مسکرانے لگی۔

"اچھا معاف کر دیں ڈاکٹر صاحبہ......"

"تم کہاں تھی بیٹی......" بابا نے شاہد کی بات کاٹ کر شبانہ سے پوچھا جو آنکھ پتھرائے بیٹھی تھی۔

"اپنے شوہر کے پاس۔" شبانہ آنکھیں جھپکائے بغیر بولی۔ "وہ مجھے اپنی دنیا میں لے گیا تھا اور بہت جلد وہ مجھے اس دنیا سے رخصت کر کے لے جائے گا۔"

"واٹ...... What Rubbish" شاہد چڑ کر بولا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" بابا نے تحمل سے پوچھا اور شاہد کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"کلماش"

"کہاں رہتا ہے؟"

"وادیٔ جن میں۔"

"تمہیں کہاں ملا؟" بابا نے پوچھا۔

"عمر حیات محل میں۔"

"اس نے تمہیں پہلی بار کہاں دیکھا؟"

"انعم کے گھر میں۔"

"وہ تم سے کیا کہتا ہے؟"

"میرے ساتھ میری دنیا میں چلو۔"

"وہ ہندو ہے......؟"

"وہ ایک کتاب کو مانتا ہے...... وہ حضرت محمد کو جانتا ہے...... وہ کلمہ توحید کو مانتا ہے وہ مسلمان ہے۔"

شبانہ جواب دیتے ہی کانپنے لگی۔ اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

"بابا یہ کیا تھا......" شاہد شبانہ کے ہاتھ رگڑتے ہوئے بولا۔

"مجھے انعم کے گھر لے چلو...... جلدی کرو۔" بابا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

"شبانہ کی سرگرمیاں کیا تھیں......" بابا نے انعم سے پوچھا۔

"بابا جی...... ہمارے گھر تو وہ ہفتہ پہلے ہی آئی تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا گھر میں۔"

"اس لئے میں نے شبانہ کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔" انعم نے اپنے گھر میں ہونے والے تمام واقعات بابا کو بتا دیئے۔

"کیا کیا تم نے...... کیا وہ کوئی وظیفہ کر رہی تھی۔" بابا نے پوچھا۔

"جی...... جی شادی کا وظیفہ......" شاہد نے انعم کی تائید کی۔

"کون سا...... مطلب وہ کیا پڑھتی تھی......؟"

"یہ تو ہمیں نہیں پتا بابا جی......" انعم نے جواب دیا۔

"شاہد بیٹا تم اس کے کمرے میں جا کر دیکھو ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی کاغذ وغیرہ پر کچھ لکھا ہو۔" بابا نے شاہد سے کہا اور شاہد تیزی سے شبانہ کے کمرے میں گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد شاہد ایک ڈائری لے کر آیا۔ "یہ دیکھیے بابا جی......" شاہد نے وہ ڈائری بابا کو تھما دی۔

جلد شادی کا وظیفہ...... نیچے لکھے کلمات کو صبح گیارہ بجے سے دوپہر ایک بجے تک پڑھنا ہے۔ یاد رہے وظیفے کے دوران بولنا منع ہے اور پڑھائی ختم کرتے ہی دعا مانگے اپنے مقصد کے لئے کلمات کو بنا رکے لگا تار پڑھنا ہے ایک مقررہ وقت پر۔"

بابا اونچی آواز میں بولنے لگے۔ "ایک منٹ......" بابا بولتے بولتے رک گئے۔

"کیا ہوا بابا جی۔" انعم نے پوچھا۔

"وہ کس جگہ بیٹھ کر وظیفہ کرتی تھی......" بابا کے پوچھنے پر انعم ان کو اس جگہ لے گئی تو بابا نے مصلہ بچھایا اور دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد انہوں نے پانی پر دم کر کے شبانہ کو پلایا۔

پانی پینے کے بعد شبانہ یک دم آنکھیں کھول کر اور تازہ دم ہو کر بیٹھ گئی۔

"شاہد بیٹا...... تم دونوں میاں بیوی ہو اسلام میں نکاح کی اہمیت ہے، شبانہ کا ہاتھ مت چھوڑنا۔"

"میں کلماش کو بلانے لگا ہوں۔" بابا جی نے سفید چادر بچھا کر کہا۔ شاہد نے شبانہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ انعم نے رومی کو سینے سے لگا لیا۔ بابا نے اونچی آواز میں قرآنی آیات پڑھا اس کے بعد وہ منہ ہی منہ میں ورد کرنے لگے۔ کمرے کا ٹمپریچر کم ہوتا جا رہا تھا حتیٰ کہ کمرے میں اتنی ٹھنڈ ہو گئی کہ سب کانپنے لگے۔

اچانک کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ مارے خوف سے سب کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ تھوڑی دیر اندھیرا رہنے کے بعد اچانک کمرے میں سفید روشنی نمودار ہوئی اور کمرہ روشن ہو گیا۔

شبانہ کے پاس کوئی مرد بیٹھا تھا جو شاہد اور شبانہ کے ہاتھوں کو گھور رہا تھا۔

''کلماش۔'' بابا نے اونچی آواز میں پکارا تو اس جن نے بابا کی طرف دیکھا۔

''یہ جو اس کے ساتھ بیٹھا ہے، یہ اس کا شوہر ہے۔'' بابا نے شاہد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم انسان نہیں ہو...... اللہ نے انسان کے لئے انسان اور جنات کے لئے جنات پیدا کئے ہیں۔ انسان اور جن کا ملاپ نہیں ہوسکتا۔''

''اس کی غلطی یہ ہے کہ یہ میرے نکاح میں شامل ہوگئی ہے۔ یہ انسان ہے تو کیا ہوا میں ابھی اس کو جننی بنادوں گا۔'' کلماش بغیر ہونٹ ہلائے بول رہا تھا۔

''نکاح پر نکاح نہیں ہوتا کلماش...... تم کیسے اسے اپنی بیوی بول سکتے ہو۔'' بابا اب غصے میں آنے لگے تھے۔

''چار دن پہلے یہ میرے نکاح میں آئی۔ میں تو اب اس کو اپنی دنیا میں لے کر جاؤں گا۔''

کلماش کی بات سن کر بابا نے آگ جلائی ورد کرنے لگے۔ کلماش کے ہونٹ کھلے اور وہ چیخنے لگا۔

ٹھہرو ...... بابا...... میرا کوئی قصور نہیں میں تو بس افہام کے گھر پر رہتا تھا اور مجھے اندر آنے کی دعوت بھی افہام کی بیوی نے ہی دی تھی پھر میں اس کے گھر پر رہنے لگا۔

ایک دن شبانہ نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میرا نکاح وادئ جن میں رہنے والی ایک جننی سے ہو رہا تھا جس کے درمیان میں شبانہ نے مجھے بلایا اور نکاح کے کلمات بولنے لگی۔ شبانہ مجھے پسند آگئی تھی اس لئے اب میں اس کو اپنی وادی میں لے جاؤں گا۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔'' کلماش گلا پھاڑ پھاڑ کر بول رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے بہت سے شیر مل کر دھاڑ رہے ہوں۔'' بابا نے اپنی پڑھائی کا عمل تیز کردیا۔ بابا کے سامنے آگ کا الاؤ روشن ہوگیا جو بابا کی طرف شعلے پھینک رہا تھا لیکن پاک کلام کی برکت سے بابا محفوظ تھے فضا میں زوردار دھماکہ ہوا اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

کلماش فنا ہو چکا تھا۔ خدا کے کلام میں اور خدا کے کام میں بے حد برکت ہوتی ہے۔ بابا نے اٹھ کر شاہد کو گلے لگالیا۔ ''تم لوگوں کو نئی زندگی مبارک ہو۔'' بابا نے شاہد کا ماتھا چوما اور شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''لیکن بابا ایک بات سمجھ نہیں آئی وہ کون سے نکاح کا ذکر کررہا تھا۔'' شاہد نے بابا سے پوچھا۔

''بیٹا ہوا کچھ یوں کہ...... شبانہ اپنی جلد شادی کا جو وظیفہ کرتی تھی وہ مستند نہ تھا۔ کسی نے شرارتاً نیٹ پر وہ وظیفہ اپ لوڈ کردیا تھا یا پھر وہ قواعد وضوابط لکھنا بھول گیا ہوگا۔ شبانہ زوال کے وقت بھی قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی۔'' بابا نے کہا۔

''زوال کے وقت...... مطلب۔'' شبانہ نے سوال دہرایا۔

''زوال کے وقت سے مراد وہ وقت جب سورج آپ کے سر پر ہو اور آپ کا سایہ نا بنتا ہو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ کی بنائی ہوئی دوسری مخلوقات اپنی مخصوص عبادات کررہی ہوتی ہیں۔ شبانہ نے احتیاط نہیں کی اور یہ کلماش کے نکاح میں آگئی۔ حالانکہ یہ نکاح نہیں تھا جو تم دونوں کا نکاح ہے۔ وہی اصل نکاح ہے۔

لیکن شبانہ بیٹا کبھی بھی ایسا وظیفہ مت کرنا جس میں مستند ہونے کی گارنٹی نہ ہو، اور ہمیشہ زوال کے وقت کا خیال رکھنا۔ ٹھیک ہے۔'' بابا نے شبانہ کو سمجھایا۔

''ٹھیک ہے بابا۔'' شبانہ نے آہستہ سے کہا۔

''بلکہ اب تمہیں کسی وظیفے کی ضرورت نہیں میں آج شام کو ہی تمہیں اپنے گھر رخصت کرکے لے جاؤں گا۔'' شاہد نے شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر شبانہ نے بے یقینی کا اظہار کیا۔

''خوش رہو بیٹا......'' بابا نے دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ انعم نے شادی کی پلاننگ شروع کردی، شبانہ اور شاہد اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچنے لگے۔

آخری رسومات

پیا سحر۔ گجرات

12 سالہ بچی کی سوچوں کا جب تسلسل ٹوٹ گیا تو وہ گھاس کی طرف بڑھ گئی اور پھر جیسے ہی وہ گھاس میں داخل ہوئی تو بہت سارے جگنو جاگ کر اس کے ارد گرد اڑنے لگے کہ پھر اچانک......

رات کا اندھیرا ہر طرف مسلط تھا اچانک دل دہلاتی آواز آئی، ریڑھ کی ہڈی میں لہر دوڑاتی کہانی

''**رینی** کو پتہ نہیں کیا ضرورت پڑی تھی اس جنگل میں آکر ساری دنیا سے الگ تھلگ ہوکر گھر بنوانے کی''

وہ بڑبڑاتے ہوئے سوٹ کیس کو بمشکل اٹھاتے ہوئے گھر کے باہر بنی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

ایلی پہلی بار اپنی نانی کے ہاں چھٹیاں گزارنے ہیوسٹن آئی تھی۔

اس کی ماں ایما نیویارک میں نوکری کے سلسلے میں آئی تھی اور پھر یہیں مقیم ایک برطانوی شخص لوی فر سے اپنے ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کرکے یہیں کی ہوکر رہ گئی جس پر اسکے ماں باپ نے اس سے مایوس ہوکر قطع تعلق کرلیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اپنے ماں باپ سے رابطہ بحال ہوا لیکن وہ ایک ہی بار واپس جا سکی جب ایلی کے نانا کا انتقال ہوا

لیکن ایلی کو کبھی اپنے ننھیال جانے کا موقع نہ ملا۔

اب جب ایلی بیس سال کی ہو چکی تھی اس کی ماں ایما کو ایلی کی نانی کا خط موصول ہوا جس میں اس نے اپنی بیٹی ایما سے التجا کی کہ وہ بہت بیمار ہے اور کسی بھی وقت مر سکتی ہے لہٰذا ایک بار وہ اپنی نواسی کو دیکھنا چاہتی ہے۔ ایلی کی ماں نے اسے بمشکل جانے پر راضی کیا اور وہ کرسمس کی چھٹیاں ہونے پر ہیوسٹن آ گئی۔

ایلی کی نانی گرینی ایک جنگل کے کنارے بسے چھوٹے سے قصبے میں آبادی سے تھوڑا دور رہتی تھی۔ اس کا گھر درختوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ دور سے نظر نہیں آتا تھا۔

ایلی نے دروازے پہ آہستہ سے دستک دی۔ اس کی نانی نے دروازہ کھول کر اسے دیکھتے ہی گرمجوشی سے گلے لگا لیا۔

"یہ تو کہیں سے بھی بیمار نہیں لگتی ہیں"

وہ عادتاً بڑبڑائی لیکن اس کی نانی نے یہ بڑبڑاہٹ سن لی اور دھیرے سے مسکرائی۔

"ہاں میں بیمار نہیں تھیں۔ لیکن اگر میں ایسا بہانا نہ کرتی تو تمہاری ماں تمہیں مجھ سے ملنے کے لئے کبھی نہ بھیجتی۔ وہ شروع سے ہی ایسی تھی۔ لاپرواہ اور صرف اپنے لیے جینے والی۔"

ایلی نے اس بات کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے گرینی کا چھوٹا مگر صاف ستھرا گھر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

دیواروں پر بہت سارے حشرات کے اجسام فریم شدہ تھے جن میں زیادہ تر تتلیاں تھیں۔ کچھ دیواروں پر جانوروں کی کھالیں اور جنگل کے متعلق بنی مختلف پینٹنگز آویزاں تھیں۔

"بہت خوبصورت"

اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"تمہیں پسند آیا؟"

اس کی گرینی نے جوش سے بھرپور آواز میں کہا۔

"تمہارے گرینڈ پا کو بہت شوق تھا آبادی اور شور وغل سے دور کہیں گھر بنانے کا۔ تمہارے گرینڈ پا کو جنگلات سے عشق تھا۔"

اس کی گرینی نے بے تکان بولتے ہوئے کہا۔

ایلی کو اندازہ ہوا کہ اس کی گرینی اس کے آنے سے بہت خوش تھیں۔ تبھی وہ نہایت جوش وخروش سے اسے ہر بات بتا رہی تھیں۔ اسے وہ بہت مہربان اور اچھی لگ رہی تھیں۔

"گرینی میں بہت تھک گئی ہوں۔"

اس نے نرمی سے کہا۔

"اوہ! میں بھی کتنی بھلکڑ ہوں۔ چلو فریش ہو کے آجاؤ پھر کھانا کھا کر سو جانا۔" گرینی نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اگلی صبح ایلی نے گرینی کے ساتھ ناشتہ کیا اور ان ڈھیر ساری باتیں کیں۔ وہ اس سے بہت محبت سے پیش آ رہی تھیں۔ ایلی کو وہ بہت اچھی لگیں اور اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ اب تک ان سے دور رہی۔

"گرینی کیا باہر جنگل میں خطرناک جانور بھی رہتے ہیں؟"

اس نے اپنی گرینی سے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں پیاری یہاں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے بے ضرر جانور رہتے ہیں۔ ہاں اندر کی طرف جاتے ہوئے جنگل گھنا ہوتا جاتا ہے اور وہاں پر ریچھ اور زہریلے سانپ اور دوسرے بڑے جانور بھی رہتے ہیں۔ یہ جانور بہت ہی کم اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔"

گرینی نے اسے تفصیلاً بتاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے نانا اور میں نے اپنی پوری زندگی یہیں گزار دی اور ہم نے ایک بات سیکھی۔ جنگل اور اسکے جانوروں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں یہ اپنے چاہنے والوں سے کبھی بے وفائی نہیں کرتے۔"

گرینی مسکراتے ہوئے مزید گویا ہوئیں۔

"کیا میں جنگل دیکھنے جا سکتی ہوں گرینی؟"

ایلی نے پرجوش ہو کر ان سے اجازت چاہی۔

"ہاں لیکن تم ابھی یہاں نئی ہو اس لیے زیادہ دور مت جانا ورنہ راستہ گم کر بیٹھو گی۔" گرینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور ایلی اپنی گرینی سے گلے مل کر باہر کی طرف ہو لی۔

ایلی نے نیلی جینز پر سفید شرٹ کے اوپر نیلا کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ گردن میں اس نے سرخ رنگ کا مفلر لپیٹا ہوا تھا۔

اس جنگل میں مختلف اقسام کے درخت اگے ہوئے تھے۔ جن کے پتوں سے روشنی چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی اور ایک عجیب سا پرفسوں ماحول پیدا کر رہی تھی۔ ایک پرسکون سناٹے نے پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ درختوں پر مختلف پرندوں کی چہچہاہٹ اس خاموشی میں ایک عجیب سا ترنگ پیدا کر رہی تھی۔ وہ مسحور ہو کر آگے بڑھتی رہی۔

یکدم اسے کسی جانور کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔

اس نے غور کیا تو اسے آواز اپنے دائیں طرف چند قدم کی دوری پر موجود ایک جھاڑی کے پیچھے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ تھوڑا گھبرا گئی لیکن پھر ہمت جمع کر کے دبے پاں جھاڑی کے نزدیک ہوتی گئی۔

اس نے ذرا سا آگے ہو کر جھانکتے ہوئے دیکھا تو اسے ایک سفید رنگ کا خرگوش نظر آیا جس کی ایک ٹانگ زخمی تھی۔

"اوہ۔"

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ دھیرے دھیرے اس کے پاس جانے لگی۔ خرگوش اسے اپنے پاس آتا دیکھ کر گھبرا گیا اور اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے بھاگ نہ سکا۔

"گھبراؤ مت۔ میں دوست ہوں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

ایلی نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے پاس دو زانو ہو کر زمین پر بیٹھ گئی اور اسکو گود میں اٹھا لیا۔

وہ بہت ہی نرم سا تھا ایلی نے نرمی سے اس کی پشت پہ ہاتھ پھیرا اور پھر اس کی زخمی ٹانگ کا معائنہ کرنے لگی۔

"لگتا ہے اس جھاڑی کے سخت کانٹوں سے الجھ کر اس کی جلد ادھڑ گئی ہے۔"

ایلی نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

اس نے گلے سے لپٹا مفلر اتارا اور اس کا ایک سرا پھاڑ کر اس کی ٹانگ کے گرد لپیٹ کر باندھ دیا اور آہستگی سے اپنی انگلیاں اس کے سر پر پھیرنے لگی۔ خرگوش بھی اس کی گود میں اب اطمینان سے لیٹا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے خرگوش کو چھونے کی۔"

اسے اپنے پیچھے سے کسی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایلی نے یکدم چونک کر پیچھے دیکھا۔

ایک دس بارہ سالہ پنکی سفید اور سیاہ رنگ کے لانگ سکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے اور بالوں کی دو چٹیاں تھیں جن کے سروں پر سرخ ربن باندھا گیا تھا۔ اسکی رنگت معمول سے زیادہ سفید تھی جبکہ آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ ایلی نے اسے بغور دیکھا اور نرمی سے خرگوش کو زمین پر رکھ کے ہاتھ جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ لڑکی اب بھی اسے غصے سے گھور رہی تھی۔

"میرا اسے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ مجھے زخمی حالت میں جھاڑیوں کے پاس سے ملا۔ میں بس اس کی پٹی باندھ رہی تھی۔"

ایلی نے اسے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

لڑکی کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اور وہ سپاٹ انداز میں "شکریہ" کہہ کر خرگوش کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے خرگوش کو گود میں اٹھایا اور واپس مڑ گئی۔

''سنو پیاری لڑکی!''
ایلی نے بے ساختہ اسے پکارا۔
وہ اسکی طرف مڑی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
''میں یہاں مہمان ہوں۔۔میرا نام ایلی ہے۔۔میں اپنی گرینی کے ہاں چھٹیاں گزارنے آئی ہوں۔۔تمہارا کیا نام ہے؟''
ایلی نے اس سے دوستانہ انداز میں بات کرتے ہوئے کہا۔
''عینا''
وہ اپنا نام بتا کر پھر سے مڑ گئی۔ایلی کو وہ نجانے کیوں اچھی لگ رہی تھی۔وہ اس کے پیچھے دوڑی۔
''کیا تم اسی قصبے کی رہنے والی ہو؟''
''ہاں'' اس نے جواب دیا۔
''میں قصبے میں جانا چاہتی ہوں۔۔لے چلو گی؟''
''ہوں''
''تمہارے گھر میں کون کون رہتا ہے؟''
''کیا تم مجھے پریشان کرنا بند کرو گی؟'' عینا نے اس سے غصیلے لہجے میں کہا۔
''کیا تم میری دوست بنو گی؟''
''نہیں''
اس نے یک لفظی جواب دیا تو ایلی مایوس ہو گئی۔
''اچھا تم کل آؤ گی؟''
''پتہ نہیں''
وہ پھر سے سپاٹ لہجے میں بولی۔
ایلی افسردہ ہو گئی۔
''او کے عینا۔۔گرینی لنچ پہ میرا ویٹ کر رہی ہوں گی۔بائے''
ایلی اسے بائے کہہ کر واپس مڑ گئی۔گھر آ کر اس نے بہت جوش سے گرینی کو جنگل کے بارے میں بتایا کہ اس نے وہاں کیا کیا دیکھا۔اسے جنگل بہت پسند آیا تھا۔اس نے زخمی خرگوش کے بارے میں بھی بتایا مگر وہ عینا کے بارے میں بتانا بھول گئی۔اس کی گرینی مسکرا مسکرا کر اس کے جوشیلے انداز کو دیکھتی رہیں۔حیرت انگیز طور پر ایلی کو عینا کے بارے میں کچھ یاد ہی نہیں رہا۔اس کے بارے میں کوئی بھی خیال اس کے ذہن سے نہیں گزرا اور وہ اس کے دماغ سے ایسے محو ہو گئی جیسے کبھی اس سے ملی ہی نا ہو۔
رات کو وہ ڈنر کر کے گرینی کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔
اس کے کمرے کی کھڑکی جنگل کی طرف کھلتی تھی۔ایلی نے اسے جا کر کھول دیا۔تازہ اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس سے آن ٹکرایا۔اس نے آنکھیں بند کر کے اسے محسوس کیا اور پھر نائٹ بلب آن کر کے بیڈ پر لیٹ گئی اور اپنے سینے تک کمبل تان لیا۔
ابھی اسے آنکھیں بند کیے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے سرگوشی میں اسے پکارا ہے۔اس نے آنکھیں فوری کھول دیں اور سانس روک لی۔کچھ دیر تک غور کرتے رہنے کے باوجود اسے کچھ نہ سنائی دیا تو اس نے وہم سمجھ کر سر جھٹکا اور مسکرا کر کروٹ بدل لی۔
''ایلی''
اسے اپنے بالکل پیچھے سے سرگوشی سنائی دی۔جیسے کوئی اس کی پشت کی طرف ہو اور اسے پکار رہا ہو۔
ایلی بہت خوفزدہ ہو گئی۔اس نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔چند ثانیے ایسے ہی پڑے رہنے کے بعد اس نے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے کوئی نہ تھا۔اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہونے لگے۔
ایلی نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پہ پڑے لیمپ کا بٹن آن کیا۔پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔
تھوڑی دیر وہ چت لیٹی چھت کو گھورتی رہی اور پھر نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح بہت ہی روشن اور چمکدار تھی۔وہ فریش ہو کر جب آئی تو گرینی پودوں کو پانی لگا رہی تھیں۔اس نے پیچھے سے جا کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں

اور ان کے گال سے گال ملا کر انہیں مارننگ وش کی۔وہ ان سے بالکل بے تکلف اور حد درجہ مانوس ہو چکی تھی۔اس کی ساری نروس نیس اور ہچکچاہٹ ختم ہو گئی تھی۔اس میں اس کی گرینی کا بہت ہاتھ تھا۔
''گڈ مارننگ گرینی''
''مارننگ میری جان''
انہوں نے اس کے دوسرے گال پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔
''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔چلو ناشتہ کرتے ہیں۔''
گرینی کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر جنگل کی سیر کو نکل آئی۔
ایلی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔وہ جنگل کی خوبصورتیوں اور پرندوں کی چہچہاہٹوں کے سحر میں جکڑی کافی دور نکل آئی تھی۔
جنگل کا یہ حصہ کافی گھنا اور تاریک تھا۔درختوں کی ٹہنیوں سے لمبی بیلیں لٹک رہی تھیں۔اور اس کی زمین پتوں اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوئی تھی۔کہیں کہیں درختوں کے ٹہنے گرے پڑے تھے اور گلہریاں پھدکتی پھر رہی تھیں۔
وہ کافی تھک چکی تھی اس لیے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
اسے یکدم کسی بچے کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔
وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔آواز اس کی پشت پہ ابھری تھی۔
''اتنے گھنے جنگل میں کوئی بچہ کیا کر رہا ہے۔''
اس نے خود کلامی کی اور وہیں بیٹھے بیٹھے تنے کی اوٹ سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔سامنے کا منظر اسے حیران کر گیا۔
عینا زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے بہت سارے خرگوش اور گلہریاں نیم دائرے کی سی شکل میں بیٹھی تھیں۔اور اس کے آس پاس درختوں

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کی دستیابی

اختر بک ڈپو
فیصل بازار سرگودھا

سید نیوز ایجنسی
مین بازار دینہ
PH:0300-9528023

طارق بک ڈپو
لوہاری بازار سیالکوٹ
PH:052-4568440

محمد ناصر شیخ نیوز ایجنٹ
بھیرہ ضلع سرگودھا
0301-6799177

جھنگ نیوز ایجنسی
کمالیہ روڈ نزد ٹوبہ ٹیک سنگھ
PH:0321-7531597

معصوم نیوز ایجنسی
اسٹیشن روڈ جھنگ صدر
0333-8103489

سلطانی نیوز ایجنسی
لاری اڈہ چکوال
0334-8761952

پہ بہت ساری چڑیاں اور دوسرے پرندے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

"عینا یہاں پر"

ایلی بہت حیران ہوئی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس طرف بڑھ گئی۔

تمام خرگوش اور گلہریاں اس کے قدموں کی آہٹ پا کر ادھر ادھر بکھر گئے اور پرندے بھی اڑ گئے۔

عینا نے خاصی ناراضگی سے اس کی طرف دیکھا۔ اور غراتے ہوئے بولی:

"تم نے میرے دوستوں کو ڈرا دیا۔"

"او آئی ایم سوسوری۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

ایلی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

عینا کچھ نہیں بولی بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ایلی نے اس کی نگاہوں میں برف کا سا سرد تاثر پایا۔ نجانے کیوں اس کے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

"عینا تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔ ڈر کیوں۔۔ یہاں سب میرے دوست رہتے ہیں۔"

عینا نے قدرے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم یہاں روز آتی ہو؟"

"ہاں"

عینا نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اپنے دوستوں سے تو مجھے ملواؤ۔"

ایلی نے ملائمت سے کہا۔

"نہیں" عینا سختی سے بولی۔

"اب تمہیں یہاں سے جانا چاہیے"

اس نے درشتی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور ایلی کا سر خود بخود وہاں میں ہل گیا اور وہ فوراً اٹھ کر واپس ہو لی۔

عینا کے ہونٹوں پر ایک ناقابلِ فہم مسکراہٹ پھیل گئی۔

ایلی جنگل سے واپس آئی تو کھوئی کھوئی سی تھی۔ گرینی نے اس سے جنگل کی بابت پوچھا تو اس نے جو جو دیکھا سب انہیں بتا دیا جبکہ حیرت انگیز طور پر عینا کا ذکر کرنا آج پھر بھول گئی تھی۔ اور وہ اس کے ذہن سے مکمل طور پر محو ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

ایلی نے گرینی کے ساتھ مل کر گھر کی سیٹنگ تبدیل کی۔ رات کو وہ تھک ہار کر بستر پر لیٹ گئی۔

ابھی اسے لیٹے چند ثانیے گزرے ہی تھے کہ اسے لگا ایک ہاتھ مٹی سے اٹا اس کے چہرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کسی نے پورے کا پورا ہاتھ اس کے چہرے پہ رکھ کر اسے ڈھانپ لیا۔ ایلی کی سانسیں رک گئیں۔

"ایلی"

پھر سے وہی سرگوشی اس کے کانوں کے پاس سے ابھری۔

وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھی اور جلدی سے لیمپ آن کیا۔ کمرے میں کہیں پر کوئی بھی نہیں تھا۔

اس نے سائڈ ٹیبل پہ پڑا پانی کا جگ اٹھایا اور لبوں سے لگا لیا۔

پانی پیتے ہوئے اس کی نظر جنگل کی طرف کھلتی کھڑکی پہ پڑی۔

اس نے دھیرے سے جگ لبوں سے ہٹایا اور حواس باختہ ہو کر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی میں عینا بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

"لگتا ہے تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا۔ میں نے تمہیں چیخ مار کر اٹھتے ہوئے دیکھا۔ ایلی تم اتنی بڑی ہو کر ڈرتی ہو۔ ہاہاہا"

عینا اس کا مذاق اڑاتے ہوئے ہنسی۔

ایلی جلدی سے بیڈ سے اتر کر کھڑکی کی طرف آئی۔

"تم اس وقت یہاں کیسے۔ اور کھڑکی پہ کیسے چڑھی؟ چلو اندر آ کر جاؤ گی۔"

ایلی نے اس سے قدرے ناراضگی سے کہا۔ عینا نے کچھ کہا نہیں بس اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

ایلی اس کے اس انداز پر مسکرا دی اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔ عینا کا ہاتھ برف سے بھی زیادہ سرد تھا۔

"اوہ۔۔ تمہیں تو اچھی خاصی ٹھنڈ لگ رہی ہے دیکھو تو تمہارے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں اور چہرہ بھی سفید پڑ رہا ہے۔"

ایلی تشویش سے بولی اور اس کا ہاتھ تھامے آتش دان کی طرف بڑھ گئی۔

عینا نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پیچھے ہٹی۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔"

"میرے ساتھ جنگل چلو نا مجھے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔۔"

وہ ایلی سے چند قدم کا فاصلہ بناتے ہوئے بولی۔

"اس وقت؟ ایک تو باہر بہت سردی ہو گی دوسرا گرینی منع کر دیں گی۔۔"

ایلی نے وال کلاک پہ نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تمہاری گرینی کو کون بتائے گا۔۔ ہم کھڑکی سے جائیں گے۔"

عینا نے پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نن۔۔ نہیں میں اس وقت نہیں جا سکتی۔۔ مم۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے"

ایلی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

عینا کا چہرہ اتر گیا۔

"آئندہ میرے پاس کبھی مت آنا"

عینا نے قدرے درشتی سے کہا اور کھڑکی کی جانب بڑھ گئی۔

"رکو۔۔ میں تیار ہوں"

ایلی نے اسے جلدی سے روکا تو عینا کا چہرہ کھل اٹھا۔

وہ دونوں کھڑکی سے کود کر جنگل کی طرف بڑھ گئیں۔ پورے جنگل پر خاموشی کا راج تھا۔ کبھی کبھی کسی جانور یا پرندے کی آواز گونجنے لگتی۔ ہلکی ہلکی دھند نے جنگل کو اپنی لپیٹ رکھا تھا۔ ایلی کو شدید سردی کا احساس ہوا تو اس نے اپنے ہاتھ بغلوں میں داب لیے۔

عینا اس کا ہاتھ پکڑ کر جنگل کے بیچوں بیچ ایک درخت کے پاس لے آئی۔

ایلی کو عجیب سا خوف آ رہا تھا۔ وہ دل میں خود کو کوس رہی تھی کہ وہ اس وقت کیوں جذباتی ہو کر عینا کے ساتھ چلی آئی۔

عینا نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ایلی کو لگا کہ اس کی آنکھیں کسی انگارے کی مانند دہک رہی تھیں۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ کوئی چھوٹی سی بچی جنگل کے بیچوں بیچ اتنے اطمینان سے کیسے کھڑی رہ سکتی تھی جبکہ اس کو پسینے آ رہے تھے۔

"تم یہاں رکو میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔"

عینا نے اسے کہا تو اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ ایک طرف اگی گھاس کی طرف بڑھ گئی۔

جیسے ہی وہ گھاس میں داخل ہوئی بہت سارے جگنو جاگ کر اس کے اردگرد اڑنے لگے۔

وہ یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

عینا دونوں بازو فضا میں کھولے اب گول گول چکر لگا کر قہقہے لگانے لگی۔ اس کے قہقہوں سے جنگل گونج اٹھا۔

ایلی کو خوف محسوس ہونے لگا۔

یکدم وہ زمین پہ بیٹھ کر گھٹنوں میں سر دے کر دردناک آواز میں رونے لگی۔

ایلی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"عینا"

اس نے دھیرے سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔

عینا نے دھیرے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

ایلی کی زوردار چیخ نکل گئی کیونکہ عینا کا آدھا چہرہ کچلا ہوا تھا اور اس سے خون ابل رہا تھا۔

ایلی فوراً اٹھی اور اندھا دھند بھاگنے لگی۔

☆......☆......☆

ایلی پورا ہفتہ بخار میں پھنکتی رہی مگر گرینی کو کچھ نا بتا سکی۔

ساتویں شب وہ پھر عینا کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئی۔

اسے یکدم محسوس ہوا کہ کوئی اس کا نام پکار رہا ہے۔

''ایلی''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مگر اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔

اسے محسوس ہوا کہ کوئی بالکل اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ یکدم پیچھے مڑی لیکن وہاں پر کوئی نہ تھا۔

اس کے کمرے کے باہر سے قدموں کی چاپ ابھری۔

اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور چلائی۔

''گرینی''

لیکن سامنے کوئی نہیں تھا۔ گرینی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر آئیں۔

''کیا ہوا ایلی؟''

انہوں نے بمشکل جماہی روکتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔

''وہ۔۔ابھی یہاں پر کوئی تھا۔۔مم۔۔مجھے لگا آپ ہیں۔''

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ گرینی نے پہلے اسے حیرت سے دیکھا اور پھر مسکرا دیں۔

''لگتا ہے تم نیند میں ڈر گئی ہو۔''

انہوں نے شفقت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید''

اس نے افسردگی سے کہا اور ان سے معذرت کرتی دوبارہ کمرے میں چلی گئی۔

وہ جیسے ہی لائٹ آف کر کے بیڈ پر جانے لگی۔ اس کے کمرے میں سسکیوں کی آواز گونجنے لگی۔

وہ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

ایک کونے میں اسے کوئی گھٹنوں میں سر دیئے روتا نظر آیا۔ وہ دبے قدموں ڈرتی ڈرتی اس کے پاس گئی۔

''کون ہو تم اور میرے کمرے میں کیسے آئی۔۔؟''

اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

اس نے یکدم سر اٹھایا تو وہ کوئی اور نہیں عینا تھی۔ ایلی کے اوسان خطا ہو گئے۔

''کک۔۔کون ہو تم اور۔۔مم۔۔مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو؟''

ایلی نے ہمت جمع کرتے ہوئے کہا۔

عینا اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ اس کے کپڑے مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ البتہ چہرہ پہلے کی طرح صاف شفاف تھا۔

''ایلی میری مدد کرو پلیز۔'' وہ ملتجی ہوئی۔

''میرے ساتھ ایک بار جنگل میں چلو۔''

اس نے اس سے التجا کی۔

''ہرگز نہیں۔۔''

ایلی نے سختی سے تردید کر دی۔

عینا کی آنکھیں ایک بار پھر دہکتے انگارے کی سی ہو گئیں اور ان سے خون بہنے لگا۔

ایلی ڈر سے تھر تھر کانپنے لگی۔

''چلو میرے ساتھ۔۔''

اس نے حکمیہ کہا اور ایلی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

وہ دونوں آج پھر جنگل کے بیچوں بیچ تھیں۔

دفعتاً وہ اسے لیکر جنگل کے نسبتاً تاریک گوشے میں لے گئی۔

اس نے اردگرد آنکھیں پھاڑتے ہوئے دیکھا۔ اچانک ایک منظر نے اس کی روح فنا کر

دی۔ اس نے فوراً اپنے لبوں پہ سختی سے ہاتھ دھر کے اپنی چیخوں کا گلا گھونٹا۔

ایک آدمی جس نے پادری کا سا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اسکی لاش درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں نکالی جا چکی تھیں اور گردن میں درخت کی شاخ دھنسی ہوئی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ایلی کے پاس آئی۔ ایلی ڈر کر پیچھے کی جانب بڑھنے لگی اور پھر ایک درخت کے تنے سے ٹکرا کر رک گئی۔ عینا اس کے بالکل قریب آئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں ایلی کی کن پٹیوں پہ رکھ دیں۔ ایلی پہ غنودگی طاری ہونے لگی۔

☆......☆......☆

''یہ لڑکی ہمارے قصبے کے لیے منحوس ہے۔۔یہ شیطان کی بچی ہے اسے یہاں سے نکال دیا جائے۔۔''

ایک پادری چلا چلا کر لوگوں سے کہہ رہا تھا۔

لوگوں کا ایک ہجوم اس کی بات نہایت غور سے سن رہا تھا۔ کچھ کی نظروں میں ترحم تھا اور کچھ کی نظروں میں نفرت۔۔۔لیکن کوئی بھی پادری کے آگے بولنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے لیے انکا پادری خدا برابر تھا۔

چالیس سالہ پادری کی آنکھیں شیطانیت سے چمک رہی تھیں۔

''یہ جب تک ہمارے قصبے میں رہے گی ہمارا قصبہ آفتوں کا شکار رہے گا۔۔لہٰذا اسے دور کہیں جنگل میں پھینک آؤ اور دوبارہ قصبے میں داخلے پر پابندی لگا دو''

اس نے نفرت سے ایک طرف سہمی ہوئی بارہ سالہ بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے بلیک اور وائٹ رنگ کا سیاہ لانگ اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ لوگوں سے مانگ کر کھاتی پیتی تھی۔ اس پادری کو نجانے اس بچی سے اچانک سے کیا مسئلہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو اس سے نفرت دلانے لگا۔

تائید اور اختلاف

بنی آدم اختلاف سے اتنا کمزور نہیں پڑتا جتنا کہ دستیاب تائید سے طاقت پکڑ لیتا ہے۔ اس لئے غلط سوچ، غلط بات یا غلط عمل کی تائید اس اختلاف سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ جو کسی درست سوچ، درست بات یا درست عمل سے کیا جائے گا۔

لہٰذا! اختلافی آوازوں کی نسبت تائیدی الفاظ اور رویے کہیں زیادہ احتیاط کے متقاضی ہوتے ہیں۔

اختلاف کے سامنے حق پر ڈٹے رہنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

جبکہ تائید کی موجودگی میں ناحق سے ہٹنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

(ایس حبیب خان-کراچی)

لوگوں نے پادری کی مانتے ہوئے اسے جنگل میں پھینک آئے۔ جوں جوں شام کے سائے پھیلنے لگے وہ خوفزدہ ہوتی گئی اور پھر ایک درخت کے تنے سے چپک کر رونے لگی۔

دفعتاً اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اسے سامنے سے وہی پادری آتا دکھائی دیا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس گئی۔

''فادر۔۔فار گاڈ سیک مجھے واپس لے چلیں۔۔میں۔۔مجھے یہاں ڈر لگتا ہے اور بھوک بھی لگی ہے۔۔''

''ہاں ہاں لے چلوں گا بچے۔۔پہلے میری کچھ مدد کرو۔۔''

پادری نے خباثت سے مسکرا کر اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا۔

وہ ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے بے لباس کرنے کی کوشش کی۔ وہ چونک گئی۔ اس نے اسے زور سے دھکا

دیا اور ایک طرف اندھا دھند دوڑنے لگی۔ پادری بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

سامنے اسے ایک گھر بنا نظر آیا تو وہ جا کر دیوانہ وار اس کا دروازہ بجانے لگی۔

ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور درشتی سے اسے پوچھا۔

''مسز ولسن پلیز میری ہیلپ۔۔۔''

ابھی اس کی بات آدھی ہی تھی کہ مسز ولسن نے ''دفع ہو جا'' کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ انکا دروازہ پیٹنے لگی۔

پادری اس کے سر پہ آن پہنچا اور اسے دبوچ کر جنگل کے بیچوں بیچ گھسیٹ کر لے گیا۔ اور پھر وہ گھٹیا کھیل کھیلا کہ شیطان نے بھی گھبرا کر آنکھیں میچ لیں۔

جب وہ اپنی ہوس مٹا کر فارغ ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس لڑکی کی سانسیں مدھم چل رہی تھیں۔

''اگر یہ بچ گئی تو قصبے میں جا کر سب کو بتا دے گی۔۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اور ارد گرد نگاہیں دوڑانے لگا اور پھر اس کی نظر ایک پتھر پہ پڑی۔ اس نے تیزی سے جا کر وہ پتھر اٹھایا اور اٹھا کر اس لڑکی کا سر کچل دیا۔

وہ چند ثانیے تڑپنے کے بعد دم توڑ گئی۔

اس نے اس کی لاش کو گھسیٹا اور جنگل کے ایک سنسان اور تاریک گوشے میں لے جا کر زمین پہ پڑے ایک درخت کے تنے کے پیچھے چھپا دی۔

☆......☆......☆

جب عینا نے انگلیاں ہٹائیں تو ایلی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ جیسے یکدم سے نیند سے بیدار ہوئی ہو۔

ایلی نے دیکھا کہ عینا سر جھکا کر کھڑی تھی۔ اس نے اسے دھیرے سے پکارا۔

''عینا''

اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوں سے تر تھا۔ ایلی کو اس سے کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ بلکہ اسے اس پر بہت ترس آیا۔

''تم نے اپنا بدلہ تو لے لیا۔ اب تمہیں میری کیا مدد چاہیے۔۔''

اس نے نرمی سے پوچھا۔

عینا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے گئی۔ ایلی نے دیکھا ایک درخت کے پیچھے ایک بچی کا ڈھانچہ پڑا تھا جس پہ ویسے ہی کپڑے تھے جیسے عینا نے پہن رکھے تھے۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم میری آخری رسومات ادا کرو کیونکہ مجھے تمہارے علاوہ کسی اور نے نہیں دیکھا اور نہ سن پایا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے پورے رسم و رواج کے ساتھ دفن کرو۔''

ایلی نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

☆......☆......☆

ایلی پہلی بار اس قصبے میں گئی۔ اسے وہاں کے لوگوں سے شدید نفرت ہوئی۔ اسے افسوس ہوا کہ اس کی اتنی مہربان اور شفیق گرینی نے بھی لاپرواہی برتی اور اس معصوم بچی کی مدد نہ کی۔

''ہیلو! میرا نام ایلی ہے۔ مجھے آپ کو کچھ ضروری بتانا ہے۔''

اس نے اپنے ماتحت سے بات کرتے انسپکٹر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ماتحت کو جانے کا اشارہ کیا۔

''یس۔۔۔ میں آپکی کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''یہاں سے تھوڑی دور جنگل میں میری گرینی کا گھر ہے۔ میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ جنگل میں گھومتے پھرتے میں نے دو لاشیں دیکھی ہیں۔''

اس نے پورے اعتماد کے ساتھ انسپکٹر کو بتایا۔ البتہ انسپکٹر اس کا آخری جملہ سن کر چونک پڑا۔

''کہاں کس طرف۔۔۔ کیا آپ ابھی ہمیں اس مقام تک لے چلیں گی۔''

''ضرور'' ایلی نے جواب دیا۔

وہ انہیں اس جگہ پر لے گئی جہاں پادری کی لاش لٹکی ہوئی تھی اور جہاں عینا کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

پولیس نے دونوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

اس پادری کی اور عینا کی آخری رسومات ادا کر کے انہیں دفن کر دیا گیا۔ ایلی چند دن وہاں رہی اور پھر گرینی سے مل کر عینا کی قبر پہ چلی آئی آج اس کی واپس نیویارک کی طرف فلائٹ تھی۔

عینا کی قبر پر پھول چڑھا کر ایلی ہٹی تو اسے اپنے کان کے پاس ایک سرگوشی سنائی دی۔

''تھینکس''

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''مس ایلی آپ ہمارے ساتھ آئیں ہمیں کچھ ضروری سوال کرنے ہیں آپ سے''

انسپکٹر اس کے قریب آ کر بولا۔

وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

اس سے کچھ سوالات پوچھے گئے اور اسے جانے کی اجازت مل گئی۔

اب وہ دروازے سے نکلنے لگی تھی کہ اسے انسپکٹر نے دوبارہ سے پکارا۔

''مس ایلی!''

اس نے مڑ کر اسے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''آپ شاید یہاں مسز ولسن کی موت کے بارے میں تحقیقات کرنے آئی ہیں۔۔''

اس نے ایلی سے پوچھا۔ ایلی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ اسے لگا کہ اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ دوسری طرف انسپکٹر اس کی کیفیات سے بے خبر بولنے لگا۔

''پچھلے سال دسمبر میں مسز ولسن اپنے گھر میں مردہ پائی گئیں کسی نے ان کا نرخرہ ادھیڑ کر رکھ دیا تھا اور پادری کی طرح ان کی بھی آنکھیں نکال دی گئی تھیں۔''

ایلی کو اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ہم بہت جلد ڈھونڈ لیں گے کہ کون ہے جو لوگوں کا اس طرح قتل کر رہا ہے۔۔''

انسپکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

ایلی نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ پولیس اسٹیشن سے نکل آئی اس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے اسے پتہ تھا کہ یہ کام کس کا تھا۔ عینا نے ان سے بھی بدلہ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

دفعتاً اس کے دماغ میں ایک کوندا لپکا۔ اس نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک خط نکال لیا۔

اس نے اسے کھول کر دیکھا تو اس پر پچھلے ماہ کی تاریخ لکھی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔ اگر واقعی گرینی مر چکی ہیں تو میرے ساتھ کون رہا اب تک اور یہ خط کس نے لکھا۔

وہ شدید خوفزدہ ہوگئی اس نے خط کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا۔ اور رات کی فلائیٹ سے نیویارک چلی گئی۔

جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کچھ پڑھ کر رو رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کا کندھا ہلایا۔

''مام۔۔۔ کیا ہوا؟''

''آں ہاں!''

اس کی ماں نے چونک کر اسے دیکھا اور گلے سے لگا لیا۔

''میں تمہاری گرینی کا خط پڑھ رہی تھی جو انہوں نے اس بار لکھا تھا۔ آئی مس ہر ایلی۔''

اس کی ماں پھر سے رو دی۔ جبکہ ایلی کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے اپنی ماں کے ہاتھ سے خط لیا۔ خط دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

یہ وہی خط تھا جو وہ ہیوسٹن میں پرزے پرزے کر کے پھینک آئی تھی۔

جلتے گلاب

عثمان غنی خان-پشاور

قسط نمبر:1

دو دلوں کا ملاپ اچانک چھناکے سے بکھر گیا، دونوں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر عجلت میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے اور جب ایسا ہوا تو ایک انوکھا شاخسانہ سامنے آیا تو انجان سفر کے باسی گھٹ کر رہ گئے لیکن جب وقت پلٹا تو......

ایک اچھوتی انوکھی دلک دلنواز، فرحت بخشتی دل دماغ کو گدگداتی شاہکار کہانی

جلتے گلاب کا پودا جس پر تین گلاب کے پھول تھے، اور تینوں ڈھڑ اڈھڑ آگ کے شعلوں میں جل رہے تھے، اس آگ میں ایک لڑکی کا عکس بھی نظر آرہا تھا، وہ چہرہ بہت خوبصورت تھا۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ جلتے گلاب کا یہ پودا، ایک ویران سنسان میدان میں اگا ہوا تھا۔ جس میں وہ گلاب کا پودا جلنے کے باوجود بالکل تروتازہ تھا۔ اور مرجھا نہیں رہا تھا۔ مگر اس پودے کو کوئی عام انسان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اسے صرف چند لوگ دیکھ سکتے تھے، وہ لوگ جنہوں نے جلتے گلاب کا پودا یہاں لگایا تھا۔ یا پھر وہ ایک لڑکا، جو اس لڑکی کی تلاش میں تھا۔ جو اس سے ایک سال پہلے گم ہوگئی تھی، اور اس کا عکس اس جلتے گلاب کے اندر دکھائی دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس آدمی نے خالی گھر میں موجود اپنے سامنے ایک گلاب کے خوبصورت پودے پر کچھ عمل کیا، اور اس گلاب کے اندر سے اس کی خوشبو باہر نکل آئی، وہ گلابی رنگ کا دھواں تھا، جو ہوا میں معلق ہوگیا۔ اس آدمی نے اس خوشبو کو نظروں ہی نظروں میں اپنے تابع کرلیا۔ اور پھر اسے آنکھوں سے اشارہ کرکے باہر گھر سے نکلنے کو کہا، وہ خوشبو چکراتی ہوئی، گھر سے باہر نکل آئی، اور رات کے اندھیرے میں محلے میں گھومتی ہوئی، ایک گھر کی دیوار سے اونچی ہوکر اندر چلی گئی۔ اب وہ دھواں جو گلاب کی خوشبو کا تھا۔ اس گھر کے ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے کے اندر دو لڑکیاں ساتھ بستر پر سو رہی تھیں۔ دھواں ایک لڑکی کے منہ اور ناک کے اندر داخل ہوگیا۔ اور وہ جیسے ہی اس کے اندر گیا، لڑکی کے اندر سے کچھ لمحوں بعد سفید دھواں باہر آیا، جو کہ اب اس کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ وہ اس کی روح تھی۔ جو کہ اب باہر جا رہا تھا۔ وہ روح حیران تھی مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اب دھوئیں کی شکل اختیار کرتی ہوئی اسی طرح گلی میں جا رہی تھی۔ اب وہ اسی گھر میں داخل ہوگئی، جس میں وہ آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ روح اس کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔

وہ گلاب کا پودا اب مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس شخص نے روح کو اپنی نظروں سے قابو میں کیا۔ اور وہ روح گلاب کے پودے میں جذب ہوتی دکھائی دی۔ وہ روح جیسے ہی اس میں داخل ہوئی، گلاب کا پودا دوبارہ کھل اٹھا۔

☆......☆......☆

وہ آدمی اپنے آفس میں بے چینی سے بیٹھا ہوا تھا، کچھ دیر بعد ایک الٹرا ماڈرن سی لڑکی اس کے سامنے آگئی، اور بالکل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اس کو دیکھ کر ویٹ پیپر میز پر گھمانا شروع کردیا۔ وہ آدمی بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی مکاری چھپی ہوئی ہے۔ وہ اس لڑکی سے کچھ کہا، وہ لڑکی اسے دیکھتی، ہنستی اور کچھ باتیں بتاتی رہی، وہ آدمی اسے اپنی بہو بنانا چاہتا ہے، مگر وہ کہتی ہے۔

''جب تمہارا بیٹا ہی مجھے اپنانا نہیں چاہتا ہے تو تمہارے چاہنے یا میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔'' وہ وہاں سے چلی جاتی ہے۔ وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اور غصے سے ٹہلنا شروع کردیتا ہے۔

☆......☆......☆

رات کے دو بجے، ایک کمرے وہ لڑکی کوے میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کے پاس قریب ہی صوفے پر اس کی بہن لیٹی ہے، جو سو رہی ہے، کوئی آدمی کمرے کا بند دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کلوروفارم سے بھرا ہوا رومال ہے، وہ اس صوفے والی لڑکی کے پاس جاتا ہے، اور رومال اس کے منہ پر رکھ دیتا ہے تو وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہوجاتی ہے۔ اب وہ قدم قدم کوے میں پڑی ہوئی لڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب وہ اپنے کپڑے اتار رہا ہے۔ اور اس لڑکی کو خمار آلود نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اپنی شرٹ اتارنے کے بعد وہ اس لڑکی کے اوپر جھک جاتا ہے، اور اس کے گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہے تو لڑکی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔

☆......☆......☆

اس آدمی کے دونوں کم سن بچے اغوا ہوجاتے ہیں، اور اغوا کار اسے اپنی بیٹیوں سمیت یہ شہر چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ وہ آدمی پریشان ہوجاتا ہے۔ مگر اپنے بچوں کی خاطر راتوں رات، گاڑی بلوا کر اپنا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں سے بہت دور کہیں کوچ کر جاتا ہے۔ اس کی بیٹیاں بہت پریشان ہیں۔ مگر وہ اپنے دونوں بیٹیوں کے لیے ان سے زیادہ پریشان ہے۔

☆......☆......☆

وہ لڑکی قبرستان میں کھڑی ہے، اور ایک طرف بھاگ رہی ہے۔ ایک قبر سے انسانی ہاتھ باہر آتا ہے۔ اور اسے پاؤں سے پکڑ لیتا ہے۔ وہ چیخ مارتی ہے، اور اس ہاتھ سے اپنا پیر چھڑا کر ایک طرف بھاگ جاتی ہے۔ قبرستان کے پھاٹک پر ایک خونخوار بھیڑیا کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ نیم اندھیرے میں ایک طرف بھاگ رہی ہے۔ وہ بھیڑیا اسے پکڑنے کے لیے جست مار کر اس پر جھپ لگاتا ہے۔ اور وہ لڑکی بھاگتے ہوئے میں وہاں ایک اندھے کنویں میں وہ گرتی چلی جاتی ہے۔ وہ بھیڑیے کے شکنجے میں آنے سے بچ جاتی ہے مگر کنویں میں گر جاتی ہے۔ اس کے منہ سے آخری بار ایک لڑکے کا نام نکلتا ہے۔

☆......☆......☆

وہ لڑکا ایک بچے کے ہاتھوں لڑکی کو گلاب کے پھول اور اپنے دل کی ترجمانی کا خط بھجوا دیتا ہے۔ وہ بچہ جب اس لڑکی کو پھول دینے گھر کے اندر جاتا ہے تو وہ لڑکی سمجھتی ہے، کہ بچے نے اسے پھول دیئے ہیں۔ وہ لے لیتی ہے۔ اور اسے ''تھینک یو'' کہتی ہے۔ بچہ آ کر اس لڑکے کو کہتا ہے۔

''وہ تھینک یو کہہ رہی تھی۔'' وہ لڑکا خوش ہو کر بچے کو بازوؤں سے پکڑ کر گول گول گھماتا ہے۔ اور اسی لمحے گھر کی دیوار سے سارے گلاب کے پھول پتی پتی ہو کر باہر پھینکے جاتے ہیں۔ اس خط کے ٹکڑوں ٹکڑے کر کے وہ لڑکی دیوار کے پار پھینک دیتی ہے۔

☆......☆......☆

وہ لڑکا ساحل سمندر کنارے کھڑے ہو کر ہے، اور ان تینوں کو متوجہ کر لیتا ہے۔ وہ آدمی گھبرا جاتا ہے۔ اور اپنے آدمیوں سے کہتا ہے۔

''میرا ادھورا کام پورا کرو۔ اس پودے کو سمندر میں برد کردو۔'' وہ لوگ جانے لگتے ہیں۔ وہ لڑکا پستول نکال کر اس آدمی پر تان دیتا ہے۔ مگر وہ آدمی نہیں گھبراتا۔ وہ اسے گولی چلانے کو کہتا ہے۔ اسی لمحے وہ لڑکا اپنے سر پر پسٹل رکھ کر اس آدمی اور اس کے آدمیوں کو ایسا کرنے سے روک دینے کو کہتا ہے۔ وہ آدمی نہیں مانتا ہے، تو وہ لڑکا اپنے آپ کو گولی مار دیتا ہے۔

☆......☆......☆

دلہا اپنی دلہن کے ہاتھ میں پستول دیتا ہے۔ دلہن پستول لے لیتی ہے۔ اور اسے دیکھتی رہتی ہے۔ دلہا مسکراتا ہے۔ اور دلہن پستول اس کے سینے پر تان دیتی ہے۔ دلہا کچھ نہیں کہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ دلہن کچھ دیر بعد فائر کر دیتی ہے۔

☆......☆......☆

وہ رات کے اس پہر ہائی وے پر اپنی ہیوی بائیک پر بیٹھا ہوا گھر کی طرف محو سفر تھا۔ وہ کئی بار اس ہائی وے پر آیا گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ جیسے اس کو بالکل بھی سکون نہ ہو۔

مگر اس کو جیسے کسی چیز کی تلاش تھی۔ وہ سکون اس کے اندر درہم برہم تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکل کر سڑکوں پر تلاش کر رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ زین کوئی آوارہ ٹائپ لڑکا تھا وہ بالکل ایسا نہیں تھا وہ تو ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ سوسائٹی میں اس خاندان کا ایک نام تھا۔ لوگ اس خاندان کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ زین ابرار کو بھی لوگ اس خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ہی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ زین ابرار ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ اور قدرت نے اس میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ اس سب کے علاوہ نہ تو وہ گھمنڈی تھا اور نہ اس میں ذرا سا بھی تکبر پایا جاتا تھا۔ نہ وہ خود پسند تھا۔ اس اعلیٰ خاندان سے تعلق کے باوجود وہ ابھی بگڑا نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ زین کے ڈیڈ ابرار احمد ایک جانے مانے ٹائی کون بزنس مین تھے۔ ان کی دولت کا کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ اسے بزنس سے سر کھجانے کو فرصت نہیں ملتی تھی۔ ابرار احمد کو یہ سب کچھ وراثت میں ملا تھا۔ اسی طرح اب یہی سب کچھ زین کا تھا کیونکہ اسی بینک بیلنس اور دولت کا زین اکلوتا وارث تھا۔ وہ ایک خوش نصیب نوجوان تھا۔ زین کی ماں زرتاشہ احمد ایک سوشل ورکر تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے این جی اوز، کے فلاحی کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ زین اگر باپ کا لاڈلا تھا، تو ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک بھی تھا۔ زین اتنی دولت مندی کے باوجود بھی ایک دردمند دل رکھنے والا انسان تھا۔ وہ بنی نوع آدم کی اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر سخت تکلیف محسوس کرتا تھا۔ اس لیے وہ بہت زیادہ احساس طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے کبھی بھی کسی انسان سے تحکم انگیز رویہ اختیار نہیں کیا تھا، وہ ہمیشہ دوسروں کو انسان سمجھ کر بات کیا کرتا تھا۔ اس کا رویہ ہمیشہ ہر ایک سے انتہائی خوش گوار رہا تھا۔ اور اسی لیے وہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود بھی کسی معاشرتی برائی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ وہ خوش قسمت انسان تھا۔ اس پر اللہ کی رحمت کا سایہ تھا۔ ورنہ شیطان تو ہر جگہ بہکانے کے لیے موجود ہوتا ہے۔

ایک سال پہلے زین کو یونیورسٹی میں سوہا سے پیار ہوگیا تھا۔ سوہا ایک حسین وجمیل لڑکی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی۔ جیسے کوئی پری ہو، جو بنا پروں کے یونی میں آگئی تھی۔ سوہا کو دیکھ کر کئی دل ایک ساتھ دھڑک اٹھے تھے۔ مگر وہ اسے تو جیسے کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ سوہا حسین وجمیل ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا۔ وہ جیسے کوئی ساحرہ تھی۔ جو آئی اور دیکھتے ہی زین کو فتح کر گئی۔ اس پر زین اپنا دل ہار بیٹھا۔ سوہا چاہے جانے کے قابل تھی۔ واقعی وہ حسن کا مجسمہ تھی۔ بلاشبہ حسین وجمیل خوبصورت ملکہ کی طرح پیاری، اس کے انداز میں بہت عجیب قسم کی کشش تھی۔

☆......☆......☆

سوہا اگر حسین و جمیل مانند پری تھی، تو زین بھی کم نہ تھا۔ وہ بھی شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ زین اگر سینکڑوں لوگوں میں بھی کھڑا ہوتا تو نمایاں نظر آجاتا۔ وہ چھ فٹ قد کاٹ کا مالک تھا۔ وجاہت میں بھرپور، گورا رنگ، بڑی بھرپور ساحرانہ کشش والی جادوئی آنکھوں کا مالک، کندھوں تک سلکی بال ایسے تھے۔ جیسے کے وہ کسی فلم کا ہیرو ہو۔ زین پر یونیورسٹی کی لڑکیاں فدا ہوگئی تھیں۔ وہ دن رات زین کو اپنی دعاؤں میں مانگا کرتی تھیں۔ وہ ہر دن زین کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوئیں۔ اور جب زین ان لڑکیوں کو نظر انداز کر دیتا تو وہ زین کے لیے آہیں بھرا کرتیں۔

زین کا دل تو بس ایک ہی ساحرہ سوہا کے پاس تھا۔ زین نے سوہا کو دیکھتے ہی سوہا پر اپنا دل ہار دیا تھا۔ پوری یونیورسٹی میں ایک واحد وہی لڑکی تھی۔ جس کے گال میں ایک خوبصورت ساڈمپل پڑتا تھا۔ نہ صرف سوہا کے دانت موتیوں کی لڑی کی طرح حسین تھے، بلکہ خدا نے اس کو گھنے دلکش صحت مند بالوں سے بھی نواز رکھا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی۔ جس میں خامی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ وہ انمول کومل حسن کی مالک تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی سریلی آواز تھی۔ اگر یونیورسٹی کی لڑکیاں زین پر فدا تھیں۔ تو لڑکے سوہا کے لیے بھی آہیں ضرور بھرلیا کرتے تھے۔

سوہا کو ہر ایک نے پسندیدگی کی سند بخشی تھی۔ ہر جگہ پر اسے پزیرائی ملی تھی۔ اگر وہ پزیرائی ہر جگہ اس کی ذہانت، خوبصورتی اور آواز و انداز کی وجہ سے ملتی رہی تھی۔ تو بے جا نہ تھی۔ وہ اسی قابل تھی۔

زین نے کبھی اس سے اقرار محبت تو نہیں کیا تھا۔ مگر اس کا دوست ضرور بن گیا تھا۔ اور سوہا نے اس کی دوستی کا ہاتھ قبول کرلیا تھا۔ وہ بھی ایک اچھا سا دوست چاہتی تھی۔ زین کی تعریف سب کرتے تھے، اسے زین کی تعریف سن کر اچھا لگتا تھا۔ سوہا کا دل زین کے ساتھ بڑا خوش رہتا تھا۔ جیسے وہ بھی دل ہی دل میں زین کو چاہنے لگی ہو۔ زین اور سوہا نہ صرف اچھے دوست بن گئے تھے۔ بلکہ دونوں میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی، وہ دونوں بن کہے ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے۔ اور ہر موضوع پر ایک دوسرے کے ساتھ بے لاگ تبصرہ اور گفتگو کر سکتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے منتظر تھے کہ کب کون محبت کے اقرار میں پہل کرتا ہے۔ مگر ابھی دونوں خود سے ایسا کچھ نہیں کرنے والے تھے۔

وہ خوشگوار سے دن تھے اور بڑا ہی سہانا دور تھا۔ یونی میں فائنل آئیر کا ایگزیم شروع ہونے والے تھے۔ مگر زین فائنل آئیر کے ایگزیم اسٹارٹ ہونے سے پہلے پہلے ہی سوہا کو دل کی بات بتانا چاہ رہا تھا۔ ایگزیم شروع ہونے میں ابھی اچھا خاصا وقت باقی تھا۔ ان دنوں زین نے محسوس کیا کہ سوہا کو کوئی پریشانی سی ہے۔ اس کا چہرہ ہر وقت بے رونق سا رہتا اور زین تو جیسے اس کی دل کی بات جان لیتا تھا۔ وہ ہر وقت ڈری سہمی سی رہنے لگی تھی۔ زین اس کو اس حال میں دیکھ کر سخت بے چین ہونے لگتا۔ اس نے اس سے لاکھ پوچھا۔ مگر ہر بار سوہا نے ٹال دیا۔ زین امیر تھا۔ پھولوں کے بستر جیسے جوان ہوا تھا، اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی پھولوں کے سیج کے ساتھ ساتھ کانٹوں بھری ایک طویل شاہراہ کا نام بھی ہے۔ وہ کبھی سوچ ہی نہیں پایا۔ اس نے کبھی کوئی دکھ کہاں دیکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔ اسے ہر کوئی خوش اور مطمئن لگتا تھا۔

زین کو ان دنوں آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بزنس پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو اپنا آئیڈیل مانتا تھا۔ وہ اس کی زندگی فالو کرنا چاہتا تھا۔ اس کی طرح ورلڈ کلاس بزنس مین بننا اس کا بچپن کا سپنا تھا۔ مگر شاید قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ تب وہ سوہا سے نہیں ملا تھا۔

ان دنوں اچانک یونیورسٹی میں گرینڈ پارٹی ''دی ویلکم'' شروع ہوگئی۔ یہ پارٹی ان اسٹوڈنٹس کو دی جارہی تھی۔ جو جونیئر رہی کیونکہ اسٹوڈنٹس کا نیا سیشن شروع ہوا

گیا تھا۔ سوہا تو بزنس نہیں پڑھ رہی تھی، وہ جرنلزم کے ڈیپارمنٹ سے ایک عام سی ڈگری کے لیے یہاں آئی تھی۔ اور قدرت نے اسے زین سے ملایا تھا۔ اتنی بڑی یونی میں وہ زین سے ملی، ان دونوں کے ڈیپارٹمنٹ الگ تھے۔ اور سبجیکٹ کے حساب سے دونوں کی ٹائمنگ انتہائی الگ تھی۔ دونوں کے کمپاؤنڈ بھی بہت دور تھے۔ مگر پھر بھی وہ مل گئے۔ تو یہ ان دونوں کے لیے قدرت کا تحفہ تھا۔ سوہا اور زین کی پہلی ملاقات بڑی فلمی انداز سے ہوئی تھی۔ زین سوہا کو جانتا تک نہیں تھا۔

وہ نیا نیا یونی میں آیا تھا جونیئر تھا۔ 20 سال کی عمر میں اس نے کوئی معاشرتی برائی نہیں اپنائی تھی۔ اس نے کبھی زندگی میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ بزنس پڑھتے پڑھتے محبت کا شکار ہو جائے گا۔

کتنی لڑکیاں اس کی دلکش بڑی ساحرانہ آنکھوں کی دیوانی تھیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اور ہمیشہ یہ بات جتاتا بھی تھا۔ مگر وہ یہاں کسی لڑکی پر مرنے مٹنے نہیں آیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس کے ماں باپ نے اس کو لڑکیوں سے دور دور رہنے کی تنبیہ کی تھی۔ وہ ماں باپ کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے یہ بات جیسے گرہ میں باندھ لی تھی۔ وہ لڑکیوں سے الرجک ہوگیا تھا۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ محبت کرے گا۔ یا اپنی خوابوں کی اس لڑکی کو دیکھے گا۔ جو اسے یہاں اس مقام پر ملے گی۔ جس کے سامنے وہ اپنا دل ہار جائے گا۔ اور وہ ہر وعدہ بھلا دے گا۔ جو اپنے ماں باپ سے کر بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

جونیئر کے لیے سینئر (ویلکم) پارٹی کر رہے تھے۔ کئی دنوں سے یونی میں ہلا گلہ مچا ہوا تھا۔ یہ کوئی عام سی گورنمنٹ یونی نہیں تھی۔ اس میں امیر و کبیر خاندانوں سے آئے بچے پڑھتے تھے۔ اور زین بھی اسی کا اسٹوڈنٹس تھا۔ اس لیے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں کوئی غریب لڑکا یا لڑکی پڑھنے کے لیے آئے ہونگے۔

سوہا ایک قابل محنتی، اور ذہین لڑکی تھی۔ وہ بھی اسی یونی میں پڑھنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہ کوئی اپسرا تھی۔ جو بے انتہا خوبصورت تھی۔ ان دنوں وہ ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔

پارٹی شروع ہوگئی۔ اسٹیج پر اناؤسمنٹ ہونے لگی۔ ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پوری یونی کے لڑکے لڑکیاں ہال میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ زین آگے بیٹھا ہوا چمک رہا تھا۔

وہ بے حد خوش تھا۔ اب نئے طلباء کو کوئی ویلکم کرنے کے لیے آرہا تھا۔ اور انھیں بار بار ان طلباء کی مثالیں دی جارہی تھیں۔ جو اس یونی سے فارغ تحصیل ہوکر بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ زین ان باتوں سے سخت بوریت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے بعد کچھ طلباء میں انعامی شیلڈ تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان سب سے زین بور ہوگیا تھا۔

اچانک اسٹیج پر ماڈلنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا، یونی کے طلباء نے اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ زین کو اب پارٹی میں کچھ رونق محسوس ہونے لگی تھی۔ ماڈلنگ کے بعد ڈانس کا سلسلہ چل نکلا۔ انڈین بے ہودہ گانوں پر گرلز اور بوائز نے خوب کمر ہلائی۔ ایک لڑکی سب سے زیادہ لٹکے جھٹکے مار رہی تھی۔ وہ سب سے اچھا ڈانس پیش کر رہی تھی۔ زین نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے ڈیڈ کے دوست کی بیٹی تھی۔ وہ جب بھی اس سے عام زندگی میں ملا تھا۔ وہ لڑکی شرافت کا نمونہ بن کر ملی تھی۔ مگر یہاں تو وہ بنا دوپٹے کے سب کے سامنے سرعام کھلے ناچ رہی تھی۔ اور ایسے لٹک جھٹک کر جھوم رہی تھی کہ کیا ہی انڈین اداکارئیں کرتی ہوں گی۔ آج کل کا پاپولر گانا، زین کے سماعت میں گونج رہا تھا۔

''ماہ نور جبین.....!! آئی کانٹ بلیو دس۔ یہ تم ہی ہونا۔'' زین نے ماہ نور پر دونوں آنکھیں مرکوز کرکے خود سے کہا۔ ماہ نور جبین انڈین فلموں کی دلدادہ اور میک اپ کی پروردہ نئے دور کی لڑکی تھی۔ مگر اس سے پہلے اس

نے جب بھی کبھی ماہ نور کو دیکھا تھا۔ وہ تو انتہائی سمپل سی ہوتی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کا دل بہت خراب ہوا۔ وہ پارٹی سے جانے کا سوچ رہا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اتنی رنگینی میں بھی بور ہورہا تھا۔ اس کا اپنا ایک الگ انداز تھا۔ زین پارٹی سے نکلنے کا سوچنے لگا۔ اس نے ہاتھ میں باندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کا ڈانس ختم ہو چکا تھا۔ اسی لمحے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کی میم رخشندہ عرف رخشی آگئیں۔ انہوں نے مائیک سنبھال لیا۔ میم رخشندہ ایک کامیاب جرنلسٹ بھی تھیں۔ انہوں نے دلوں کو چھونے والے کئی خوبصورت پروگرامز کیے تھے۔ ان کی آواز کانوں میں رس گھولتی تھی۔ جیسے کسی کوئل کی شیریں آواز۔

''سب سے پہلے تو آپ سب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ سب نے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے میرا بھرپور ساتھ دیا۔'' ایک دم سے پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

''آپ لوگوں نے دل سے شرکت کر کے میرا مان بڑھا دیا۔ میں اب ایک بالکل فریش طالبہ کو دعوت دینا چاہتی ہوں کہ وہ آئے اور اپنی سریلی آواز میں گانا گائے''۔ ایک بار پھر سے پورا ہال تالیوں کی گونج سے بجنے لگا۔

''میں آپ سب کو سوہا کے بارے میں کچھ باتیں بتانا چاہتی ہو۔ نئے دور کی یہ لڑکی ایک اچھی شاعرہ بھی ہے۔ یہ صرف گانے لکھتی ہے۔ گانے سے مطلب ہے کہ لیرکس یہ ایک اچھی لیرکس رائٹر بن سکتی ہے۔ اس نے کبھی کسی کے لیے آج تک کوئی گانا نہیں لکھا ہے۔ مگر یہ اپنے لیے لیرکس لکھتی ہے۔ اس کے لکھے گانے انٹرنیشنل لیول کے ہیں۔ اور جب اس نے مجھے اپنی شاعری دکھائی۔ تو میں اتنی متاثر ہوئی اور سوچا کہ آپ سب کو بھی اس کی شاعری سنا دوں''۔ ایک بار پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

''اب میں جرنلزم ڈیپارمنٹ کی ہونہار اور لائق فائق پیاری من موہنی سی سوہا کو دعوت دینا چاہتی ہوں کہ وہ آئے اور اپنا لکھا لیرکس خود گا کر سنائے اور جیسے کہ میں نے اس سے پہلے بھی سوہا کے بارے میں بتایا ہے، کہ وہ ایک ہونہار اور قابل محنتی لڑکی ہے۔ وہ ایک سریلی آواز کی بھی مالک ہے، اور مجھے یقین ہے۔ جب آپ اس کے لکھے اور اس کی آواز کو سنیں گے، تو ضرور اس کو پسند کرنے لگ جائینگے۔ سوہا جب اپنی کومل آواز میں بات کرتی ہے تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کہ وقت تھم سا گیا ہو پھول برس رہے ہو، ہوائیں ٹھنڈی پڑ گئی ہوں، میرا ماننا ہے کہ اگر اس کو سن لیں، تو لوگ اس کی آواز کے دیوانے بن جائیں۔ کیونکہ وہ جب بات کرتی ہے تو سننے والا کھڑا مبہوت ششدر سا کھڑا ہو جاتا ہے''۔ میم رخشندہ کی باتوں کے دوران ہی آرکسٹرا والے اسٹیج پر آگئے تھے۔

زین کو میم کی باتیں سن کر حیرت ہورہی تھی۔ جیسے میم رخشندہ کسی لڑکی کی تعریف نہیں اپنی تعریف کر رہی ہوں۔ وہ حیرت سے میم کو دیکھ رہا تھا۔ جواب اسٹیج سے اتر رہی تھی۔ اور اسے بالکل بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ اُسے کیسے کسی ان دیکھی حسینہ کی سنی سنائی تعریفوں پر یقین آجاتا۔ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا۔

سفید لباس میں اجلی، وہ لڑکی بیک اسٹیج سے نمودار ہوگئی۔ اس نے پنک کلر کا دوپٹہ کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ وہ اس لباس میں آسمانی حور لگ رہی تھی۔ سب کی نظریں اس پر اٹک کر رہ گئیں۔ زین نے تالی بجائی۔ تو سب کی محویت ٹوٹ گئی۔ سب لوگ تالیاں بجانے لگ گئے۔ زین اس کو دیکھ کر حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی، اس کے دائیں گال میں گہرا ڈمپل پڑ رہا تھا۔ زین حیرت سے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ زین کو فوراً کسی نے ہاتھ سے کھینچ کر بٹھا دیا۔ کیونکہ پچھلے رو میں بیٹھے ہوئے لڑکی کو سوہا نظر آنا بند ہوگئی تھی۔ زین بیٹھ گیا۔

وہ اب مائیک ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اور زین یک ٹک سوہا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل اس کے گہرے ڈمپل میں کہیں گم ہوگیا تھا۔ جیسے پہلی ہی نظر میں وہ اس کا چین اُڑا کر لے گئی تھی۔

''سب سے پہلے تو میں میم رخشندہ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ جس نے آج مجھے اتنی عزت دی کہ میں بیان نہیں کر سکتی''۔ زین کو لگنے لگا کہ ہر طرف سے پھول ہی پھول گر رہے ہوں۔ میم رخشندہ نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ سب سچ تھا۔ لوگ زور زور سے تالیاں بجانے لگ گئے۔ اب گہری خاموشی چھا گئی۔ اسٹیج کی تمام روشنیاں سوہا پر فوکس ہوگئیں۔ ہال نیم تاریکی میں ڈوب گیا۔ آرکسٹرا والے دھیمے دھنوں میں دھن بجانے شروع ہو گئے۔ اس وقت سب کی نظریں سوہا پر ٹکی ہوئی تھیں۔ سوہا پرستان کی وہ پری لگ رہی تھی، جس نے اپنے پر کہیں پر گم کر دیے ہوں۔ خوبصورت سی موسیقی کے لے پر اس نے لب کھول دیے۔

''جلتے گلاب''.....!!! ہال میں سناٹا سا چھا گیا۔

یہ جو گلاب ہے تیرا شباب ہے
حسن ماہتاب ہے کیسا حساب ہے
جلتا گلاب سا میرا نصیب ہے
مجھ سے کیوں دور ہو کوئی رقیب ہے

لوگ پہلے گانے کے پہلے ہی بند میں تالیاں بجانے لگ گئے، واقعی اس کی آواز نے جیسا جادو کر دیا تھا۔ کچھ لوگ سر بھی موسیقی کی دھن پر ہلانے لگ گئے۔

جلتا گلاب ہے پہلے ہی پیار میں
دل میرا جل رہا تیرے خمار میں
تیرا جو پیار ہے دل کا قرار ہے
سہہ لو گی ہر ستم تیرے ہی مار میں
مل جاؤ تم مجھے یار اس پیار میں
ورنہ مٹ جاؤں گی یار یوں غبار میں

واقعی میم رخشندہ نے بالکل سہی کہا تھا۔ وہ تو اصلی کوہ نور ہیرا تھا۔ اس نے موسیقی کے لے پر اتنی پرفیکٹ شاعری کی تھی۔ حاضرین محفل کو جھومنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر موسیقی بجتی رہی۔ اور سوہا نے مکمل گانا شروع کرنا تھا۔ اس کی آواز نے لوگوں کو مبہوت کر دیا تھا۔ موسیقی کی آواز ہال میں ہنگامہ برپا کر رہی تھی مگر زین پرسکون تھا۔ وہ سوہا کو دیکھ کر اس کا دیوانہ بن رہا تھا۔

جلتا گلاب سا میرا وجود ہے
دل میرا جل رہا ایسا ثبوت ہے
کیسے ستم ہوئے پیار کی راہوں میں
بن تیرے جل رہے تیرے ہی بانہوں میں
پھر بھی قرار ہے تیرا یہ پیار ہے
تیرے نگاہ میں ہے میرا خمار ہے

گانا گاتے ہوئے سوہا نے ایک دم زین کی طرف دیکھا، دونوں کی نگاہیں مل گئیں۔ زین کو ان نگاہوں سے تپش کا احساس اپنے دل پر محسوس ہونے لگا۔ وہ یک ٹک سوہا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ سوہا کا دل دھڑک اٹھا۔ مگر وہ سولو پرفارمنس کر رہی تھی۔ جلد ہی لمحوں میں سنبھل گئی۔ اس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مگر زین ایسا نہ کر سکا۔ اب سوہا کو آخری بند گانا تھا۔

یہ جو گلاب ہے میرا شباب ہے
حسن ماہتاب ہے کیسا حساب ہے
کتنا عجیب ہے وہ شخص قریب ہے
اس کو پتہ نہیں دل بھی شریف ہے
ہے تجھ کو واسطہ چل میرے راستہ
تجھ سے گلہ نہیں سن میری داستاں

گانا ختم ہوگیا، ماحول پر خاموشی چھا گئی، ہال تالیوں کی گونج سے سنسنا اٹھا۔ سب لوگ اس کی خوبصورت آواز اور لیرکس پر تالیاں بجا بجا کر تھک نہیں رہے تھے۔ اور پھر میم رخشندہ دو، سرخ گلاب کے بکوں کے ہمراہ تشریف لائیں۔ اور بہت وقار سے وہ تحفہ سوہا کو دے دیا۔ سوہا نے وہ تحفہ بڑے چاؤ سے وصول کیا۔ اس نے میم اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد سوہا بیک اسٹیج چلی گئی۔ کئی لوگوں نے سوہا کی ویڈیو ریکارڈنگ کی تھی۔ مگر زین کو یہ خیال قطعاً نہیں آیا۔ اس نے تو بس صرف سوہا کو دیکھا تھا۔ اور اس کا ہو گیا تھا۔ وہ جیسے بیک اسٹیج گئی۔ زین کے لیے اس فنکشن میں ساری دلچسپی بھی ختم ہوگئی۔ وہ بے چینی کا شکار ہوگیا۔ پارٹی کے

اختتام پر زین نے میم رخشندہ سے بات کر کے سوہا کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی۔ میم رخشندہ نے اس کو سوہا کے بارے میں کافی کچھ بتایا۔

☆.....☆.....☆

سوہا کو لڑکوں میں کوئی دلچسپی تو نہیں تھی، مگر زین کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بھی تو سب میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اور سوہا کو اچھا بھی لگتا تھا۔ یوں چند دنوں کی ملاقاتوں میں دونوں بہت اچھے دوست بن گئے۔ دونوں کی دوستی میں میم رخشی نے بھی خوب کردار نبھایا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بے حد احترام کرتے تھے۔ ہر معاملے کو ایک دوسرے سے خوب ڈسکس کرتے، وہ ایک دوسرے کی رائے لینے لگے، وہ فارغ وقت میں ہمیشہ ساتھ پائے جانے لگے۔ یونی کے زیادہ تر لوگوں کو لگنے لگا، کہ زین اور سوہا کے درمیان کوئی کیمسٹری چل رہی ہے۔ یہ غلط بھی نہ تھا۔

زین نے اس عرصے میں کبھی بھی سوہا سے محبت کی کوئی بات تو نہیں کی تھی۔ مگر اس کے ہر انداز سے محبت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ زین کو حیرت ہوتی تھی، کہ سوہا اس کا انداز محبت کیوں نظر انداز کر رہی ہے۔ اور سوہا نے زین سے ہر معاملے پر اور ہر موضوع پر زیر بحث تبصرہ کیا تھا۔ مگر کبھی اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ زین نے کئی بار پوچھا۔ مگر ہر بار اس نے ٹال دیا۔ زین نے بھی زیادہ کریدا نہیں۔ حالانکہ اس کو سوہا کے بارے میں سب سے زیادہ جاننا تھا۔ مگر سوہا نے جیسے سب کچھ وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کی دوستی کافی عرصے رہی۔ اور پھر ایک دن یونی میں ''دی بائے بائے اسٹوڈنٹس'' پارٹی کا آغاز ہو گیا۔ فائنل آئیر کے ایگزیم شروع ہو گئے۔ زین بہت زیادہ خوش تھا۔ وہ سوہا کو ایگزیم کے بعد اپنے دل کی ہر ایک بات بتا دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ دونوں یونی سے فارغ ہونے والے تھے۔ یہ ڈیڑھ سال تو جیسے آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا تھا۔ اس سے پہلے ایگزیم اسٹارٹ ہوتے، اور نئی تقریب ہوتی۔ سوہا کا ارادہ اس پارٹی میں اپنے لکھے نئے لیرکس گانے کا تھا کہ اچانک سوہا غائب ہو گئی۔ اس کا پورا خاندان ایک دم سے گم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

زین کو حیرت ہوئی، اسے سوہا سے یہ امید نہیں تھی۔ ان دونوں کا لمبے عرصے کا ساتھ تھا۔ سوہا نے فائنل آئیر کا ایگزیم بھی نہیں دیا۔ زین نے اس کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ جس علاقے میں سوہا رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر زین کو یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ ایسے گھروں میں تو زین کے ملازم بھی نہیں رہتے تھے۔ وہ ایک پس ماندہ علاقہ تھا۔ مگر اس میں اسے بہت مشکل پیش آئی۔ جب اسے سوہا کا گھر ملا، تو اس پر ایک بہت بڑا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ حیرت سے جیسے پاگل ہونے لگا۔ اس نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھ گچھ کی، تو پتہ چلا کہ یہ لوگ راتوں رات پتہ نہیں کہیں چلے گئے ہیں، کسی کو بھی ان کے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ زین نے پاگلوں کی طرح اس علاقے کے لوگوں سے کئی بار پوچھا۔ مگر لوگ لاعلم تھے۔ جیسے وہ لوگ زمین میں دھنس گئے ہوں۔

زین کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ سوہا اور اس کی فیملی ایک دم سے سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سوہا ایسے گم ہو سکتی ہے۔ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا۔؟ وہ سمجھتا آیا تھا کہ سوہا بھی اس کی طرح ایک امیر و کبیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر اب جو حقیقت اس کو پتہ چلی تو اس نے اسے بے حد دکھی کر دیا۔ سوہا کے لباس اور انداز سے یہ کبھی نہیں لگا تھا کہ وہ ایسے پس ماندہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''سوہا تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کہاں گم ہو گئی ہو؟ کہاں چلی گئی ہو؟ کس وجہ سے چلی گئی ہو؟'' وہ خود سے پوچھتا۔ مگر اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ وہاں سے چلا آیا۔ وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ مگر وہ سال ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا ایگزیم دے دیے۔ مگر وہ سوہا کو بھلا نہیں پا رہا تھا۔ وہ اور

رسے ٹوٹ رہا تھا۔ اس کا دل بے حد پریشان تھا۔

وہ دن رات سوہا کے فکر میں ہلکان ہوتا رہا۔ اس نے سوہا کو راتوں کو اٹھ اٹھ کر ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ کئی بار اس کے گھر گیا۔ وہ اسی طرح بند تھا۔ وہ کئی بار گیا۔ لوگ بھی اب اسے پہچاننے لگے تھے۔

''سوہا.....!! اگر تمہیں کوئی پریشانی تھی، تو ایک بار تو بتا دیتی۔ میں تمہاری ہر مشکل حل کر دیتا۔ تم نے جانے سے قبل مجھے بتانا بھی گوارا نہ کیا۔ کیا تم میرے انداز سے بھی میرے دل کا حال جان نہ پائی۔ کیا میرے جذبوں میں کوئی کھوٹ تھی۔ جو تم نے میرے ساتھ ایسا کیا''۔ اس کے ساتھ یونی کے کافی سارے اسٹوڈنٹس بھی پریشان تھے۔ پروفیسرز بھی کافی حیرت کا اظہار تھے کہ ایک دم سے سوہا کہاں گم ہو گئی ہے۔ مگر ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ لوگ اب رفتہ رفتہ سوہا کو بلانے لگے تھے۔ مگر ایک لمحے کے لیے بھی سوہا کو زین بلا نہ پایا۔ وہ دن رات ہر جگہ بس سوہا کو ڈھونڈ رہا تھا۔

وہ جب کبھی سو جاتا۔ تو اسے خواب میں جلتے گلاب نظر آتے تھے۔ وہ دیکھتا کہ جلتے گلاب کا کوئی پودا ہے۔ جو کہ آگ کی لپیٹ میں ہے۔

وہ پریشان ہو کر اٹھ جاتا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ اس کی زندگی دھیرے دھیرے جیسے ایک عذاب بن رہی تھی۔ اس نے راتوں کو جیسے سونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ یونی سے فارغ تھا۔ اس نے دی بائے بائے اسٹوڈنٹس پارٹی میں شرکت نہیں کی۔ وہ جیسے پاگل ہونے والا تھا۔ اس کا چہرہ باہر سے بہت پرسکون نظر آتا تھا۔ مگر اس کے اندر ایک لاوا ابل رہا تھا۔ وہ زندگی سے جیسے مایوس ہو رہا تھا۔ وہ موت کی طرح خاموش تمنائی بن بیٹھا تھا۔ کیونکہ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خوابوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ خواب میں جلتے ہوئے گلاب کا پودا دیکھتا گلاب کے پودے میں تین گلاب کے پھول ہوتے جو شعلوں کے لپیٹ میں جل رہے ہوتے تھے۔ اور جب وہ گلاب کے پھولوں کے پاس جاتا۔ تو گلاب کے پھولوں میں سوہا کا چہرہ نظر آ جاتا تھا۔ وہ سوہا کو گلاب کے پھولوں میں جلتا ہوا دیکھتا تو چیخ مار کر اٹھ جاتا۔ وہ پسینہ پسینہ ہوتا۔ اس کا سارا جسم کانپ جاتا۔ وہ سوہا کے لیے دل سے دعائیں مانگنے لگ جاتا۔

اس عرصے میں سال بیت گیا۔ زین نے بہت شاندار نمبرز حاصل کیے تھے۔ نیا سال نئی خوشیاں نئی امیدیں لایا تھا۔ مگر زین کو کچھ خوشی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کے کہنے کے باوجود اپنی ڈگری کی خوشی سیلیبریٹ نہیں کی۔ وہ اداس تھا تو اسے پوری دنیا اداس نظر آتی تھی۔ اس کو لگتا تھا جیسے اس سے کچھ گم ہو گیا ہے۔ وہ اس کی کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی سمجھ سے یہ سب باہر تھا۔

☆.....☆.....☆

ابرار نے زین کو نئے سال پر باہر بھجوا دیا۔ مگر یہاں کی رنگینیوں میں اس کا دل بالکل بھی نہ لگ سکا، اس کو سوہا سے محبت تھی۔ وہ اسی ملک میں تھی جس کو وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ اس لیے وہ واپس چلا آیا۔ وہ سوہا کو کیسے چھوڑ کر یہاں سکون سے رہ سکتا تھا۔ اس نے چند دن گزارے مگر ایک رات اس نے پھر وہی جلتے گلاب کا خواب دیکھا۔ وہ اس رات سو نہ پایا۔ کافی دیر تک روتا رہا۔ وہ رونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو اس کے خواب تکلیف دیتے تھے۔ اسے ان خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنی تھی۔ مگر وہ بہت ڈرتا تھا کہ کہیں سوہا.....

اس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر سوہا کی آئی ڈی کو دیکھنا چاہا۔ مگر جب سے سوہا گم ہوئی تھی۔ اس کی آئی ڈی بند تھی۔ اس کا موبائل نمبر بند تھا۔ زین کا ہر ایک رابطہ اس سے ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے ماں باپ کی بے پناہ مخالفت کے باوجود وہ واپس پاکستان چلا آیا۔ اور اس نے پاکستانی ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ماں باپ دونوں نے اس کی اس پر بے حد مخالفت کی۔ مگر وہ نہ مانا۔ وہ سوچ چکا تھا۔ اس کا ماننا تھا

کہ شاید سوہا اسے اس طریقے سے مل جائے۔ اس نے پہلے پہلے کمرشلز و ماڈلنگ شروع کر دی۔ پھر وہ ٹی وی ڈراموں کی طرف چلا آیا۔ اس کی ایکٹنگ لاجواب تھی۔ لوگوں نے ایک قابل ایکٹر کے طور پر اسے قبول کر لیا۔ ٹی وی ڈراموں کا وہ نامور ہیرو بن گیا۔ اداکاری میں اسے سکون ملنے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے سنجیدہ اور رونے رلانے والے کرداروں سے بے حد مشہور ہو گیا۔ وہ ہر ٹریجیڈک رول میں فٹ ہو جاتا۔ اس نے ہر اس کردار کا انتخاب کیا۔ جس سے دوسرے میل ایکٹر ڈرتے تھے۔ کہ کہیں ایسے ٹریجیڈک کریکٹر ان پر ٹریجیڈی کی چھاپ نہ ڈالیں۔ اور جب اس کے ڈرامے عوام میں مقبول ہو گئے، تو ہر اس ایکٹر کو افسوس ہوا۔ جنہوں نے یہ کردار ریجیکٹ کیے تھے۔

چند مہینوں میں اس نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے فرار چاہتا تھا۔ کئی کو ایکٹریسز اس کی بھرپور وجاہت پر بری طرح فدا ہو گئی تھیں۔ مگر اس نے کسی کو بھی یہ جھانسہ نہیں دیا۔ وہ محبت ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے کسی سے دوبارہ سوہا جیسی محبت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ دوسری محبت کا قائل نہیں تھا۔

وہ بہت زیادہ مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں محبت کا ٹمٹماتا دیا ابھی تک بجھنے نہ پایا تھا کہ اس کی کو ایکٹر رمشال شاہ نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ مگر وہ اس میں بری طرح سے ناکام ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ رمشال شاہ جو اس کی بہترین دوست ہے۔ اس پر مرمٹی ہے۔ اس نے رمشال شاہ کو کچھ نہ کہا۔ اور اس کے ساتھ اپنے ڈرامائز کی شوٹنگ کراتا رہا۔ وہ اس فیلڈ میں کوئی نیوز نہیں چاہتا تھا۔

شروع میں تو زرتاشہ اور ابرار زین سے ناراض رہے، مگر جب ہر جگہ سے اُسے کو فیم اور پیسے ملنے لگے۔ تو ان دونوں نے زین کو معاف کر دیا۔ اور سب کچھ پہلے سے بہتر ہو گیا۔ زرتاشہ تو ناراض تھی ہی نہیں، مگر اس نے شوہر کو بیٹے پر ترجیح دی تھی۔ وہ ابرار کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زرتاشہ کی کوششوں سے ہی ابرار مان گئے تھے۔ ان چند مہینوں میں اس نے وہ جگہ بنالی، جو لوگ سالوں میں نہیں بنا سکتے ہیں۔ اسے فیم پیسہ عزت سب کچھ ملا، مگر سوہا نہ مل سکی۔ اسے ابھی بھی سوہا کا انتظار تھا۔

ابرار احمد اور زرتاشہ زین کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ اس کی کسی اعلیٰ خاندان میں شادی کرانا چاہتے تھے۔ مگر زین نے صاف انکار کر دیا تھا، وہ شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ وہ ان دونوں کو کوئی لارا نہیں دینا چاہتا تھا۔ زرتاشہ تلملائی مگر ابرار نے کچھ نہ کہا۔ اس نے دونوں کندھے اچکا دیے۔ وہ بزنس مین تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔

اس لمحے زرتاشہ نے کچھ نہ کہا۔ مگر وہ جلد از جلد یہ کام کر دینا چاہتی تھی، کیونکہ وہ مزید اس معاملے میں دیر بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

زین نے انکار کر دیا۔ ایک دن اس کے گھر اس کے ڈیڈ کے دوست کی بیٹی ماہ نور جبین آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی زین کو دل سے پسند کرتی تھی۔ اس لیے وہ اکثر بن بلائے یہاں موجود ہوتی تھی۔ وہ سیدھا انکل آنٹی سے ملنے کے بعد زین کے کمرے میں آ گئی۔

''ہیلو''.....!! اس نے بنا نوک کیے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ زین کو دیکھ کر وہ فوراً حیرت سے اسے دیکھے چلی گئی۔ زین نے کوئی شرٹ نہیں پہنی تھی۔ اس نے صرف پینٹ پہن رکھی تھی۔ زین اسے دیکھ کر حیرت سے مڑا۔ مگر وہ اوپری دھڑ سے تو عریاں تھا۔ اب اس کی چوڑی پیٹھ ماہ نور جبین کی طرف تھی۔ وہ ورزشی جسم کا مالک تھا۔

''تم......!! بندے میں کچھ تو تمیز ہونی چاہیے۔ تم فوراً باہر جاؤ''۔ زین نے مڑے بنا ہی کہہ دیا۔

''اب دیکھ تو لیا ہے۔ کیوں باہر بھیج رہے ہو''۔ ماہ نور جبین آج کی لڑکی تھی۔ ایلیٹ کلاس کی رول ماڈل تھی۔

''میں نے کپڑے تبدیل کرنے ہیں''۔ زین نے فوراً وضاحت دی۔ حالانکہ اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔

''اچھا۔۔۔!! پہن لو شرٹ.....!! میں تم سے ملنے آئی ہوں، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے''۔ ماہ نور نے جلدی سے کہا۔ زین نے جلدی سے شرٹ پہن لی۔ ماہ نور ایک آنکھ سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ماہ نور کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''اب بولو.....!! کیا بات کرنی ہے''؟ زین ناراضگی سے بولا۔ اسے ماہ نور جبین کی کمپنی پسند نہیں تھی۔

''میں نے تمہاری وہ نئے سال پر بنی ٹیلی فلم دیکھی، قسم سے مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں بتا نہیں سکتی''۔ ماہ نور نے اس کی تعریف شروع کر دی۔ اور زین کو اپنی تعریفوں سے سخت چڑ ہوتی تھی۔

''اچھا وہ.....!! (''تیرے ہجر میں'') وہ سب کو پسند آئی ہے۔ اس میں کو ایکٹریس رمشال شاہ نے غضب کی اداکاری جو کی ہے''۔ زین نے ماہ نور کو دیکھا۔

''ہونہہ.....!! وہ تو ایویں سی بی کلاس اداکارہ ہے۔ سب لوگ تمہاری وجہ سے وہ ٹیلی فلم دیکھ رہے ہیں''۔ ماہ نور نے دل سے کہا۔

''ہاں.....!! بس تم یہ بات کرنا چاہ رہی تھی''۔ زین نے کہا۔

''ہاں.....!! میں یہ بھی کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر ایک بات اور بھی ہے''۔ ماہ نور نے اپنی دونوں آنکھیں اچھی خاصی بڑی کر دیں۔

''کیا بات ہے''؟ زین نے کہا۔

''زین.....!! تم اتنے رونے دھونے والے سیریل کیسے کر لیتے ہو۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہر بار تمہاری''۔۔۔۔۔۔!!

''یہ باتیں چھوڑ دو۔ تم وہ بات کرو جو مجھ سے کرنے آئی تھی''۔ زین نے اس کی بات بیچ میں روک کر پوچھا۔

''زین.....!! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں''۔ ماہ نور نے زین کی طرف دیکھا۔

''اور میں کسی اور سے؟ اس لیے تمہارے لیے اتنا جواب کافی ہے''۔ زین نے اس کو اپنے کمرے میں چھوڑا۔ اور دروازہ کھول کر نکل گیا۔ اس کو ماہ نور جبین سخت ناپسند تھی۔

''زین.....!! زین.....!! وہ اس کے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔ مگر زین اس کی آوازیں ان سنی کرتا ہوا گیراج میں چلا آیا۔

''زین.....!! تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری زندگی میں کوئی بھی نہیں ہے''۔ وہ اس کے پیچھے گیراج تک چلی آئی۔

''تم اپنا دل خوش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہی ہو۔ ورنہ میرے دل کو دیکھ کر قطعاً ایسا نہ کہتی''۔ زین نے اسے مڑ کر دیکھا۔

''نہیں.....!! سب سمجھتے تھے کہ تمہارا اور رمشال شاہ کا چکر چل رہا ہے، مگر جب سے تم نے پریس میں بتایا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تب سے رمشال شاہ نے بھی خاموشی توڑ دی ہے۔ اس نے بھی اس خبر کو بے بنیاد قرار دیا ہے''۔

''تو.....!! اس میں تم کہاں سے انوالو ہونے لگی۔ تم ڈیڈ کے دوست کی بیٹی ہو۔ اس لیے میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں۔ ورنہ میں اپنے پرسنل لائف پر کسی کی تنقید برداشت نہیں کر سکتا''۔

''زین......!! میری طرف دیکھو، مجھ میں کیا کمی ہے میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ دیکھو......!! میری ان آنکھوں میں ان میں تمہارا ہی بسیرا ہو گا۔ میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں۔ میں زندگی بھر تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتی ہوں''۔ ماہ نور نے زین کی آنکھوں میں ڈھٹائی سے دیکھا۔ وہ آج آر یا پار کرنے آئی تھی۔

''دیکھو......!! ماہ نور تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ اس لیے یہ ڈائیلاگ بازی بند کر دو۔ اور اگر تم بھی میری طرح ایکٹنگ کا شوق رکھتی ہو۔ تو میں تمہیں کسی اچھے ڈائریکٹر سے ملوا سکتا ہوں۔ تمہاری صلاحیت میں وہی ڈائریکٹر نکھار لائے گا''۔ زین نے اس کی بات کی ذرا سی بھی پرواہ نہ کی۔

''مجھے پتہ ہے تم ایسے ہی ہو روڈ، دوسروں کی پرواہ نہ کرنے والے، مگر میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں۔ میں

دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں۔ آئی لو یو"۔ اس نے زین کا ہاتھ تھام لیا۔ جسے فوراً جھٹکے سے زین نے چھڑالیا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، مگر تم میری لائف پارٹنر نہیں بن سکتی۔ تم وہ نہیں ہو۔ اور جو تم محبت کی بات کر رہی ہو۔ یہ محبت نہیں تمہاری پسندیدگی ہے۔ تم آئندہ میرے پاس اس لفظ محبت کے لیے نہ آنا۔ اور آئی لو یو کوئی سوال نہیں ہے۔ جس کا جواب مانگا جائے"۔ زین نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جیسے اس وقت دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"میں لیٹ ہو رہا ہوں، مجھے اسٹوڈیو جانا ہے، آج میری ریہرسلز ہے"۔ زین اپنی کار میں بیٹھا۔ اور اسے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ روتی ہوئی وہاں سے اپنی کار میں بیٹھ کر گھر جانے لگی۔

"زین.....!! جس طرح تم نے میرا دل توڑا ہے، اللہ کرے کوئی ہو، جو بالکل اسی طرح تمہارا دل توڑ دے"۔ وہ دل ہی دل میں اسے بددعا دینے لگی۔ اس بات سے بے خبر کہ آل ریڈی زین کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ اپنے ٹوٹے دل کی خاطر ہی تو سب کچھ کر رہا ہے۔ اپنے ٹوٹے دل کے ٹکڑے تو جوڑ رہا ہے۔ اس لیے تو وہ ہر لڑکی سے دور ہو گیا ہے۔

☆......☆......☆

زین نے ہاف بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، جس پر مشہور ریسلر جان سینا کی بڑی سی تصویر تھی۔ اس وقت وہ اپنے ہیوی بائیک پر ہلمٹ پہن کر میوزیکل نائٹ سے واپس آرہا تھا۔ اس میوزیکل شو میں اس نے میزبانی کے فرائض نبھائے تھے۔ اس سے پہلے زین اور غینا خان نے ڈرامہ (میرے دل کی آواز) میں کام کیا تھا۔ اور دونوں کی جوڑی اتنی ہٹ ہو گئی تھی کہ لوگ ان دونوں کو رئیل لائف پارٹنر سمجھنے لگے تھے۔ مگر زین نے ہر اس خبر کی تردید کردی تھی۔

اس کی کو اسٹار غینا خان بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اس کی فیمیلی کو ہوسٹ تھی۔ غینا خان بھی اس سے شدید محبت کرتی تھی۔ اس نے ہمیشہ غینا خان کو نظر انداز کردیا تھا۔ جس سے غینا خان نے بھی پریس میں کہہ دیا تھا کہ جیسا میڈیا سمجھ رہا ہے ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ جب سے غینا خان کو پتہ چلا تھا کہ زین کسی اور پر مرا ہے۔ تب سے اس نے بھی دوبارہ ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ زین کے پاس کئی بیش قیمتی گاڑیاں تھیں۔ مگر اسے بائیک پر گھومنا پھرنا پسند تھا۔

رات کے بارہ سے اوپر کا وقت تھا۔ زین ہائی وے پر بائیک سے گزر رہا تھا۔ اب وہ مین فلائی اوور سے مین جی ٹی روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سر پر ہلمٹ پہن رکھا تھا۔ جینز کے ساتھ پاؤں میں جوگرز کے شوز پہن رکھے تھے۔ مین روڈ کے قریب شہری حدود سے زرا دور ایک قبرستان واقع تھا۔

رات کے اس پہر قبرستان میں جانا تو دور کی بات لوگ قبرستان کا نام سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ زین نے بائیک کی رفتار دھیمی کی، اس نے ایک نظر قبرستان کی طرف ڈالی۔ اس کو قبرستان کا زنگ آلود گیٹ نظر آیا۔ قبرستان کا زنگ آلود سال خوردہ گیٹ، بہت بھیانک نظر آرہا تھا۔

زین نے قبرستان کو نظر انداز کر دیا، اور آگے بڑھ گیا۔ آگے شہری حدود شروع ہونے والے تھے۔ ابتدا ویران کھنڈرات سے ہوئی، آگے بڑے بڑے دیوہیکل درختوں کی نا ختم ہونے والی قطاریں تھیں۔ جو کافی دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیوں کے سوا کوئی خاص گاڑیاں نظر نہیں آرہی تھیں۔ زین آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک گاڑی سڑک کنارے کھڑی دیکھی، اس کے پچھلے لائٹس آن تھے۔ اس نے انسانی مدد کے خیال سے اپنی اسپورٹس بائیک سڑک کنارے روک دی۔ اور بائیک سے اتر کر گاڑی کی طرف چلا گیا۔ مگر اس گاڑی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اچھی طرح سے گاڑی کا جائزہ لیا۔

"کوئی ہے"؟ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔ اس ویرانے میں اسے اپنی بازگشت کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔

"لگتا ہے، لفٹ لیکر اس گاڑی کا مالک چلا گیا ہے"۔ زین نے بائیک اسٹارٹ کردی اور آگے روانہ ہو گیا۔ آگے بہت بڑا میدان تھا۔ جس میں خودرو گھاس اور کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کچھ بڑے قدیم درخت بھی اسی میدان کا حصہ تھے۔ جو جنگلی تھے وہ اس وقت بہت بھیانک لگ رہے تھے۔ کانٹے دار پودے اس میدان کا حصہ ہونے کی وجہ سے کم لوگ ہی اس میدان میں جاسکتے تھے۔ زین نے رات کے اندھیرے میں میدان پر ایک ناپسندیدہ سی نظر ڈالی۔ اس کو حیرت کے کئی جھٹکے بیک وقت لگ گئے۔

میدان میں کوئی پودا دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ بے ساختہ اس نے بریک لگایا۔ وہ اسی طرف خوف سے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک وہ اپنے خواب میں جلتے گلاب کا پودا دیکھتا آیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کو وہ یاد آگیا۔ وہ رک گیا۔ اب اس کی نگاہیں جلتے گلاب کے پودے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"جلتے گلاب.....!! زین زیر لب بڑبڑایا۔

وہ بائیک سے اتر آیا۔ اس نے میدان میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ واقعی کوئی پودا بری طرح جل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پودے کو آگ لگا دی ہو۔ مگر پورے میدان میں وہی ایک پودا تھا۔ جو جل رہا تھا۔ اس کو غور سے دیکھنے کے بعد زین کو حیرت ہوئی۔ وہ بالکل اس کے خواب والا منظر تھا۔ وہ حیرت سے پودے کو دیکھنے لگا۔

زین کے قدم بے ساختہ جلتے گلاب کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ جیسے انجانی کشش کے زیر اثر تھا۔ وہ حیران تھا۔ کیونکہ اس میدان میں کوئی دوسرا پودا تو جل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اب پودے کے بہت قریب تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ گلاب کا پودا تھا۔ جو آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں بری طرح سے لپٹا ہوا تھا۔ اس پودے میں تین گلاب کے پھول تھے۔ جو سرخ رنگ کے تھے، مگر آگ کے شعلوں میں گرے وہ زرد رنگ کے نظر آرہے تھے۔ اس نے غور کیا۔ وہ پودا آگ کے شعلوں میں گرا ضرور تھا۔ مگر اس سے دھواں نکل نہیں رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی نگاہیں پودے پر مرکوز کردیں۔

وہ پودا صرف آگ کے لپیٹ میں تھا۔ مگر وہ جل نہیں رہا تھا۔ وہ آگ اس پودے کو جلا نہیں رہی تھی۔ وہ پھول صحیح سلامت تھے۔ اور اس میں سے جلنے کی بو نہیں اُٹھ رہی تھی۔ اب زین جلتے گلاب کے پودے کے بالکل روبرو کھڑا تھا۔ اور اس کی حیرت کئی چند ہو گئی تھی۔

اس نے گلاب کے پھول میں دیکھا، تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ شعلوں میں گھرے گلاب کے اندر کسی لڑکی کا عکس نظر آرہا تھا۔ اس عکس کو دیکھ کر زین چونک گیا۔ کیونکہ یہ کسی اور کا نہیں بلکہ سوہا کا عکس تھا۔

"سوہا".....!! وہ زیر لب سوہا کا نام لیا۔

"سوہا".....!! یہ تم ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم مجھے اس گلاب میں دکھائی دو گی"۔ وہ یک ٹک سوہا کے عکس دیکھتے ہوئے خمار آلود انداز میں بولنے لگا۔

"سوہا.....!! جواب دو، تم کہاں ہو۔ اور مجھے اس جلتے ہوئے گلاب کے پودے کے پھولوں میں کیوں نظر آرہی ہو"۔ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ڈھڑ اڈھڑ گلاب کا پودا جل رہا تھا۔ اس سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ مگر وہ گلاب آگ سے بے اثر تھا۔ وہ بالکل تروتازہ تھا۔ اور اس کے تینوں گلاب زرد رنگ میں نظر آرہے تھے۔

"میں یہ منظر اکثر اپنے خوابوں میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ یہ بالکل وہی منظر ہے۔ میرے خواب سچے تھے۔ مگر ادھورے تھے۔ سوہا تم کہاں ہو؟ کیا کسی مشکل میں ہو"۔ زین نے پوچھا۔ مگر اس کے جواب میں گہری خاموشی تھی۔

زین نے پودے سے نظریں ہٹائیں، اور دوبارہ اپنی نظر پودے پر مرکوز کردیں۔ اس کو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ کوئی خیال نہیں تھا۔ حقیقت تھی، جو اس کے بالکل سامنے تھی۔ اس گلاب کے پودے کے اندر سوہا کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ جو تکلیف میں لگ رہا تھا۔

زین نے گلاب کا پھول توڑنے کے لیے آگے

ہاتھ بڑھایا، مگر پودے کو ہاتھ لگتے ہی اس نے ہاتھ واپس کھینچ ڈالا۔ پودے میں بجلی کی طرح کرنٹ تھا۔ پودے میں برقی رو کا کرنٹ تھا۔ زین کا ہاتھ ابھی تک سنسنا رہا تھا۔ زین نے موبائل نکالا۔ اور اس سے پودے کی ویڈیو بنانے لگا۔ اس نے موبائل میں کئی منٹس کی ویڈیو بنائی۔ ویڈیو کلپ بنا کر اس نے سیو کر لیا۔ اب موبائل جیب میں ڈالا۔

''سوہا.....!! تم کہاں چلی گئی ہو؟ مجھے کیوں اکیلا چھوڑ دیا ہے؟ ایک بار واپس مل جاؤ۔ میں تمہیں کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ سوہا.....!! تم سن رہی ہو نا۔''

''سنو.....!! میں آج بھی اتنے سارے لوگوں میں بالکل اکیلا ہوں''۔ زین نے بے چینی سے کہا۔

''دیکھو.....!! میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا؟ ہر جگہ تمہیں تلاش کرتا رہا۔ مگر تم کہیں بھی نہ ملی۔ ہر اس جگہ بار بار گیا، جہاں تمہارے ایک فیصد بھی ملنے کی امید ہوتا اور آج جب تم مل گئی ہو۔ لیکن جلتے گلاب میں۔۔۔۔!! یہ کیا معمہ ہے؟ جب سے تم میری زندگی سے گئی ہو۔ میری زندگی میں تشنگی کے سوا کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ میں تمہیں تلاش کروں گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے''۔ زین نے اپنا ہاتھ آگے کیا اور اس پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر خود سے وعدہ کر لیا۔

''سوہا.....!! میں نہیں جانتا کہ میرے خوابوں میں تم اس طرح کیوں نظر آتی رہی ہو میں یہ بھی نہیں جانتا کہ ان سب کے پیچھے اصل کہانی کیا ہے؟ مگر میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ میں تم تک پہنچ جاؤں گا''۔ زین بے بسی سے سسکنے لگا۔ اسے یہ سب بہت مشکل لگ رہا تھا۔ مگر ناممکن نہیں تھا۔

''سوہا.....!! میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی پہلے دن کرتا تھا''۔ وہ بار بار سوہا کو مخاطب کر رہا تھا، جیسے وہ اس کی بات سن رہی ہو۔

سوہا.....!! کچھ تو بولو ناں.....!! میری یہ خوشی بھی عارضی ہے۔ تم تو مجھے ادھوری بھی نہیں مل سکی ہو۔ یہ جھلک تو مجھے خوابوں میں بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ بالکل ایک سایے کی طرح ہے اور سایہ تو کبھی بھی غائب ہو سکتا ہے''۔ اس نے ایک قدم بڑھا کر دھیرے سے سرگوشی کی۔

''سوہا.....!! تم کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟ کیا تم اس جلتے گلاب میں قید ہو گئی ہو۔ سوہا جواب دو.....!! بس ایک بار اس سچائی سے پردہ ہٹا دوں۔ تم کوئی بات تو کرو''۔ اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اپنے آنسو آستین سے صاف کر دیے۔

''سوہا.....!! تم کیوں ایسی خاموش ہو''۔ اس نے ہچکی لی۔

''سوہاہاہا''.....!!! زین پوری شدت سے چیخا۔ آخر اس نے اپنا ضبط کھو ہی دیا۔ وہ کب تک ایک عکس سے مخاطب ہو سکتا تھا۔ اس ویرانے میں اس کی اپنی چیخ کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ جب ضبط کی حد ختم ہو جائے تو انسان بے بسی کی انتہا پر کھڑا ہوتا ہے۔ اور زین اس وقت بالکل بے بس تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سوہا کو دیکھ تو سکتا تھا۔ مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ عکس کسی گمشدہ سایے کے مانند تھا۔ اس کا کچھ وجود نہیں تھا۔ تبھی تو وہ شدت غم سے چیخ رہا تھا۔ اس ویرانے میں وہ بالکل اکیلا تھا، اس کا سایہ بھی اس سب میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسے چپ کروانے دلاسہ دینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی اس کا ساتھی نہ تھا۔ اس کا دل ہی نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس ویرانے سے چلا جائے۔ وہ سسک رہا تھا اور پودے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے متواتر آنسوں بہہ رہے تھے۔ اس کا دل کسی بھی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے سسک رہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک اس جلتے گلاب کو دیکھتا رہا۔ کتنی دیر گزر گئی اسے کچھ احساس نہ ہوا۔ وہ یہاں اسی پودے کے پاس رات گزارنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کی کمر میں کانٹے دار جھاڑیاں گھس رہی تھیں، مگر اسے مطلق پرواہ نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر بند آنکھیں کر کے سوچتا رہا۔ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہونا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہوش تو اسے تب آیا جب اس کی موبائل کی گھنٹی

بج اٹھی۔ اس نے نا چاہتے ہوئے بھی جیب سے سیل نکالا۔ اسکرین پر ڈیڈ کا نمبر آ رہا تھا۔ اسے یہ موبائل اس وقت دنیا کی منحوس ترین شے لگا۔ کیونکہ اس نے اس کی سوچ میں خلل ڈالا تھا۔

''ہیلو.....!! ڈیڈ''.....!! اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''زین.....!! کہاں رہ گئے ہو یار''؟ ڈیڈ کی فکر میں ڈوبی آواز زین کے کانوں میں آئی۔

''ڈیڈ.....!! میں ٹھیک ہوں، راستے میں ہوں۔ گھر آ رہا ہوں''۔ اس نے باپ کو تسلی دی۔ رات بھی کافی ہو گئی تھی۔

''گڈ.....!! جلدی آ جاؤ.....!! تمہاری مام بہت پریشان ہو رہی ہیں''۔ ڈیڈ کی فکر میں ڈوبی آواز موبائل سے ابھری۔

''میں آ رہا ہوں۔ مام سے کہیے گا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے''۔ زین نے کہا۔

''ہاں.....!! میں کہہ دوں گا۔ اس وقت شہر کے حالات کا کچھ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تم جلدی سے گھر آ جاؤ''۔ ڈیڈ نے اسے حکمیہ لہجے میں کہا۔

''جی بالکل.....!! بس آدھے گھنٹے تک آ رہا ہوں''۔ زین نے اپنی طرف سے ڈیڈ کو تسلی دی۔

''گڈ.....!! آج کل کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کب کیا ہو جائے؟'' ڈیڈ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''ڈیڈ.....!! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ واقعی آج کل حالات بے حد خراب ہیں کہ کب کیا ہو جائے؟ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا''۔ اس نے باپ کی بات اپنے معنوں میں دہرائی۔

''اسی لیے تو یار.....!! میں کب سے کہہ رہا ہو کہ تم یہ شوبز کا چکر چھوڑ دو۔ بس اب میں مزید یہ رات والے پروگرامز بالکل بھی برداشت نہیں کروں گا۔ تم اپنا فیملی بزنس جوائن کر لو''۔ ڈیڈ اس کے شوبز کے چکر سے خفت نالاں تھے۔

''ڈیڈ.....!! ابھی تو آپ بالکل بنگ ہیں، مجھ سے زیادہ پوٹینشل اور توانائی آپ کے اندر ہے، میں اپنے سارے شوق پورے کر لوں۔ پھر چھوڑ دوں گا۔ یہ شوبز کا سلسلہ بھی.....!! پھر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی''۔

''زین.....!! یار مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، یہ جتنا بھی سب کچھ ہے تمہارا ہی تو ہے۔'' ڈیڈ اس بار نرم لہجے میں بولے۔

''ڈیڈ.....!! آپ میرے ہیں اور سب کچھ آپ کا ہے۔ بس جب آپ میرے نہیں، تو سب کچھ میرا ہی ہے''۔ زین کی بات پر ڈیڈ ہنس پڑے۔ زین کا دل بھی باپ کی باتوں سے کچھ دیر کے لیے بہل گیا۔

''ٹھیک ہے زین.....!! شاباش جلدی سے گھر پہنچو۔ میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا''۔

''بس آ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں''۔ زین نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اور اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوا

اس نے جلتے گلاب کو دیکھا۔ وہ ابھی اسی طرح آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور پھولوں کے اندر سوہا کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

''سوہا.....!! میں اس معمے کو ضرور حل کروں گا۔ میں یوں تمہیں جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں ڈھونڈ کر یہ اذیت ختم کر دوں گا، جو اس وقت تمہارے چہرے پر رقم ہے''۔ وہ اٹھا اور ایک بار پھر جلتے گلاب کو بغور دیکھا۔ اس نے گلاب کے پودے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جیسے ہی اس کا ہاتھ اس سے چھو گیا اس کو جھٹکا لگا تو وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔

''کاش.....!! میں یہ پودا اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ یا اس میں سے کوئی ایک پھول توڑ کر اپنے ساتھ لے جاتا''۔ اس نے بے بسی سے گلاب کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے سوہا کے عکس کے ساتھ عہد و پیمان کیے اور وہاں سے جانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے قدم آگے کو بڑھے۔ مگر اس کا دل بالکل بھی یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن اس کے ڈیڈ اور مام پریشان ہو گئے تھے۔ وہ ان کا دل بھی مزید نہیں دکھانا

چاہتا تھا۔اب وہ اس میدان سے نکل کر سڑک پر آگیا تھا۔اس نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی۔اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔وہ بے حد پریشان تھا۔اس کا پاور، پیسہ، فیم، کوئی بھی چیز اب مددگار نہیں رہا تھا۔وہ لوگوں کے لیے ایک ہیرو تھا، مگر وہ خود کو اس وقت بالکل زیرو لگ رہا تھا۔اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس معاملے کا سرا کہاں سے نکالے۔کیونکہ یہ سب اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

انہی سوچوں میں غلطاں اب وہ گھر کے بالکل سامنے تھا۔واچ مین نے مین گیٹ کھول دیا۔اس نے بائیک اندر کی۔اور گیراج میں کھڑی کردی۔وہ اب گھر کے اندرونی طرف جارہا تھا۔

☆......☆......☆

گیراج میں بائیک کھڑی کرکے وہ وسیع و عریض لان سے گزر رہا تھا، کہ اسے لان میں ڈیڈ اور مام دکھائی دیے، وہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔رات بہت ہوگئی تھی۔اور یہ دونوں کرسیوں پر بیٹھے اتنی رات کو کیا کررہے تھے۔بے ساختہ اس کے قدم اسی سمت بڑھ گئے۔

''السلام علیکم'' ......!! اس نے اونچی آواز میں بیک وقت دونوں کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام'' ......!! بیک وقت دونوں نے کہا۔

''زین بیٹا......!! اچھا ہوا کہ تم وقت پر آگئے۔ تمہارا ہی انتظار ہورہا تھا''۔ڈیڈ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''اچھا......!! کوئی خاص بات کرنی تھی کیا''؟

زین ان کے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں......!! بہت خاص بات ہے، بیٹا اب تم بڑے ہوگئے ہو، اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس موجود ہے۔اور اوپر سے تم اچھے خاصے کمانے لگ گئے ہو۔ تمہارا مام چاہ رہی ہیں کہ اب تمہارے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ تھمادیا جائے''۔ڈیڈ نے بات آگے بڑھادی۔

''بالکل زین......!! تمہارے پاپا اور میری دل سے خواہش ہے، کہ تم اب کسی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا شروع کردو اور زندگی بھر اس ہم سفر کے ساتھ اپنی باقی سفر منزل تک اختتام پذیر کردو''۔اس نے مام ڈیڈ کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

''بیٹا تمہاری شادی کی خواہش میرے دل میں تب سے ہے۔ جب تم پیدا ہوئے تھے۔اور اب تم انکار بالکل بھی نہیں کروگے''۔ماں کا چہرہ جیسے خوشی سے چمک رہا تھا۔

''مام......!! ڈیڈ......!! میں فی الحال بنا شادی کے بہت خوش ہوں۔ میں ابھی شادی کرکے اپنا کریئر ڈسٹرائے نہیں کرنا چاہتا۔ میں جب بھی شادی کرنا چاہوں گا۔سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا۔ابھی مجھے اپنی آزادی بے حد عزیز ہے''۔اس نے ماں باپ کی طرف دیکھا۔اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''زین......!! اب یہ بہانہ نہیں چلے گا۔ میں سیریس ہوں''۔مام نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''مام......!! یہ کوئی بہانہ نہیں ہے، میں ابھی بالکل سنجیدہ ہوں۔ مجھے ابھی وہ لڑکی ملی ہی نہیں ہے، جو اس گھر کی بہو بن سکے۔ میں ابھی تک خود کسی کی تلاش میں ہوں اور میری تلاش ابھی نامکمل ہے''۔اس نے اپنے چہرے کو سنجیدہ سا بنا کر ماں کی طرف دیکھا۔اس بار ڈیڈ اور مام حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

''مام......!! ابھی میں کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میری زندگی میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ابھی تو میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا''۔

''بیٹا......!! ماہ نور جبین......!! اچھی لڑکی ہے۔ ہم تمہارے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ وہ خاندانی لڑکی ہے۔اور تمہارے ڈیڈ کے دوست ندیم اعوان کی بیٹی ہے۔ہم دونوں ابھی ان کے بارے میں ہی بات کررہے تھے''۔

''ہاں......!! بیٹا......!! بالکل ماہ نور جبین بہت خوبصورت لڑکی ہے۔اگر تمہیں وہ پسند ہو۔تو ہم وہاں تمہاری بات چلاتے ہیں''۔ڈیڈ نے زین کی طرف دیکھا۔زین کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

نو......!! مام ڈیڈ......!! وہ لڑکی خوبصورت اور خاندانی ضرور ہے۔مگر خوب سیرت نہیں ہے۔وہ کوئی انڈین آئٹم گرل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مجھے ایسی بدتمیز اور بے باک لڑکیاں بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔وہ تو انڈین فلمز کے ایکٹریسز سے زیادہ بولڈ ہے''۔زین کی بات پر مام ڈیڈ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔اور زین نے ان کو کھلے لفظوں میں سمجھا بھی دیا۔آئندہ کے لیے اس کا نام ماہ نور جبین سے قطعاً منسوب نہ کیا جائے۔

''زین......!! اگر تمہاری نظر میں کوئی اور لڑکی ہو، تو بتادو۔ہم وہاں جاکر تمہاری بات چلائیں گے''۔ماں سمجھدار تھی، فوراً بیٹے کی دل کی بات سمجھ گئی، انہوں نے سوچا کہ بیٹے کے دل میں کوئی اپسرا بس گئی ہے۔اب اس کا نام تو کم از کم وہ جان لے۔تبھی اس کی دل کی بات کی۔

''ہاں......!! مام''......!! اس نے دھیرے سے اعتراف کیا۔

''کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ کیا ہم اسے جانتے ہیں''؟ مام جوش سے پوچھنے لگیں۔

''مام......!! اس کا نام سوہا ہے۔ وقت آنے پر میں اسے آپ سے ضرور ملواؤں گا''۔اس نے مام کی طرف دیکھا۔ زین کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا۔اور دوسرا جارہا تھا۔سوہا کے ذکر پر اس کا اندر باہر سکون سے بھر گیا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔جیسی تمہاری مرضی''......!! مام نے اس کی آنکھوں میں روشنی سی دیکھی۔

مام، ڈیڈ......!! میں بہت زیادہ تھکاوٹ محسوس کررہا ہوں۔اب میں آرام کرنے جارہا ہوں''۔

''بالکل......!! تم جاؤ......!!'' ڈیڈ نے پیار سے کہا تو زین وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور مام ڈیڈ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ ڈیڈ بہت پریشان ہوگئے تھے۔ان کے چہرے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔وہ کبھی بھی نہیں چاہتے تھے، کہ زین کسی اور کو پسند کرے۔وہ زین کی شادی بہت امیر و کبیر ہم پلہ خاندان میں کرنے کے خواہش مند تھے۔وہ اپنے جیسے اسٹیبلش فیملی میں اس کی شادی کے خواہش مند تھے۔ندیم اعوان کی فیملی ان میں سے ایک تھی۔وہ سیاست میں بھی بہت آگے تھی۔ڈیڈ بار بار نفی میں سر ہلارہے تھے۔

''ابرار......!! کیا کہتے ہو؟ زین کی پسند کو کبھی دیکھا ہے؟ یہ کس کی بیٹی ہوسکتی ہے''؟ زرتاشہ نے معنی خیزی سے پوچھا۔

''نن ---- نہیں----!! جتنے لوگوں سے میرے تعلقات ہیں۔ان میں سے کسی کی بیٹی کا نام سوہا نہیں ہے''۔ابرار نے کہا۔

''ابرار......!! مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے۔ کہیں زین......!! کسی کو اسٹار پر تو نہیں مرمٹا ہے۔ یہ اداکارئیں بہت بڑی جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔کسی کو بھی پاگل کرسکتی ہیں۔آئے روز زین کا کسی نہ کسی اداکارہ کے ساتھ افیئر کی خبریں آتی رہتی ہیں''۔

''میرے خیال میں زین اتنا بھی بیوقوف نہیں ہے کہ کسی کو اسٹار پر فدا ہوجائے''۔ابرار نے معنی خیزی سے کہا۔

''تو پھر......!! وہ کون ہوسکتی ہے''؟ زرتاشہ نے ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھا۔

''تم زیادہ فکرمند نہ ہو......!! وقت آنے پر سب پتہ چل جائے گا۔ ابھی بہت دیر ہوگئی ہے۔آؤ اندر چلیں''۔ابرار اٹھے تو زرتاشہ بھی اٹھ گئی۔وہ دونوں اپنے کمرے کی طرف جارہے تھے۔لان بالکل سنسان رہ گیا۔اب وہاں کوئی نہ تھا۔

☆......☆......☆

زین کو نیند نہیں آرہی تھی۔بار بار اس کی نگاہوں میں جلتے گلاب گھوم پھر رہے تھے۔وہ جب بھی آنکھیں بند کرتا۔اس کی نیند میں ڈوبی آنکھیں وہی منظر کھینچ کر اس کے ذہن میں گھمادیتیں۔ وہ سوچ بھی وہی رہا تھا۔وہ تپ سے آنکھیں کھول دیتا۔اور جلتے گلاب میں اسے سوہا کا عکس پریشان کرتا رہتا تھا۔اسے اس وجہ سے

بالکل بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنا موبائل جیب سے نکالا۔ اور وہی ویڈیو کلپ پلے کردیا۔

ویڈیو میں وہی منظر تھا۔ جو ابھی وہ بند آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس سچائی کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ جو اس کے پاس محفوظ تھا۔

''اگر میں کسی کو یہ ساری بات بتاؤں، تو لوگ مجھے پاگل سمجھیں گے۔ کوئی میرا یقین ہی نہیں کرے گا۔ سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ اور اس معاملے میں صرف ایک پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔ وہی میری مدد کرسکتا ہے۔ وہ ذات صرف اللہ کی ہے۔''

اب وہ واش روم میں تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بالکل تر و تازہ تھا۔ اب وہ کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اور اب وہ اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔ دعا کررہا تھا۔ پہلی بار کسی لمحے میں اسے سکون کی سانسیں نصیب ہوئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے زین سخت پریشان تھا۔ اور وہ جیسے ضبط کے کھڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اب وہ جائے نماز پر اللہ کے حضور سجدہ ریز تھا۔ نماز پڑھ چکا تھا۔ یہ سجدہ اللہ سے مدد مانگنے کے لیے کیا تھا۔ وہ کتنی دیر سجدہ ریز رہا۔ اس کا لمبا سجدہ اس کی سکون کا باعث بنا۔ اس نے جائے نماز فولڈ کی۔ اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ساری رات وہ جاگتا رہا۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کردیتا۔ کٹ سے وہی جلتے گلاب کا منظر اس کے سامنے نمودار ہو جاتا۔ وہ فوراً آنکھیں کھول دیتا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ آگے ایسا کیا کرے کہ سوہا اس کو مل جائے۔ مگر یہ سب بہت مشکل تھا۔ مگر ناممکن نہیں تھا۔ اگر سوہا کسی جلتے گلاب میں مقید ہوسکتی تھی تو اس سے نکل بھی سکتی تھی۔

ہر چیز شروع میں بے حد مشکل لگتی ہے۔ مگر پہلے قدم کے بعد وہ مشکلات کہیں گم ہو جاتی ہیں۔ اور ایک راستہ بن جاتا ہے۔ وہ راستہ پھر آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی آپ کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

زین ساری رات سو نہ پایا۔ دور قریب سے صبح کی اذانیں بلند ہونے لگیں۔ تب وہ اذانوں کو بغور سننے لگا۔ اسے اس میں سکون ملنے لگا۔ وہ اٹھا اس نے وضو دوبارہ تازہ کیا۔ اور نماز پڑھنے چلا گیا۔ وہ جب واپس آیا۔ تو صبح کی پھوٹ پکی تھی۔ آسمان پر ایک ستارہ روشن تھا، وہ صبح کا ستارہ تھا۔ سارے راستے وہ اسی امید کے ستارے کی طرف دیکھتا آیا تھا۔ جو آسمان میں صبح کی روشنی کے باوجود روشن تھا۔ اور سارے جہاں کو دور سے بھی نظر آرہا تھا۔ وہ اب اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے دونوں آنکھیں بند کر کے گہری سانسیں لیں۔ اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ نیند کی دیوی اس پر دھیرے سے مہربان ہوگئی، تو وہ اپنے آپ سے بے خبر ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

اور جب اس کی آنکھ کھلی، تو اچھی خاصی دوپہر ہو گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بجنے والے تھے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور جلدی سے واش روم میں گھس گیا۔ وہ بالکل فریش تھا۔ وہ جلدی سے گیراج کی طرف بڑھا۔ گیراج میں ماما، ڈیڈ کی گاڑیاں نہیں تھیں، وہ دونوں اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ اب وہ گاڑی میں رات والے میدان کی طرف جا رہا تھا۔ شہر میں خوب ٹریفک تھا۔ اسکول کی چھٹی ہوگئی تھی۔ جگہ جگہ سے ہارنز کے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بڑی مشکلوں سے ٹریفک کے اژدہام سے نکل گیا۔ اب اس کا رخ میدان کی طرف تھا۔ یہ بہت بڑا میدان تھا۔ شہری مضافات سے اچھا خاصہ دور کی پر واقع تھا۔ وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا اس نے سڑک کنارے گاڑی روک دی، اور میدان کی طرف قدم بڑھانے شروع کردیئے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

''کہیں وہ گلاب جل کر کوئلہ نہ ہوگیا ہو۔ یا پھر وہ اب کہیں غائب نہ ہوگیا ہو''۔ اس نے تیز قدم آگے بڑھانے شروع کردیے۔

''نن۔۔۔نہیں.....!! ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس میں میری سوہا مقید ہے۔ وہ گلاب گم نہیں ہوسکتا''۔ اس نے خود کو دلاسہ دیا۔ اور میدان میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

''سوہا.....!! پلیز ایک بار دوبارہ مل جاؤں ناں۔ میں اس بار تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں رکھ

دلچسپ کہانیوں کا رسالہ

ماہنامہ

بچوں کا میگزین

کراچی

اپریل کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

جس میں جن، بھوت، چڑیل، بادشاہوں، شہزادیوں کے علاوہ دلچسپ معلومات عامہ، پہیلیاں، لطیفے، اقوال زریں اور مزیدار کہانیاں شامل ہیں۔

لہٰذا قلم اٹھائیں اور اپنی اچھی اچھی تحریریں فوراً ارسال کردیں تاکہ آپ بھی انعامات کے حق دار بن جائیں۔

ماہنامہ

بچوں کا میگزین

میں لکھنے کے لیے کوئی شرط نہیں بلکہ تحریر کا معیاری ہونا ضروری ہے۔

پیارے بچو! بچوں کے میگزین میں رنگین تصاویر بھی شائع کی جائیں گی تو آپ اپنی اچھی اور رنگین تصویر فوراً ارسال کردیں۔

پیارے بچو، قلم اٹھائیں اور جلد از جلد اپنی تحریریں ارسال کردیں۔

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ

بچوں کا میگزین

گوالی لائن نمبر 3، نورانی آرکیڈ

نیو اردو بازار کراچی

فون نمبر: 021-32744391

سکتا۔ جس طرح وہ گلاب جل رہا تھا۔ اسی طرح میں بھی جل رہا ہو۔ مگر کسی کو نظر نہیں آرہا۔ تمہاری جدائی نے میری روح کو بہت تڑپایا ہے۔ سوہا......!!! اس بار مجھ سے جدا مت ہونا۔ میں مر جاؤں گا''۔ وہ خود سے بولتا ہوا میدان میں کافی دور تک آگیا تھا۔ وہ اپنے دل کو ڈھارس بھی دے رہا تھا۔ میدان جھاڑیوں سے بھرا تھا۔ اسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ ہر جگہ دھول مٹی اور گرد غبار تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی، کہ اس نے رات کو جلتے گلاب کا پودا کونسی جگہ دیکھا تھا۔ وہ میدان کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ میدانی گھاس جو کانٹوں کی طرح نوکیلی تھی، حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ زین نے جلتے گلاب کا پودا بہت تلاش کیا۔ مگر اسے کہیں بھی نہ ملا۔ اس نے ذہن پر کافی زور ڈالا کہ کہیں وہ غلط جگہ تو نہیں آگیا ہے۔ مگر نہیں وہ کل اسی میدان میں آیا تھا۔ اس نے ہر جگہ وہ پودا پاگلوں کی طرح ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

''ان جنگلی پودوں کے بیچ ہی وہ پودا تھا۔ مگر ابھی اس ویرانے میں وہ کہیں بھی نظر نہیں آرہا ہے''۔ اس نے ذہن پر کافی زور ڈالا۔ مگر وہ غلط نہیں تھا۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ پودا کیسے کہیں گم ہو سکتا ہے''؟ اس نے مکہ ہاتھ پر مارا۔

''مجھے یہاں سے رات کو جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ رات کو اسی جگہ وہ جلتے گلاب کا پودا تھا''۔ اس نے اپنے آپ کو دلاسہ دیا۔ مگر وہ اب بھی وہاں بالکل بت کی طرح کھڑا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس نے زمین کا نچلا حصہ دیکھنا شروع کر دیا۔ کانٹوں میں زمین کو دیکھنا کافی مشکل کام تھا۔ مگر اسے یہ سب کرنا تھا۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھوں پر کئی خراشیں بھی پڑ گئیں۔ مگر اس نے قطعاً پرواہ نہیں کی۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس نے وہ دیکھ لیا، جو کچھ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی نے وہ جگہ کھودی تھی۔ اور وہاں سے وہ جلتے گلاب کا پودا نکال دیا تھا۔ وہاں سخت اور کھردری زمین سے وہ پودا کوئی لے گیا تھا۔ کیونکہ ایک جگہ چھوٹا سا گڑھا تھا۔ جو ٹھیک سے کسی نے بھرا بھی نہیں تھا۔ اس گڑھے کے اوپر خودرو جھاڑیاں ڈال دی تھی۔ زین نے پودوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں ان پتوں پر انسانی خون کے قطرے بھی گرے ہوئے تھے۔ مگر یہ قطرے بہت کم تھے، پودا نکالنے کی کوشش میں کسی کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ اور اس سے کچھ خون یہاں وہاں پتوں پر گر گیا تھا۔ پودا نکالنے والا ضرور زخمی ہو گیا ہوگا۔ اور وہاں سے چلا گیا ہوگا۔ وہ خون خشک ہوا تھا۔

''او شٹ......!! میرے جانے کے بعد کوئی یہاں آیا تھا۔ اور پودا جڑ سمیت نکال کر لے گیا''۔ زین نے غصے سے مکا ہوا میں لہرایا۔ وہ صدمے سے اپنی جگہ پر بیٹھتا چلا گیا۔

نن۔۔۔نہیں......!! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ پودا تو کرنٹ دے رہا تھا۔ ایسا کوئی کیوں کرے گا۔ جو کام میں نہ کر سکا۔ وہ کسی اور نے کر دیا۔ مگر کیسے۔۔۔۔!!! اور کس نے؟ مگر کسی نہ کسی نے تو یہ کام ضرور کیا ہے۔ مگر کیا کیسے؟ کوئی تو میرے جانے کے بعد یہاں پر آیا تھا۔ کیا نہ کسی کو تو پتہ چلا ہوگا۔ جیسے مجھے پتہ چلا تھا''۔ وہ اس وقت شدید غصے میں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ مگر ٹھیک طریقے سے کوئی ایک آدھ کڑی ہی ملا پاتا۔ اور غصے سے اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا۔ وہ پچھتا بھی رہا تھا کہ وہ کیوں رات کو اس جگہ سے چلا گیا۔ اور کسی دوسرے کو موقع مل گیا۔ غصہ اسے اپنے آپ پر آرہا تھا، کہ وہ کیوں اس پودے کی حفاظت نہیں کر سکا۔

''کوئی تو ہے......!!! جو میرے اور سوہا کے بیچ میں ہے۔ وہ کون ہے مجھے اس کا پتہ لگانا ہے۔ کل میں نے اس جلتے گلاب میں سوہا......!!! صرف سوہا کا عکس دیکھا تھا، اور میں کتنا مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ تم دوبارہ میری زندگی میں آجاؤ گی۔ میں نے کل رات مام کے سامنے تمہارا نام بھی لے لیا تھا۔ اور مام ڈیڈ کو میری پسند پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ دونوں نے نرمی کا تاثر دیا تھا''۔

وہ صدمے سے بے حال ہو کر سسکتا چلا گیا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور وہ پانی آبشار کی صورت اس کے رخسار پر بہتا چلا گیا۔ زین کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت، شہرت، پیسہ، پیار کرنے والے ماں باپ، اگر کچھ نہیں تھا، تو وہ اس کا سچا پیار نہیں تھا۔ کیا وہ پیار کے معاملے میں بدقسمت تھا، یا پھر وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ ان دونوں کے بیچ کوئی تیسرا حائل تھا۔ زین کے پاس سب کچھ بہترین تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں تھا۔ جو وہ چاہتا تھا۔ وہ سوہا کا ساتھ تھا۔ اور ابھی وہ پا نہ سکا تھا۔ پانے سے پہلے اقرار کرنے سے پہلے سوہا اس کی زندگی سے نکل کر کہیں گم ہو گئی تھی۔

''سوہا......!! وہ وقت کب آئے گا۔ جب تم میری روبرو ہو گی، اور میں تمہیں یہ تھری میجک ورڈز کہوں گا''۔

''سوہا......!! آئی لو یو......!!'' وہ اس ویران میدان میں چیخ رہا تھا۔ اب وہ خاموش تھا۔ اور اسی زمین پر لیٹا، اس کے پیٹھ میں کتنے کانٹے چبھ گئے تھے۔

''کیا میں خالی ہاتھ ہوں''؟ اس نے خود سے کہا۔ اور خاموش ہو گیا۔

''میرے لیے وہ جلتے گلاب کا پودا بہت ضروری تھا۔ سوہا اس میں تمہارا عکس تھا۔ سوہا میں نے تمہیں کھونے کے بعد تمہارے عکس کو بھی کھو دیا ہے''۔

''سوہا......!! تم اس دنیا کی واحد انسان ہو جسے میں نے اپنے تمام تر جذبوں کی شدت سے چاہا ہے۔ میرے جذبوں میں کوئی کھوٹ نہیں۔ پھر تم کیوں ایسے گم ہو گئی ہو۔ میں تمہیں ڈھونڈوں گا۔ تمہیں اپناؤں گا۔ اس دنیا میں اگر تم سینکڑوں انسانوں کے بیچ میں بھی کھڑی ہو گی تو میں تمہیں پہچان لوں گا۔ میں اپنا چہرہ تو بھول سکتا ہوں، مگر تمہارا نہیں''۔

''یا پھر جو آج میں خالی ہاتھ ہوں، کیا میں آگے بھی اسی طرح ناکام ہو جاؤں گا۔ سوہا اگر میں زندہ ہوں سانسیں لے رہا ہوں، تو اسی لیے لے رہا ہوں کہ تم میری امید ہو۔ تمہاری چاہ میں میں زندہ ہوں۔ تم میری امید کی کرن ہو۔ روشنی میں چمکنے والا ستارہ ہو۔ مگر مجھے یہ پتہ ہے کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔ مجھے پیار کرتی ہو۔ تم خود سے گم نہیں ہوئی ہو، ہمارے درمیان کوئی تیسرا فرد ہے۔ جو نظر نہیں آرہا ہے۔ مگر مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ابھی نظروں سے اوجھل ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ ساتھ اس تیسرے آدمی کو بھی ڈھونڈنا ہو گا۔ تب میرا سارا مسئلہ سلجھ جائے گا۔ سوہا اس نے پہلے مجھ سے تمہیں چھینا۔ اور بعد میں تمہارے عکس کو بھی چھین لیا۔ آج ایک بار پھر میں خالی ہاتھ ہوں''۔ وہ کئی لمحوں تک اسی جگہ بے آواز سسکتا رہا۔

☆......☆......☆

کچھ دیر بعد اس کی موبائیل کی بل بج اٹھی۔ اس نے موبائیل نکال کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ تو اس کو حیرت ہوئی۔

''اوہ......!! آج تو میں نے شوٹ پر جانا تھا۔ ڈائریکٹر اکرام اللہ کے ڈرامے کا آج کلائمکس سین کرنے تھے۔'' اس نے ہاتھ ماتھے پر مارا۔ اور اٹھ بیٹھا۔ اس نے کال پک کی۔

''ہیلو......!! سر السلام علیکم''......!! اس نے اکرام اللہ سے کہا۔

''کہاں ہو یار......!! سب تمہارے شوٹنگ اسپاٹ پر انتظار کر رہے ہیں۔ اور تم غائب ہو''۔

''سوری سر......!! ایک ضروری مسئلے میں پھنس گیا تھا۔ بس آرہا ہوں''۔ اس نے معذرت خوانانہ انداز میں کہا۔

''جلدی پہنچ جاؤ۔ ہم ایک گھنٹے سے ویٹ کر رہے ہیں، ہیروئن کو دوسرے ڈائریکٹر کے شوٹ پر بھی جانا ہے۔ پوری کاسٹ جمع ہے''۔ اکرام اللہ نے کہا۔ اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''اوکے سر......!! بس ابھی پہنچ رہا ہوں۔ آپ سب کو ریڈی کر دیں''۔

''سب میرا انتظار کر رہے ہیں، اور میں اس ویرانے میں ماتم کر رہا ہوں''۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ وہ اٹھا اس نے کپڑے جھاڑے۔ اور میدان سے نکل کر گاڑی کی طرف جانا شروع کر دیا۔ اب وہ گاڑی

میں بیٹھا ہوا تھا۔اور شوٹنگ اسپاٹ کی طرف جارہا تھا۔وہ بہت رف ڈرائیو کررہا تھا، وہ آدھے گھنٹے میں شوٹنگ اسپاٹ پر پہنچ گیا تھا۔سب نے اس کا بہت گرم جوشی سے استقبال کیا، مگر ہیروئن رمشال شاہ کے منہ کے زاویے بگڑے ہوئے تھے۔اس نے جلدی سے چینج کیا۔اور میک اپ کرنے والے نے اس کا میک اپ کر دیا۔زین اب کردار کے گیٹ اپ میں تھا۔ہیروئن کے سر پر کسی نے چھتری تانی ہوئی تھی۔وہ اسٹرابری شیک پی رہی تھی۔زین اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔اس نے رمشال شاہ کو دیکھا۔اس نے اپنے منہ کے زاویے بگاڑ دیے۔اس نے زین کونظر انداز کیا۔

''رمشال شاہ......!!شیک پی رہی ہو''؟ اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''دیکھ ہی رہے ہو۔۔۔!!'' رمشال شاہ نے ادا سے کہا۔وہ زین کے ساتھ کام تو پورے تعاون سے کر رہی تھی، مگر وہ اس سے سخت ناراض تھی۔وہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دل سے نہیں دیتی تھی وہ زین پر اپنا دل ہار چکی تھی۔اور جب سے اس نے زین سے اظہارِ محبت کیا تھا۔زین نے اسے صاف انکار کر دیا تھا۔وہ یہاں کام کرنے آیا تھا محبت کرنے نہیں۔

''ہاں.....!! واقعی اندھا میں بھی نہیں ہوں''۔ زین نے کندھے اچکائے۔رمشال شاہ نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔اس نے شیک سے ایک گھونٹ بھرا۔

''پھر بھی کیسی ہو؟ کہو کیا ابھی بھی ناراض ہو''۔ زین کمال کا نوجوان تھا۔اس نے رمشال شاہ کی بات نظر انداز کر دی۔وہ جتنا بھی پریشان ہوتا، اپنی پریشانی کسی پر ظاہر نہیں کرتا تھا۔وہ دوستانہ ماحول میں کام کرنے کا عادی تھا۔اس لیے اس نے رمشال شاہ کا سرد مہر رویہ نظر انداز کر دیا۔

''ہاں ...!! میں تو ٹھیک ہوں ۔ مگر مجھے تو تم ٹھیک نہیں لگ رہے ہو''؟ اس نے زین کے ہاتھوں کے خراشوں کو غور سے دیکھا۔اس کی جلد سرخ ہوگئی تھی۔

''ہاں.....!! میں کچھ ڈسٹرب ہوں۔میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے کسی کی تلاش ہے۔مگر میں اپنی پریشانی کسی سے بھی شیئر نہیں کرتا۔مگر ہم اس سے پہلے اچھے دوست بھی تو تھے۔تم ہمیشہ میری ہم مزاج رہی ہو۔میری پریشانیاں بانپ لیتی ہو''۔زین نے اس کو بغور دیکھا۔

''زین ......!!اس لیے تو مجھے تم سے محبت ہو گئی۔مگر تم نے انکار کر کے میرا دل ہی توڑ دیا''۔اس نے قدرے اداسی سے زین کو جتایا۔

''رمشال......!!اگر مجھے کسی سے محبت نہ ہوتی، تو میں کبھی تمہیں ناراض نہ کرتا۔ میں آل ریڈی کسی کو دل سے چاہتا ہوں۔اس دنیا میں تم وہ واحد انسان ہو، جس سے میں اپنے مسئلے شیئر کرتا ہوں۔ میں کتنا بھی پریشان کیوں نہ ہو جاؤں، مگر کوئی میرے چہرے سے کبھی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں یا میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر سیریسلی میں آج کل شدید ڈیپریس ہوں۔ پھر بھی میں تمہیں اتنی وضاحت دے سکتا ہوں، اگر تمہارا موڈ میری وجہ سے خراب ہے یا تم میری وجہ سے اداس ہوگئی ہوتو تم مجھے دیکھو......!! میں اپنے دونوں کان پکڑ کر تم سے سوری کر لیتا ہوں۔ مگر رمشال میں آل ریڈی کسی سے محبت کرتا ہوں۔اگر میں کسی کو نہیں چاہتا، تو تمہارے آفر پر غور کیا جاسکتا تھا''۔زین نے اس سے کہا۔

''تو......!!!زین.....!!اگر میں ناراض تھی بھی تو اب ایسی کوئی بات نہیں.....!!کسی کو چاہنا یا کسی سے محبت کرنا یہ ہمارے بس میں ہے۔ کسی کو پانا، یا وہ ہماری محبت کا جواب محبت سے دے۔یہ ہمارے بس میں نہیں ہے''۔رمشال نے زین کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''ہاں......!! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ زندگی ہے۔اس میں ایسا ہی ہوتا ہے''۔زین نے اس کو دیکھا۔

''زین....!! اگر وہ تمہیں نہ ملی، تو تم میری طرف ہاتھ بڑھاؤ گے۔ میرا ہاتھ ہمیشہ تمہارا منتظر رہے گا۔ میں تم سے ناراض تھی، مگر میری ناراضگی اپنی جگہ مگر میری محبت سدا تمہاری رہے گی۔اور میں اگر نخرے کر رہی تھی، تو وہ تمہاری لیٹ آمد کی وجہ سے کر رہی تھی''۔

''رمشال......!! یہ تم کہہ رہی ہو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔'' اچانک ڈائریکٹر اکرام اللہ خان ان کے پاس چلے آئے۔

''شاباش...!!ریڈی ہو جاؤ''۔انہوں نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔اور اپنی کیپ اُتاری۔

''سر......!!ہم ریڈی ہیں''۔زین نے کہا۔

''میں بھی تیار ہوں''......!!اکرام اللہ نے جیسے ہی رمشال کو دیکھا۔تو وہ دونوں بھی اٹھ کر اندر چلے گئے۔اب وہ شوٹنگ میں بزی ہو گئے۔کئی گھنٹوں کی محنت سے کافی سارا کام مکمل ہو گیا۔زین کا دھیان بھی کافی حد تک بٹ گیا تھا۔اب صرف کلائمکس کا کام رہتا تھا۔جس میں زین اور رمشال کا ملن کا منظر دکھانا تھا۔اور مثبت پیغام دینا تھا۔

☆......☆......☆

زین کمرے میں ایک طرف کھڑا تھا، اور اس کے سامنے رمشال شاہ کھڑی ہوئی تھی۔

'' آخری قسط: سین نمبر پچیس......!! ......!!

ایک لڑکی نے مائیک پر کہا۔ڈائریکٹر نے کیمرہ ان دونوں پر فوکس کر رکھا تھا۔اب ڈائریکٹر کیمرے سے ہٹ چکا تھا۔

ون ٹو تھری۔۔۔!! اسٹارٹ......!! اکرام اللہ چیخا۔سین فلمانا شروع ہو گیا۔اب زین کی ڈائیلاگ کی باری تھی۔اس نے بولنا شروع کر دیا۔اس سیریل میں رمشال شاہ کا نام زوجاز تھا۔اور زین کا ارسل دونوں میاں بیوی کا کردار نبھا رہے تھے۔اور زین کا باپ اس پلے میں ولن تھا۔وہ بھی اڈھیڑ عمر کا نامور اداکار تھا۔

''زوجاز......!!تمہیں کوئی پتہ ہی نہیں کہ تم میرے لیے کیا ہو؟ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ ہمیں جدا کرنے والا کوئی اور نہیں، میرا اپنا سگا باپ تھا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا باپ ایسا کر سکتا ہے''؟ زین نے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے بھرپور جذبات میں بولا۔

''ارسل......!!میں نے تو تمہیں بہت پہلے ہی اگاہ کر دیا تھا۔مگر تمہاری آنکھوں پر اپنے باپ کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انکل کے کہنے پر تم نے مجھے ڈائیورس نہیں کیا۔میرا صبر میرے کام آ ہی گیا ہے''۔رمشال نے بھرپور انداز میں کہا۔

''زوجاز.....!! میں نے تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔اس نے تم پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ مجھے تم سے بدظن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہماری محبت سچی تھی۔زمانے کی شازشیں ناکام ہو گئی ہیں۔اب ہم کبھی بھی جدا نہیں ہونگے''۔اور یہ کہہ کر زین نے خاموشی اختیار کر لی۔کیمرہ ان دونوں پر فوکس تھا۔اور دوسرا کیمرہ مختلف زاویوں سے شوٹ کر رہا تھا۔آگے بھی زین کے لائنز تھے۔اس نے بولنا تھا۔یہ وقفہ میوزک ڈالنے کے لیے دیا گیا تھا۔بیک گراؤنڈ میوزک، یہاں پر یوز کرنا تھا۔

''زوجاز......!! وہ جیسا بھی ہے میرا باپ ہے، میں اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔کیا تم میری خاطر اپنا دل بڑا کر کے اسے معاف نہیں کر سکتی۔اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔''زین نے ارسل کا کردار ایمانداری سے نبھایا۔اس نے دونوں ہاتھ رمشال کے سامنے جوڑ دیے۔

''ارسل.....!! میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں۔تم نے مجھے اجڑنے نہیں دیا۔ میں اور تم ایک ہو، میرے لیے یہی بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ تم میرے سامنے ہاتھ مت جوڑو۔ میں نے اسے معاف کر دیا ہے''۔رمشال خاموش ہو گئی۔زین نے اس کو تھوڑا سا خود تک قریب کر لیا۔دونوں اب ایک بار ریہبل سلز کے مطابق کچھ میوزک کے لیے سین کری ایٹ کر رہے تھے۔

''انکل نے میری ہمدردی حاصل کر کے مجھے بھی تمہارے خلاف اکسایا تھا۔ارسل......!! آج کے بعد میں کسی کی باتوں میں نہیں آؤں گی۔تبھی تو ہمارے درمیان لڑائیوں جھگڑوں نے جنم لیا تھا۔اور ہماری خوشگوار زندگی جہنم بن گئی تھی۔اور نوبت جدائی تک آ گئی تھی''۔

''میں نے تم سے محبت کی شادی کی تھی۔بس یہ

بات ان کو پسند نہیں آئی، وہ میرے بڑے ہیں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں۔ ان ہی کی بدولت ہوں۔ اگر آج میں انھیں چھوڑ دوں تو کل میرے بچے بھی مجھے ایسے ہی چھوڑ دینگیں"......!! زین روہانسہ ہوگیا۔

"ارسل.....!! میں نے کب کہا کہ تم انکل کو میری خاطر چھوڑ دو۔ تم ان کے حقوق سے کبھی غافل نہ رہو، اور جو میرے حقوق ہیں ان سے بھی کوتاہی نہ کرو۔ میں نے کہہ دیا ہے، میں نے انکل کو معاف کر دیا ہے۔ بلکہ میں ان سے خود معافی مانگ لوں گی"۔

بس بیٹی بس......!! آگے کچھ مت کہنا۔ میں نے تمہاری اور ارسل کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ معافی تو مجھے تم سے مانگ لینی چاہیے"۔ اچانک دروازے سے وہی سینئر اداکار اندر داخل ہوگئے۔ وہ زین کا باپ بنے تھے۔ اور دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ ڈرامے کے سین کے مطابق وہ زین (ارسل) کے پیچھے کافی غصے میں آئے تھے۔ مگر دونوں کی گفتگو سن لینے کے بعد وہ شرمندہ سے ہوگئے۔

زوجاز.....!! بیٹا میں اپنے کیے پر بے حد شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دو۔" اس نے دونوں ہاتھ رمشال شاہ کے سامنے جوڑ دیئے۔

"ارے انکل.....!! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے بیٹی بول دیا۔ بس یہ میرے لیے کافی ہے۔ آج سے میں آپ کو انکل نہیں پاپا کہوں گی۔ آپ میرے پاپا ہیں۔ آپ آئندہ بھی مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ معافی مانگنے کے بجائے مجھے گلے لگا ئیں"۔ اور سینئر اداکار نے اسے فوراً گلے لگایا۔

"ارسل بیٹا.....!! ادھر آؤ تم بھی میرے گلے لگ جاؤ۔ تم بھی تو میرے بیٹے ہو"۔ زین فوراً اس کے گلے جا لگا۔ باپ نے دونوں بچوں کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ زوجاز اور ارسل نے تشکر بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں سے جیسے چند آنسو ں گر گئے۔ یہ تشکر کے آنسوں تھے اور یوں ہیپی دی اینڈ ہوگیا۔ سین کے کلوز اپ کے بعد ڈائریکٹر نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ ڈائریکٹر کے تالیاں بجاتے ہی یونٹ کے سب ممبرز نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اکرام اللہ بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ کیونکہ سین پہلے ہی ٹیک میں مکمل ہوگیا تھا۔

"واؤ......!! تم سب نے مہارت سے ایک ہی ٹیک میں سین مکمل کرلیا"۔ اکرام اللہ نے خوشی سے کہا۔

"کیمرہ کلوز اپ ہونے کی خوشی میں پوری یونٹ کے لیے آج کا ڈنر میری طرف سے ہے"۔ اکرام اللہ نے خوشی سے کہا تو سب یونٹ والے خوش ہو گئے۔ رمشال شاہ، سینئر اداکار کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہوگئی۔

"سر.....!! میں ضرور رک جاتا، مگر مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔ اگر نیکسٹ ٹائم کوئی اسکرپٹ ہوا، تو میں دیکھ لوں گا۔ اور اگر کردار میری پسند کا ہوا تو پورے ڈیٹس بھی دے دوں گا"۔ زین نے اکرام اللہ سے اجازت چاہی، اس نے رسمی سے جملے کہہ دیئے، حالانکہ اس کا مزید کام کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"تھینک یو سو مچ......!! زین تم بہت اچھے ہو، حالانکہ تمہارا پچھلا پیمنٹ ابھی تک رکا ہوا ہے مگر بہت جلد تمہیں مل جائے گا۔ جب بھی کوئی اچھا سا اسکرپٹ ملا۔ میں تمہیں بھجوا دوں گا۔ میرے نیکسٹ پلے میں تم ہی ہیرو ہوں گے"۔ اکرام اللہ کو زین کا کام پسند تھا۔ وہ نخریلا نہیں تھا۔ پیمنٹ لیٹ ہونے پر بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔

"تھینک یو سر"......!! اس نے اکرام اللہ سے ہاتھ ملایا۔ اور وہاں سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

باہر اچھی خاصی شام ہوگئی تھی۔ رات کے سائے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ دوبارہ وہ جیسے پرانا زین بن بیٹھا، وہ سوچ رہا تھا۔ اور صرف سوہا کے بارے میں سوچنے لگ گیا تھا۔ اس کا دماغ جیسے ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا تھا۔

"سوہا......!! جب تک تم نہیں مل جاتی، تب تک میں کوئی نیا پراجیکٹ نہیں لوں گا"۔ زین نے سڑک کی طرف دیکھا۔ اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پاس بے شمار پراجیکٹس کی آفرز تھیں، مگر وہ اب کسی میں آگے کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ویسے بھی کوئی اسکرپٹ اسٹڈی کیا نہیں ہے، انکار کر کے جان چھوٹ جائے گی"۔ اس نے سر ہلایا۔ یہ سوچ اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔ اب وہ گاڑی میں اسی ویران میدان کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں اس نے جلتے گلاب کو دیکھا تھا۔ اور جس میں اسے سوہا کا عکس نظر آیا تھا۔

"کیا پتہ.....!! وہ جلتے گلاب کا پودا دوبارہ وہاں ہو"۔ اس نے جیسے دل کو تسلی دی۔ اور گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس لیے جلد سے جلد ہی میدان میں جانا چاہ رہا تھا۔

"سوہا...!! مجھے سمجھ نہیں آرہی ہے کہ میں تمہاری تلاش کہاں سے شروع کروں؟ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، کوئی ایک سرا تک نہیں ہے۔ جس سے میں شروع کر سکوں اور تم تک پہنچ جاؤں۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں"۔ اس نے اسکرین سے باہر سڑک پر دیکھا، اور گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی۔

"مجھے تم تک پہنچنے کے لیے ایک سرا مل چکا تھا مگر اسے میں نے کھو دیا۔ وہ جلتے گلاب غائب ہو چکے ہیں۔ پھر بھی میں اس امید پہ وہاں جا رہا ہوں۔ شاید مجھے تمہارا پتہ مل جائے"۔ وہ اب میدان کے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور اب مزید گہرا ہو رہا تھا۔ زین نے سڑک کنارے گاڑی روک دی۔ اور گاڑی سے نکل کر اسی اندھیرے میدان میں آگے جانا شروع کر دیا۔

اچانک اس کے پیر کانٹوں میں پھنس گئے۔ اس کے ٹخنوں میں کانٹے بری طرح سے چبھ گئے، اس نے جلدی سے موبائیل نکال کر ٹارچ روشن کی۔ اور اپنے زخموں کی پرواہ کیے بغیر وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ مگر وہ جگہ خالی تھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا اور وہی ویران اُجاڑ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ زین نے موبائیل کی ٹارچ کی روشنی ادھر اُدھر ڈالی۔ وہاں کچھ خاص تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ گڑھا اب وہ مل نہیں رہا تھا۔ جس میں زین نے جلتے گلاب کا پودا دیکھ رکھا تھا۔ وہ جگہ بالکل ہموار تھی۔

"کیا میرے جانے کے بعد کسی نے مجھے گمراہ کرنے کے لیے وہ گڑھا بھرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے تو اب یہاں کوئی نرم زمین ہے ہی نہیں۔۔۔۔!!" زین نے ٹارچ کی روشنی میں کئی بار زمین کا جائزہ لیا۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ اس کے جانے کے بعد کوئی آیا تھا۔ اس نے وہ گڑھا مکمل طور پر بھر ڈالا تھا۔

"کوئی ہے....!! جو مجھ پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ میرے ساتھ ہائیڈ اینڈ سیک کھیل رہا ہے۔ میں بھی دیکھوں...!! وہ کب تک چھپا رہ سکتا ہے۔ میں بھی اب اس کو بے نقاب کر کے رہوں گا"۔ اس نے ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا۔ اور وہاں سے واپسی کی راہ لی۔ اب اس کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔ وہ گھر جانا چاہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

زین نے کار گیراج میں کھڑی کی، اس نے کار سے قدم باہر اتارے۔ اور گھر کے اندرونی حصے کی طرف جانے لگا کہ اچانک اسے رکنا پڑا کیونکہ لان میں اس کی مام زرتاشہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی وہاں چلا گیا۔ زین کو اپنی طرف آتا دیکھ کر زرتاشہ نے اپنی گفتگو مختصر کر کے ختم کر دی۔

"السلام علیکم مام"......!! زین نے سلام کیا تو زرتاشہ نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"زین.....!! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے"۔

"مام.....!! کوئی خاص بات ہے"؟ وہ مام کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"ہاں.....!! دراصل مجھے اب تمہاری شادی کرنی ہے۔ اس دن تم نے کسی لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ اس کا نام سوہا بتایا تھا۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اب تمہاری شادی کی عمر ہے۔ میں یہ کام مزید لیٹ نہیں کر سکتی۔ میں اپنی یہ خواہش جلد سے جلد پوری کرنا چاہتی ہوں"۔

"مام.....!! آر یو سیریس".....!! اس نے مام کی طرف پیار سے دیکھا۔

"دیکھو.....!! اب میں کچھ نہیں جانتی؟ سوہا رہتی کہاں ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ مجھے تم اس کا پتہ بتا دو۔ میں کل ہی اس کے گھر جا کر تمہارے لیے مانگ لوں گی۔ جب تم نے اپنی پسند بتائی، تو میرے بے چین دل کو بھی قرار آ گیا۔ اب میں کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گی"۔ مام نے زین کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مام.....!! ابھی میں نے سوہا سے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ ان دنوں پڑھائی کے سلسلے میں ملک سے باہر گئی ہے۔ جیسے ہی وہ مجھے ملتی ہے۔ سب سے پہلے میں اسے آپ سے ملواؤں گا۔ اب میں بھی مزید دیر نہیں کرنا چاہتا"۔ زین مام کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے میں آ چکا تھا۔ مام نے اسے حیرت سے دیکھا۔ کیونکہ اس کو زین کی بات کا یقین ہی نہ آیا۔

"زین.....!! تمہاری تو اس سے موبائل پر رابطہ ہوتا ہوگا۔ تم مجھے وہ موبائل پر بھی دکھا سکتے ہو۔ آج کل موبائل نے فاصلے سمیٹ لیے ہیں"۔ زرتاشہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"مام.....!! میں ابھی اس کی اسٹڈی ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ اور ابھی آپ کو اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا"۔ اس نے مام کی طرف دیکھا۔

"زین.....!! تم جو بتا رہے ہو، مجھے لگ رہا ہے۔ تم جان چھڑا رہے ہو۔ میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا ہے"۔ مام نے اسے شک بھری نظروں سے دیکھا۔

"آپ ماں بن کے سوچ رہی ہیں۔ آپ کا دل اس لیے مطمئن نہیں ہو رہا ہے"۔ زین نے ماں کی بات کو ہلکے انداز میں رد کیا۔

"زین.....!! وہ صرف ماں کا دل ہوتا ہے، جو اولاد کی محبت میں مشکل سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر تم مجھے بنا رہے ہو تو بتا دو۔ میں اب مزید کسی صورت دیری برداشت نہیں کر سکتی"۔

"جی مام.....!! آپ یہ بات ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ڈنر ریڈی ہے؟ مجھے بہت بھوک لگی ہے"۔ زین کو بھوک لگی تھی۔ اس نے اپنے مطلب کے لیے ساری بات کا رخ پلٹ دیا۔

"ہاں بیٹا!! میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم میرے ساتھ آج سوہا کی خوب باتیں کرو"۔ ماں لاؤنج میں صوفے پر براجمان ہو گئی۔ زین بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"مثلاً.....!!" زین نے مام کو دیکھا، اور دونوں کندھے اچکا دیے۔

"یہی کہ سوہا پہلی بار تم سے کب ملی۔ کیا وہ بہت پیاری ہے؟ جو پہلے ہی ملاقات میں تمہارا دل لے اڑی ہے۔ اور تم دونوں پہلی بار کیسے ملے؟" مام کو باتوں میں اشتیاق تھا۔

"مام.....!! جب سوہا آپ کی بہو بن جائے گی تو یہ ساری باتیں آپ سوہا سے پوچھ لینا؟ وہ آپ کو ایک بات بہتر انداز میں بتا دے گی۔ آپ دونوں کی دوستی بھی ہو جائیگی"۔

"زین.....!! دس از ناٹ فیئر.....!! تم مجھے کچھ بھی نہیں بتا رہے ہو"۔ مام روٹھ گئی۔

"مام.....!! میں واقعی آج بہت تھک چکا ہوں۔ کچھ دیر ریسٹ کرنا چاہوں گا، جب ٹائیڈ آ جائیں تو میں ڈنر کرنے آ جاؤں گا"۔ وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں جانے لگا اور مام اپنے بیٹے کی پشت کو دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ دیر گم صم رہیں پھر "سوہا جلتے گلاب میں کیسے مقید ہو گئی؟"

اس سوال کا جواب جلتے گلاب میں آئندہ ماہ ملے گا انشاء اللہ۔۔۔!!

ایک شرط

ماریہ مسعود-مندرہ بانٹھ

چڑیل کے ختم ہوتے ہی جادوگر حیران ہوا اور لڑنے کے لئے تیار ہوگیا اور پھر جادوگر کے مرتے ہی اس کا پورا جسم آگ کی لپیٹ میں آگیا اور پھر اچانک.....

سبک رفتاری سے دل و دماغ کو فرحت بخشتی دلکش، دلگداز اور.....دلفریب کہانی

یہ دسمبر کی اداس شام تھی، شکرانہ روز کے معمول کی طرح اس اُجڑے ہوئے باغ میں ایک پتھر پر براجمان تھی۔ ارد گرد سوکھے درخت اور خزاں کے موسم میں بکھرے پتے باغ کو اور بھی پراسرار بنا رہے تھے، شکرانہ کو ایسا ہی ماحول اچھا لگتا تھا وہ جمان جادوگر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جس نے اس کی زندگی عذاب بنا دی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عبداللہ باغ میں سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر اس لڑکی پر پڑی جو رو رہی تھی۔ عبداللہ ایک مسلمان جن تھا وہ شکرانہ کے سامنے کھڑا ہوا پر شکرانہ اُس کی آہٹ محسوس نہیں کر پائی تھی کیوں کہ وہ اس کی نظروں سے غائب تھا۔ عبداللہ کچھ پل اس کے سامنے کھڑا اسے بغور دیکھتا رہا، وہ اسے پریشان لگی پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں یہ جاننے کے لئے کہ اس کے رونے کی وجہ کیا ہے۔ پھر اسے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ "میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" وہ رو رہی تھی کہ اس کو ایک آواز آئی۔

شکرانہ نے چونک کر دیکھا پر اسے کوئی نظر نہیں آیا وہ سمجھی کہ اس کا وہم ہے۔ آواز ایک بار پھر آئی۔ "میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" اب کی بار وہ ڈر گئی یہ اس کا وہم نہیں تھا ایک لمحے کو اس پر سکتہ طاری ہو گیا اس نے ڈرتے

ڈرتے سامنے کی سمت دیکھا پر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

"کو..... کون ہے۔" ڈرتے ڈرتے بولی۔ لیکن خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میرا نام عبداللہ ہے میں ایک جن ہوں۔" ان دیکھے وجود نے اپنا تعارف کروایا، پھر اس کو سامنے ایک لڑکا کھڑا نظر آیا جس نے سفید لباس زیب تن کیا ہوا تھا اس کی رنگت کچھ زیادہ ہی سفید تھی اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ ایک جن ہے۔

شکرانہ بہت ڈر گئی تھی اس کا بھاگنے کا ارادہ تھا کہ وہ بولا۔ "ڈرو مت میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" وہ شکرانہ کے دل کا حال جان گیا تھا اس لئے نرمی سے گویا ہوا۔ "میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

"پر تم میری مدد کیسے کرسکتے ہو تم تو ایک جن ہو۔" وہ اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ اب اس کا ڈر کچھ کم ہو گیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ اسے جمان جادوگر نے تو نہیں بھیجا۔

"میرا دوست ایک انسان ہے جس نے مجھے چلہ کر کے حاصل کیا تھا۔ وہ تمہاری مدد کرسکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"جب تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ جادوگر نے یہ شرط رکھی ہے کہ جو بھی لڑکا مجھ سے سچی محبت کرے گا اس کو جادوگر سے لڑنا ہو گا اگر وہ جادوگر کو ہرا دے تو وہ مجھے چھوڑ دے گا تم ایک جن ہو تم کسی کو بھی لے آؤ گے کوئی بھی تمہارے ڈر سے آجائے گا پر اس جادوگر کا مقابلہ نہیں کرسکتا پر تم کیا میری مدد نہیں کرسکتے۔" تفصیل سے بولتے ہوئے شکرانہ نے ایک امید سے اسے دیکھا۔

"میں جادوگر سے لڑ نہیں سکتا کیونکہ میری طاقت اس سے کم ہے۔" وہ افسوس سے بولا۔

"تمہارا دوست بھی میری مدد نہیں کرسکتا۔" مایوسی سے کہہ کر وہ ہاں سے چلی گئی۔ اور عبداللہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا وہ اپنی جگہ غلط نہیں تھی۔

اعیان ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا تب ہی عبداللہ آ گیا۔ اعیان پہلے تو عبداللہ کے بولنے کا منتظر رہا پھر الجھ کر خود ہی بولا۔ "کیا بات ہے عبداللہ تم خاموش کیوں ہو۔"

"آج میں ایک باغ سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو رو رہی تھی۔ میں نے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی۔"

"تو کیا معلوم ہوا تمہیں۔" اعیان بیچ میں ہی بول پڑا تو عبداللہ نے کہا۔ "اس کا نام شکرانہ ہے وہ بہت ہی خوبصورت ہے اس کے پیچھے ایک جادوگر پڑا ہوا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، شکرانہ کے انکار کے باعث جادوگر نے شرط رکھی ہے کہ تین مہینوں کے اندر اندر اگر کوئی شکرانہ سے سچی محبت کرتا ہے تو جادوگر سے مقابلہ کرے اگر اسے ہرا دیا تو وہ شکرانہ کا پیچھا چھوڑ دے گا، میں نے شکرانہ سے کہا کہ میں اس کی مدد کرسکتا ہوں۔"

"پر تم اس کی مدد کیسے کرو گے تم تو ایک جن ہو۔" اعیان اس کو دیکھ کر حیرانی سے گویا ہوا۔ "تمہیں وہ اچھی لگی ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"میں اس کی مدد نہیں کرسکتا میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔" عبداللہ کی بات سن کر اعیان چونکا پھر بولا۔ "میں اس سے محبت تھوڑا ہی کرتا ہوں۔"

"اور تم نے تو کہا ہے جو اس سے سچی محبت کرتا ہے وہی اس کو جادوگر سے بچا سکتا ہے میں نے اس کو دیکھا تک نہیں ہے اور نہ ہی محبت کرتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا پھر کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

"کیا ہوا آج پھر نہیں آئی ہو۔" اعیان عبداللہ سے مخاطب ہو کر بولا، شکرانہ پچھلے چار دنوں سے باغ میں نہیں آ رہی تھی۔ اعیان بھی دل ہی دل میں پریشان تھا۔ "کہیں جادوگر تو اس کو اٹھا کر نہیں لے گیا۔ تم اس کے گھر جا کر دیکھو۔" اس نے مشورہ دیا، عبداللہ کو اس سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اسی لئے روز اسی باغ میں جاتا تھا کہ اسے تسلی دے سکے پر وہ چار دن سے نہیں آ رہی تھی، پھر عبداللہ شکرانہ کے گھر آیا، عبداللہ نے اپنی طاقت سے شکرانہ کے گھر کا پتا معلوم کیا تھا وہ اسے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ عبداللہ اندر آ گیا پر وہ شکرانہ کی نظروں سے غائب تھا۔

پہلے چار دنوں سے شکرانہ کو بخار تھا اسی لئے وہ باغ میں نہیں گئی تھی شکرانہ اداس بیٹھی ہوئی ماضی کی تلخ یادوں میں گم تھی جو اب اس کے لئے عذاب بن گئی تھی۔

تین ماہ پہلے ایک شام روز کے معمول کی طرح وہ اس ویران باغ میں موجود تھی باغ اس کے گھر کے پاس ہی تھا وہ زیادہ تر سنسان ہی رہتا تھا اس دن اس نے سیاہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا جو اس کی سفید رنگت پر بہت کھل رہا تھا۔ سیاہ لمبے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اس دن اس نے تھوڑا سا میک اپ بھی کیا تھا وہ اپنے آپ میں مگن تھی جب جمان جادوگر کا وہاں سے گزر ہوا تو اس کی نظر شکرانہ پر پڑی تو اس کی نیت خراب ہو گئی۔

شکرانہ کی نظر جب ایک عجیب اجنبی پر پڑی تو وہ گھبرا کر جلدی میں اپنے گھر کی طرف بھاگی، پر جادوگر نے اس کا راستہ روک لیا اور اس سے کہا کہ۔ "وہ اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔ جسے سن کر شکرانہ نے جادوگر کی خوب بے عزتی کی اور گھر آ کر سب کچھ بھائی ماں کو بتا دیا۔"

اگلے دن وہ جادوگر ان کے گھر تک پہنچ گیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو شکرانہ کے والد نے بھی اس جادوگر کو خوب سنائی پر اس جادوگر نے کسی بات کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے دھمکی دی کہ وہ شکرانہ کو اٹھا کر لے جائے گا پھر اس نے وہی شرط رکھی تھی۔ شکرانہ ایک تقریب سے آئی تھی کہ اسے پتا چلا کہ وہ پھر آیا تھا۔

"کون جمان جادوگر" وہ چونک کر بولی۔ خوف اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ "کیا کہہ رہا تھا وہ۔" چند پل بعد گویا ہوئی۔ "تمہارا پوچھ رہا تھا اور کہا تمہاری مدد کرنے کوئی نہیں آئے گا۔"

جواب میں وہ خاموش رہی۔ "شکرانہ تم یہاں سے اپنی والدہ کے گھر چلی جاؤ جہاں جمان جادوگر تم تک نہ پہنچ سکے۔" والدہ کی بات سن کر وہ گویا ہوئی۔ "میں کہیں بھی بھاگ کر چلی جاؤں وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اور وہ کتنی بھی کوشش کرلے میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

عبداللہ خاموشی سے شکرانہ کی باتیں سنتا رہا پھر واپس آ گیا۔ "میں شکرانہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" اعیان کے کہنے پر اس نے حیران ہو کر دیکھا اور بولا۔ "تمہیں تو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے پھر کیوں ملنا چاہتے ہو۔" اس نے نیچی نظروں سے اعیان کو دیکھا۔ "میں تو بس ویسے ہی ملنا چاہتا ہوں۔" اعیان مخصوص انداز میں گویا ہوا۔

"ہوں ٹھیک ہے ہم کل ملنے چلیں گے۔" عبداللہ نے کہا۔

☆.....☆.....☆

شکرانہ روز کے معمول کی طرح اس پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اعیان عبداللہ کے ساتھ آیا تو جیسے ہی اس کی نظر شکرانہ پر پڑی تو اعیان اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شکرانہ نے آج سرخ لباس زیب تن کیا تھا۔ وہ سرخ گلاب کی طرح لگ رہی تھی۔ اعیان نے جتنا عبداللہ سے سنا تھا شکرانہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ عبداللہ سے اس کے بارے میں جان کر اس کے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔

وہ ابھی اس کے پاس جانے ہی والا تھا کہ اس کو سامنے سے ایک بوڑھا شخص آتا دکھائی دیا وہ دونوں ایک درخت کے پیچھے چھپ گئے لیکن وہ جادوگر ہی تھا اس نے سوچا۔

شکرانہ نے جب سامنے دیکھا تو جادوگر کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی، جادوگر نے نزدیک آتے ہی اس کا ہاتھ پکڑا تو شکرانہ بولی۔ "چھوڑو میرا ہاتھ۔" وہ تڑک کر بولی۔ "اسے لگا جیسے اس کا ہاتھ انگاروں کی لپیٹ میں آ گیا ہو۔

اعیان سے یہ سب برداشت نہ ہوا تو وہ جادوگر کے سامنے جانے لگا۔ پر عبداللہ نے اس کو روک لیا۔ "ابھی اس کے سامنے مت جاؤ اس کو ہماری موجودگی کے بارے میں پتا چل جائے گا۔" عبداللہ نے آہستگی سے کہا۔ مجبوراً اعیان رک گیا۔

"دو مہینے گزر چکے ہیں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آیا جو میں کہہ رہا ہوں مان جاؤ میں تمہیں رانی بنا کر رکھوں گا۔" جادوگر شکرانہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"ابھی ایک مہینہ باقی ہے اور میرا اللہ میری مدد کرے گا تم کچھ بھی کرلو میں تم سے شادی کبھی نہیں کروں گی۔"

"تم کچھ بھی کرلو مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتی۔" اور یہ

کہتے ہوئے جادوگر وہاں سے چلا گیا۔

شکرانہ نے اجنبی آواز سن کر دوسری طرف دیکھا تو عبداللہ جن کھڑا تھا۔ ”میں چار دنوں سے آتا رہا پر تم نہیں آرہی تھی تو مجھے لگا کہیں جادوگر تو نہیں اٹھا کر لے گیا۔ پھر تمہارے گھر آیا تھا۔“ اس نے وضاحت کے انداز میں کہا۔

”کل تم کب آئے تھے۔“ وہ یہ سن کر حیران ہوئی پھر یاد آیا کہ وہ ایک جن ہے کہیں بھی آجا سکتا ہے جب تک وہ اپنا آپ ظاہر نہ کرتے تو وہ دیکھ نہیں سکتی۔ ”میرا دوست تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اعیان کو آواز دی تو شکرانہ نے مڑ کر اعیان کو دیکھا جو اسی طرف آرہا تھا، وہ پاس آکر بولا۔ ”شکرانہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔“

”مجھے کسی کی مدد کی نہیں بلکہ سچی محبت کی ضرورت ہے۔“ یقیناً تم نے ابھی جادوگر کو دیکھا ہوگا اسے دیکھ کر تمہیں یہی لگا ہوگا کہ تم اسے ہرا دو گے تو یہ تمہاری صرف سوچ ہے۔ وہ بہت طاقتور ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ آج کل لوگ کسی سے سچی محبت بہت ہی کم کرتے ہیں، میں اپنی وجہ سے کسی کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔“ شکرانہ اپنی امی کی آواز سن کر کھڑی ہوئی اور ایک نظر اعیان کو دیکھ کر بولی مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی جبکہ اعیان اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

اعیان کو شکرانہ سے ملے ہوئے تین چار دن گزر چکے تھے اس کی سوچوں میں صرف اور صرف شکرانہ ہی تھی۔ اسے بار بار وہ منظر یاد آجاتا جب جادوگر نے شکرانہ کی کلائی پکڑی تھی اس لمحے اسے جادوگر پر شدید غصہ تھا، دل چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر کہیں دور پھینک آئے، اعیان کو لگ رہا تھا کہ وہ شکرانہ سے محبت کرنے لگا ہے، ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ عبداللہ وہاں آگیا۔ ”کیا بات ہے، اعیان میں دو تین دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم خاموش خاموش سے رہنے لگے ہو۔“ عبداللہ نے اعیان کو سوچوں میں گم دیکھ کر بولا۔

”مجھے شکرانہ سے محبت ہوگئی ہے۔“ وہ بے اختیار بولا۔ اعیان کے لفظوں نے عبداللہ کو چونکا دیا۔ ”میں اس کے لئے جادوگر سے لڑوں گا۔“ وہ گویا ہوا۔

”پر کیا وہ تمہاری بات کا یقین کرے گی۔“ عبداللہ نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تو تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کیا اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کہہ رہے ہو۔“ اس کے انداز میں ایک طنز تھا تو اعیان بولا۔ ”تم جانتے ہو نا کہ میں تم سے کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔“ اس نے عبداللہ کو دیکھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو کیوں کہ میں دلوں کا حال بھی جانتا ہوں پر کیا شکرانہ یقین کرے گی تمہاری محبت کا۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ تم بھی اس جادوگر کی طرح اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو۔“

”وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو اپنے حسن کی قیمت مانگے اسے یقین کرنا ہوگا۔“ اعیان بولا۔ ”محبت سچی ہو تو ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔“ وہ یقین سے بولا۔

”تو ٹھیک ہے تم کل اس سے بات کرنا ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو میں کل ہی اس سے بات کروں گا۔“ اعیان فیصلہ کن انداز میں بولا۔

☆.....☆.....☆

شکرانہ اپنے کمرے میں آئی تو عبداللہ کو دیکھ کر ڈر گئی جو صوفے پر براجمان تھا۔ ”تم کیوں آئے۔“ وہ اپنے خوف پر قابو پا کر گویا ہوئی۔

”میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اعیان کو تم سے سچی محبت ہوگئی ہے وہ تمہاری مدد کرنا چاہتا ہے۔“ عبداللہ کی بات سن کر وہ حیران نہ ہوئی کیوں کہ وہ یہ بات کئی بار سن چکی تھی، وہ گویا ہوئی۔ ”میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے سب میری خوبصورتی پر مرتے ہیں۔“ اس کا انداز طنزیہ تھا۔

”وہ تم سے سچی محبت کرنے لگا ہے وہ جھوٹ نہیں بولتا کیوں کہ کسی کے دل میں کیا ہے میں جان لیتا ہوں۔“ وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا اور تم بھی اعیان سے محبت کرنے لگی ہو اگر مجھے اپنا دوست مانتی ہو تو بتاؤ کہ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں۔

شکرانہ اپنا نام سن کر چونکی۔

”کل اعیان تم سے یہ سب کہنے والا ہے اس کو معلوم نہیں ہے کہ میں یہاں ہوں میں اس لئے یہ سب کہہ رہا ہوں کہ تمہیں اعیان کی بات پر یقین نہیں ہے۔“

شکرانہ اس انکشاف پر حیران ہوئی۔ ”عبداللہ اگر تم مجھے پہلے یہ سب نہ بتاتے تو میں شاید اعیان کی بات کا یقین نہیں کرتی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ شکرانہ اپنی امی شہلا بیگم کی آواز سن کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا قدموں کی آہٹ اسی طرف آرہی تھی۔ ”عبداللہ تم جلدی سے جاؤ امی آرہی ہیں۔“ اس کے کہتے ہی عبداللہ وہاں سے غائب ہوگیا۔

”شکرانہ تم کسی سے بات کر رہی تھی۔“ اس کی امی کمرے میں آکر بولیں۔ ”نہیں امی جان میں تو کسی سے باتیں نہیں کر رہی تھی۔“ ”وہ انجان بنی۔“ یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں۔“

”مجھے تمہارے کمرے سے آواز آرہی تھی، کسی سے بات کرنے کی۔“ شہلا بیگم نے پورے کمرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں امی جان یہ سب آپ کا وہم ہے۔“ اس نے یقین دلایا تو شہلا بیگم باہر چلی گئیں۔ شکرانہ نے سکون کا سانس لیا پھر اعیان کے بارے میں سوچ کر خوش ہونے لگی اس کی جان جادوگر سے چھوٹ جائے گی، جب اس نے اعیان کو پہلی بار دیکھا تھا تو وہ اسے اچھا لگا تھا، اس نے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے وہ اپنے اور اعیان کے لئے محبت کی دعا کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن اعیان شکرانہ کے آنے سے پہلے ہی کمرے میں آگیا تھا۔ اعیان ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا، اس لئے اسے آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ وہ شکرانہ کا انتظار کر رہا تھا اور جب شکرانہ آئی تو اعیان کو دیکھ کر حیران نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس کی آمد کے بارے میں جانتی تھی وہ کس لیے آیا ہے پردہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی عبداللہ نے اسے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا، وہ اعیان کے نزدیک آئی اور بولی۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو۔“ اس نے اپنے لہجے کو تھوڑا سخت بنانے کی کوشش کی تو اعیان بولا۔ ”شکرانہ میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے پلیز میرا یقین کرو میں سچ کہہ رہا ہوں میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ تم سے ہمدری ہے۔“ اس نے وضاحت کی اس لمحے وہ کافی سنجیدہ تھا۔

”مجھے معلوم ہے تم سچ کہہ رہے ہو۔“ شکرانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے ”عبداللہ نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

”کیا عبداللہ نے۔“ اعیان اسی انکشاف پر چونکا پھر دل میں عبداللہ کو آواز دی تو عبداللہ وہاں آگیا۔ ”تم نے شکرانہ کو پہلے کیوں بتا دیا۔“

”اگر میں شکرانہ سے پہلے بات نہ کرتا تو وہ تمہاری بات کا یقین بھی نہ کرتی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”شکریہ عبداللہ۔“ اعیان نے عبداللہ کا شکریہ ادا کیا اور شکرانہ کی طرف مڑا اور اس کے ہاتھ تھام کر بولا۔ ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ جادوگر تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں پائے گا۔“ تھوڑی دیر وہ دونوں باتیں کرتے رہے پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

شکرانہ اپنے کمرے کی کھڑکی بند کرنے لگی تھی جہاں سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی کہ وہاں ایک بڑی سی چمگادڑ آگئی وہ ڈر کر پیچھے ہٹی، چمگادڑ انسانی آواز میں بولی۔ ”جادوگر کل تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ اس کی آواز بہت ڈراؤنی تھی۔

”کہہ دینا جادوگر سے کہ مجھے وہ مل گیا ہے جو اس کی شرط پوری کرے گا۔“ وہ بولی۔ شکرانہ کا جواب سن کر وہ چمگادڑ وہاں سے چلی گئی۔

”کیا ہوا شکرانہ تم کس سے بات کر رہی تھی۔“ شہلا بیگم کمرے میں آکر متکفرانہ لہجے میں بولیں تو اس نے سب کچھ سچ سچ انہیں بتا دیا۔ ”شکرانہ کہیں وہ جادوگر تمہیں یا اعیان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“ وہ فکر مند ہوئیں۔

”امی جان آپ پریشان نہ ہوں اعیان جادوگر کی شرط پوری کرے گا جو اس نے خود رکھی تھی۔“ وہ اپنی امی کے ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے بولی۔

☆.....☆.....☆

اعیان کو آج کی صبح بہت خوبصورت لگ رہی تھی وہ کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا کہ عبداللہ پریشان سا اس کے پاس آ گیا۔ ''کیا ہوا عبداللہ تم کیوں پریشان ہو۔'' اعیان نے اسے دیکھ کر استفسار کیا۔ ''اعیان جادوگر شکرانہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔''

کیا اعیان چونک کر بولا۔ ''کب ہوا یہ سب۔''

''رات کو۔'' عبداللہ نے بتایا۔ ''اسے جیسے ہی تمہارے بارے میں پتا چلا تو اس کے بعد ہی یہ سب ہوا ہے۔''

''مجھے شکرانہ کے پاس جانا ہوگا عبداللہ تم مجھے جلدی سے وہاں لے چلو جہاں اس جادوگر کا ٹھکانہ ہے۔'' وہ ایک دم بے چین ہوا، اسے شکرانہ کی فکر تھی کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔''

''چلو تم اپنی آنکھیں بند کرلو میں تمہیں لئے چلتا ہوں۔'' عبداللہ کے کہنے پر اعیان نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور تھوڑی دیر میں اعیان نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ دونوں ایک غار کے سامنے کھڑے تھے۔

جادوگر کا قیام ایک بڑے پہاڑ کے غار میں تھا، یہ پہاڑ گاؤں سے تھوڑا دور تھا اس طرف کم ہی لوگ آتے تھے۔

''اعیان تمہیں اکیلے ہی اندر جانا ہوگا۔ میں یہاں تمہارا انتظار کروں گا۔'' عبداللہ نے اس کو ایک تلوار دیتے ہوئے کہا تاکہ مشکل وقت میں وہ اسے استعمال کر سکے، اعیان اندر گیا تو ہر طرف خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو وہ تھوڑا آگے بڑھا تو اسے ایک طرف روشنی دکھائی دی وہ پھر آگے بڑھا تو اس کو ایک طرف آگ جلتی ہوئی دکھائی دی کہ تب ہی اس کی نظر شکرانہ پر پڑی وہ ایک بڑے سے پنجرے میں بند تھی اعیان کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہوگئی اور روتے ہوئے بولی۔

''اعیان مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

اچانک جادوگر وہاں آ گیا۔ اعیان کا دوسری بار اس سے سامنا ہوا تھا اس لئے اسے پہچان گیا تھا، اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''بڑی جلدی آ گئے، شکرانہ تمہارے سامنے ہے، جاؤ لے جاؤ۔'' وہ بولا۔

اعیان شکرانہ کی طرف بڑھا اور پنجرے کو چھوتے ہی اڑتا ہوا دور جا گرا۔ جیسے اس کو کرنٹ لگا تھا، جادوگر کی شیطانی ہنسی اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ سنبھل کر کھڑا ہوا تو جادوگر کہنے لگا۔ ''شکرانہ کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے اس سے لڑو۔'' جادوگر نے سامنے کھڑی خوفناک چڑیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اعیان لڑنے کے لئے تیار ہوگیا جبکہ شکرانہ چڑیل کو دیکھ کر ڈر گئی تھی، تھوڑی دیر تک وہ چڑیل سے لڑتا رہا پھر اس نے تلوار کے وار سے چڑیل کو ختم کردیا اور جادوگر کی طرف بڑھا۔ جادوگر کو لگ رہا تھا کہ چڑیل اسے ختم کردے گی۔

چڑیل کے ختم ہوتے ہی جادوگر حیران ہوا پھر لڑنے کے لئے تیار ہوگیا اور آخر کار بڑی جدوجہد کے بعد اعیان نے جادوگر کو ختم کردیا جادوگر کے مرتے ہی آگ کی لپیٹ میں اس کا پورا جسم آ گیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے غائب ہوگیا۔ اعیان شکرانہ کی طرف بڑھا اور اسے پنجرے سے باہر نکالا۔

شکرانہ اعیان کے گلے لگ کر رونے لگی تو اعیان جلدی سے بولا۔ ''شکرانہ جلدی چلو یہ غار تباہ ہونے والا ہے۔'' وہ دونوں جلدی سے باہر آ گئے تو عبداللہ وہاں دونوں کا انتظار کر رہا تھا پھر دونوں کو دیکھ کر بولا۔ ''مجھے یقین تھا کہ اعیان تم جادوگر کو ختم کر کے ہی آؤ گے۔''

''عبداللہ جلدی سے ہم دونوں کو شکرانہ کے گھر چلو وہاں سب پریشان ہوں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اعیان نے شکرانہ کا ہاتھ تھام لیا تو شکرانہ کے ساتھ عبداللہ بھی مسکرادیا۔ پھر عبداللہ بولا۔ ''تم دونوں اپنی آنکھیں بند کرلو اور جب میں کہوں تو آنکھیں کھولنا۔'' اس کے بعد عبداللہ نے دونوں کا ہاتھ تھاما اور چند منٹ بعد ہی عبداللہ بولا۔ ''اب اپنی آنکھیں کھول لو۔'' تو دونوں نے دیکھا کہ وہ شکرانہ کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔

شکرانہ اور اعیان کو دیکھ کر گھر والے بہت ہی خوش ہوئے، سب نے اعیان کا شکریہ ادا کیا اور پھر چند دن بعد اعیان اور شکرانہ کی شادی ہوگئی۔ عبداللہ آج بھی ان دونوں سے ملتا رہتا ہے۔

جدید روح

اسحار بن ناصر۔ کراچی

روح کی آواز سنائی دی میں تین ہزار سال قبل مسیح دور میں گیا تھا مگر وہاں حادثے کا شکار ہو کر منوں برف تلے دب گیا اور میری روح بھٹکتی رہی لیکن پھر میری روح......

ایک روح کا حیران کرتا شاخسانہ...... جس نے لوگوں کو چنے...... چبوا دیئے...... تھے

پیر کا دن تھا۔ یونیورسٹی آف ماسکو (University Of Mascow) میں دو دن کی چھٹیوں کے بعد آج طلبہ کا جم غفیر کمیونٹی ہال میں جمع تھا، یہاں پر ماہانہ امتحان کا پتا چلنا تھا! ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا رزلٹ اچھا آئے گا؟'' پیٹر نے پریشانی سے بیٹھے بارلی سے پوچھا۔

''بس God بھلا کرے اس دفعہ تو صحیح طرح کی محنت کی تھی آگے اٹز آور لک!''

اچانک اسپیکر پر اعلان ہوا۔ ''مسٹر ڈاکٹر گوریا چوف آپ برائے مہربانی فوراً اناٹوی (Anatomy) ڈپارٹمنٹ میں تشریف لے آئیں، ایک اہم کام درپیش ہے!......''

☆......☆......☆

سائبیریا (Siberia) کے برفانی پہاڑی

علاقے کی ٹھنڈ اور برفباری، اوہ خدایا ایسا منظر تھا کہ حد نگاہ تک کوئی سبزہ دکھائی نہ دیتا تھا کہ اچانک سے کسی ہیلی کاپٹر کی آواز سن کر پیوٹن کی جان میں منوں جان پڑ گئی ورنہ وہ تو اپنے اپنے 'آفت کا پرکالہ' بہنوئی سے مایوس ہوگیا تھا۔ اس نے ایک نظر چٹان پر کھڑے میخائل کو دیکھا اور پھر اپنی ٹھنڈ میں دم توڑتی کافی کو ''ایک تو اس منحوس جگہ سورج ہی نہیں نکلتا'' اس نے تاسف سے سوچا!

ادھر ہیلی کاپٹر سر پر پہنچ گیا اور میخائل نے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ پیوٹن فوراً کافی پھینکتے ہوئے اٹھا اور میخائل سے کہنے لگا۔ ''کہیں یہ ہمارے سروں پر نہ اتر جائے۔'' میخائل نے لایعنی انداز میں اس کو دیکھا اور بولا۔ ''کچھ کہہ رہے ہو؟''

''نہیں بلکہ ہاں، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں یہ پولیس ہمیں گرفتار نہ کرلے قتل کے جرم ہیں!''

پیوٹن نے بات گھمائی۔ ''بیوقوف! مذاق نہ کرو ہمارا کوئی قصور نہیں!......'' اسی اثناء میں ہیلی کاپٹر سے دو رضا کار پولیس ہاتھوں میں اسٹریچر تھامے باہر نکلے، ان کے پیچھے ہی ایک لیڈی آفیسر شاہانہ انداز سے چلتی ہوئی آئی اور قریب پہنچ کر دونوں کو سوالیہ انداز میں گھورا۔

''جی...... وہاں اس گڑھے میں......'' میخائل نے اشارہ سے ایک برفیلے کھڈ کی طرف اشارہ کیا تو وہ اس طرف بڑھے۔ ''میرا نام آفیسر جیکولن ہے۔'' اس لیڈی نے وہاں پہنچ کر بتایا۔ ''ویسے یہ لاش کس نے دریافت کی؟''

''جی اِس نے'' پیوٹن نے میخائل کو نشانہ بنا کر خود بچنا چاہا۔ ''دراصل ہم صبح کو ہائیکنگ (Hiking) کے لئے نکلتے ہیں۔ آج چھٹی کی بدولت دور نکل آئے اور پھر اچانک برف میں اس لاش سے پاؤں ٹکرایا۔'' میخائل نے صفائی پیش کی۔

رضا کاروں نے 15 فٹ گہرے گڑھے سے لاش نکال لی تھی۔ آفیسر نے لاش کو دیکھ کر عجیب منہ بنایا اور کہنے لگی۔ ''یہ تو کوئی چمڑا نما چیز لگتی ہے، یہ قتل کیسے ہوئی؟''

''Actually مجھے لگتا ہے کہ یہ پانچ چھ سال پرانی لاش ہے اور کسی تودے کی زد میں آ کر ہلاک ہوئی ہوگی۔'' میخائل نے لاش کو آنکھوں میں تولا۔

''مگر یہ اندازہ کیسے اور By The Way اس بوڑھی لاش کے لئے تو کوئی بوڑھا پروفیسر ہی ہونا چاہئے تھا۔

''نون سینس!'' جیکولین منہ بگاڑ کر بولی۔

''اصل میں میخائل لیکچرار ہے اناٹومی (Anatomy) کا تبھی یہ اندازہ لگایا۔'' پیوتن اب کھسکنا چاہتا تھا۔

''Ok ٹھیک ہے، تمہارا شکریہ، لے جاتے ہیں اس لاش کو ماسکو یونیورسٹی یا انہی کا دردِ سر ہے، چلو جوان راک'' اور یہ کہتے ہوئے وہ دونوں کو لے کر واپس ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئی۔

''بھائی اب تو چل ناشتہ بھی کرنا ہے!'' پیوٹن میخائل سے بولا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر چوف...... 33 سال کا درازقامت ...... تھا، وہ روزانہ اپنا چہرہ مہنگے فیس واش سے دھوتا تھا ... کو اپنے چہرے سے بہت ہی لگاؤ تھا۔ وہ لباس میں اعلیٰ ذوق کا تھا اور ماہانہ کثیر حصہ آمدنی اس پر خرچ ... تھا۔ اب وہ اناٹومی سربراہ پروفیسر کے سامنے بیٹھا تھا بقول اس کے پروفیسر سنان God کی طرف سے عبرت کا نشان تھا۔

''ڈاکٹر چوف آ گئے آپ ٹائم دیکھا ہے ... منٹ اوپر ہو گئے ہیں!'' سنان نے روایتی بیزاری سے کہا۔

''یس سر سارے اسائنمٹ نمٹا کر آیا ہوں ویسے مجھے بھی آپ سے ایک اہم بات ڈسکس کرنی تھی۔'' چوف نے سنان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''Ok کہو کسی ناکام عاشق کی خودکشی کی بات نہ کرنا۔'' سنان اپنی پرانی عادت کے مطابق بولا۔ ڈاکٹر نے سوچا کاش اس کی یہ بے تکی فلسفی باتوں ...

... کیٹ پاگل پن قرار دے کر اس کی جگہ مجھے سربراہ ... ے!'' ''پروفیسر آپ کو شاید یاد ہوگا، 7 سال 2 ماہ ... سائبیریا کے علاقہ سے ایک لاش ملی تھی جسے ہم نے ... کا نام دیا تھا اور......''

''پر چوف اب یہ لاش ہماری یونیورسٹی کا ایک ... راز ہے جو صرف تین لوگوں کو یعنی تم، میں اور مرحوم ... کو معلوم ہے، تمہیں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے!'' ... کو جیسے یاد آیا کہ وہ اناٹومی شعبہ کا انچارج ہے۔

''ہاں پروفیسر مجھے اچھی طرح پتا ہے پر اب ایک ... مجھ سے ایک ماہ سے رابطہ کر کے کہہ رہا ہے کہ اس کو ... یعنی L-1 سے ملنا ہے۔'' ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا!

... مجھے لگتا ہے کہ تم پر کام کا اسٹریس ہے! ویسے یہ ... کون ہے؟'' پروفیسر نے پرسوچ انداز میں کہا!

''اس کا نام میخائل لوفوسوف ہے اور وہ بنیادی ... اناٹومی ... لوجی کا لیکچرار ہے، لاش اس نے ہی ... کی تھی!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''تو کیا وہ لاش واپس مانگ رہا ہے۔'' سنان ... اور اسی کے ساتھ اس کو کھٹکا لگا، سنان کسی قریب ... کی طرح پانی کو دیکھنے لگا، ڈاکٹر گوربا کا دل چاہا ... وہ اس پانی میں سلفیورک ایسڈ ملا دے کہ ''خس کم ... پاک!'' بہرحال پانی پی کر پروفیسر نے سوال ... ''میخائل کا کہنا ہے کہ وہ لاش پانچ چھ ماہ سے ... بذریعہ خواب اپنے پاس آنے کا کہہ رہی ہے، ... یہ کہ وہ اپنے گھر میں بہت سی انہونے واقعات ... بہت پریشان ہو گیا ہے بس اب تک یہ تفصیل اس ... نے بتائی ہے۔''

اب وہ لوگ باہر بالکونی میں آ گئے۔ سنان نے ... وہیل چیئر چلاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر یہ تو کوئی وہمی ... ہے مگر اس کو L-1 کا راز بھی پتا ہے کہ وہ ہمارے ... ہے تو۔''

''تو پھر انکار کر دو اسے۔'' چوف نے استفسار ... ''نہیں بلالو اسے......''

☆......☆......☆

میخائل بہت ہی زیادہ پریشان بلکہ ڈرا ہوا تھا، پچھلے 6,5 ماہ سے بہت سے عجیب و غریب واقعات ہو رہے تھے، مثلاً شروع میں اس کی گھریلو اشیاء کا اپنی جگہوں پر نہ ملنا، گھر کا دروازہ خود بخود کھل جانا، شاور سے پانی کی جگہ برف گرنا، لائٹ کا جلنا بجھنا وغیرہ وغیرہ، پہلے پہل تو اس نے توجہ نہ دی مگر جب پیوٹن یہ کہہ کر ''اب میں اس آسیب زدہ گھر میں نہیں رہ سکتا۔'' اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا، تب سے اس پر اندوہ ناکی اور وحشت طاری ہو گئی، مزید یہ ہوا کہ ایک ڈیڑھ ماہ سے وہ سائبیرین لاش اس کے خوابوں میں آ کر اس سے ملنے کے لئے کہتی۔ پھر مجبوری میں اس نے چوف کو فون کیا!

پروفیسر سنان، ڈاکٹر چوف اور میخائل اب ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کے نئے سوٹ اور پرفیوم سے سنان کو 'احساس کمتری کا دورہ' پڑا ہوا تھا۔ ''تو بقول تمہارے L-1 تم سے رابطہ کرتا ہے۔'' پروفیسر نے چپس کھاتے ہوئے میخائل سے پوچھا تو جواب میں اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ''L-1 اس لاش کو نام دیا گیا تھا اور وہ مرد ہے۔'' ڈاکٹر نے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے، یہ سچ ہے کہ مہینوں پرانی لاش نے مجھ سے......'' ''مسٹر مہینوں نہیں تقریباً 5 ہزار سالہ پرانی لاش نے۔'' سنان نے مداخلت کی۔

''اوہ۔'' میخائل خوف و حیرت سے اچھلا۔ ''اتنی قدیم حالانکہ اس کی کھال نما بدن سے لگا نہیں، بہرحال اس نے مجھے خوابوں کے ذریعے بڑا تنگ کیا ہوا ہے۔'' کہتا ہے تم میرے نجات دہندہ، ماں جیسے ہو مجھے نکالوں یہاں سے......'' چوف کو مایوسانہ حیرت ہوئی۔ اب پتا چلا وہ ماں بن کر لاش بچانے آیا تھا ہے! حیرانی مزید ہوئی جب پروفیسر نے اس احمق سے کہا۔ ''اچھا چلو L-1 سے تمہیں ملواتا ہوں۔''

اب وہ سب باہر نکلے اور راہداری سے گزرتے ہوئے ایک خفیہ کمرے میں پہنچے۔ ''عجیب بات ہے ایک

بوسیدہ لاش تمہیں کیوں بلا رہی ہے؟'' پروفیسر نے سوچتے ہوئے پوچھا جس پر میخائل کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر ڈاکٹر چوف کمرے پر لگے کوڈ ملانے لگا تو سنان نے کہا۔

''میری مرحومہ ساس بھی ایسی خوشبو لگایا کرتی تھی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے مرحومہ کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔'' چوف بولا۔

''اونہہ سال میں 300 دن ہمارے گھر اور 65 دن اسپتال میں رہتی تھیں۔'' پروفیسر کی بات سن کر ڈاکٹر نے تپے ہوئے لہجے میں دونوں سے کہا۔ ''آپ لوگ اندر چلے جائیں، میں باہر ٹھیک ہوں۔'' یہ سن کر وہ لوگ کمرے میں آ گئے۔

اس سفید کمرے کے بیچ میں ایک شیشے کے تابوت میں L-1 یوں لیٹا تھا جیسے قبر میں مردہ۔ اس کی آنکھوں کے گڑھے اس بات کا احساس دلاتے تھے کہ وہ ہزاروں سال سے کسی کا منتظر ہے! میخائل کے لئے اب وہ ایک اہم وجود تھا۔ اس نے بمشکل اس کا تابوت کھول کر اس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''کچھ تو بولو، میں آ گیا ہوں...... بولو۔'' کہ اچانک کسی گہرے کنویں سے آتی آواز سے مماثل آواز آئی۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے ضرور، آؤ گے......''

میخائل نے دیکھا لاش تو بدستور خاموش تھی تو یہ آواز...... اچانک اسے خیال آیا۔ اس نے پیچھے بیٹھے پروفیسر سنان کو دیکھا، اس کے لب ہلے۔ ''میخائل مجھے تمہارا ہی انتظار تھا 5 ہزار سال پہلے......''

میخائل خوف میں مبتلا کہنے لگا۔ ''یہ تم ہو، مگر پروفیسر کہاں ہیں...... اور میرا انتظار کیوں......؟''

''ڈرو مت میں سنان کے جسم سے بول رہا ہوں۔ تم ہی میرے دریافت کنندہ میری مدد کرو۔''

''مد۔ مگر تم ہو کون اور یہ نجات کا کیا ماجرا ہے؟'' میخائل نے اپنے خوف کو دباتے ہوئے کہا۔

''انسان...... انسان ہوں تمہاری طرح کا...... میں سنہ 2222 سے ٹائم مشین کے ذریعے قدیم وقت دیکھنے 3000 قبل مسیح گیا تھا مگر وہاں حادثے کا شکار ہو کر منوں برف تلے دب گیا، میری روح بھٹکتی رہی اور جسم کو تم نے عرصہ دراز بعد نکالا۔'' روح نے پروفیسر سنان کو اپنی پراسرار کتھا سنائی۔

''تو اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو......'' میخائل بہت پریشان و خوفزدہ ہو گیا۔ ''واپسی......''

''کیا مطلب واپسی کا۔''

''ہاں میری واپسی میری دنیا یعنی 2222 میں تمہارے ذریعے۔''

''کیا تم پاگل تو نہیں یہ 2020ء ہے ابھی کوئی شے تمہیں 2222 نہیں بھیج سکتی۔'' میخائل کا دماغ گھوم گیا کہ یکا یک لنگڑا سنان اپنی وہیل چیئر سے اٹھا اور میخائل کا گریبان پکڑ کر چیخا۔ ''تو کیوں نکالا تھا مجھے، اب تم ہی مجھے منزل تک پہنچاؤ گے۔'' وہ وحشی انداز میں چیختا تھا۔

''مجھے افسوس ہے میں کچھ نہیں کر سکتا، ابھی آگے جانا ناممکن ہے۔'' میخائل نے کہا۔

''آگے جانا...... آگے جانا۔'' سنان نے ان کے الفاظ دہرائے اور پھر ایک فاتحانہ ...... سارے PHD پروفیسر، ماسکو کے بڑے ...... کھڑے تھے، یہ وہ تھے جنہوں نے مضامین ...... تھے! وہ سب ہی افسردہ تھے اور اپنا وقت ...... کر رہے تھے! مگر ڈاکٹر چوف بہت خوش تھا۔ ایک ...... فلسفی اور منصب پر ...... پروفیسر سے اس کی ...... چھوٹ گئی تھی۔ اب وہ ڈپارٹمنٹ کا انچارج سربراہ ......

دوسری طرف 'وہ' قبرستان سے نکل کر مطمئن تھا، میخائل کا جسم اس کے لئے آرام دہ تھا، اس طرح وہ اپنی روح کو جسم بہ جسم گزارتے 2222ء تک پہنچ سکتا تھا، وہ اپنے سامنے ...... چارلی کو دیکھنے لگا، اس نے سوچا۔ ''اب یہ لڑکا ...... رہے گا، کم از کم 70 سال تو جیے گا۔'' پھر ایک ...... کر میخائل سے چارلی کی طرف جانے لگا!......

لٹیرا

مونا شہزاد۔ کیلگری کینیڈا

نوجوان چیخنے لگا میں کسی دماغی مرض کا شکار ہوگیا ہوں، میں کسی صورت روحوں پر یقین نہیں رکھتا اور یہ سنتے ہی سامنے موجود روح پھنکاری اور آنکھوں سے چنگاری نکلنے لگی کہ......

جرم سات پردوں میں کیوں نہ کیا جائے، ہر حال میں اپنا اثر رکھتا ہے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

سکندر نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کئے اور گاڑی چلاتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی وہ چند ہی منٹوں میں اپنے آبائی فارم ہاؤس پہنچنے والا تھا۔ اس وقت وہ بہت دل شکستہ تھا۔ اس کے سپنوں کا محل دھڑام سے زمین بوس ہو چکا تھا اور وہ بے بسی سے اس کے ملبے پر ماتم منا رہا تھا۔

آج صبح تک اس کی دنیا رنگا رنگ تھی وہ بہت ہی خوش اور مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ عروہ محبت کی دیوی بن کر اس پر مہربان ہو چکی تھی۔ اس نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، آج وہ اسے سرپرائز دیتے ہوئے شادی کا پروپوزل پیش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں سرشار آج وقت سے پہلے دفتر جا پہنچا۔ اسے ایک کمرے سے عروہ کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی تو وہ بے اختیار ہی خاموشی سے دروازے کے باہر

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ

کھڑا ہوگیا۔ اسے گفتگو سے پتا چلا کہ عروہ اس کے بزنس پارٹنر عتیق سے عامیانہ گفتگو میں مشغول تھی۔ وہ دونوں مل کر اس کی محبت اور سادگی کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اسے پتا چلا کہ عروہ درحقیقت عتیق کی داشتہ تھی اور وہ عتیق کے کہنے پر ہی اس پر مہربان ہوئی تھی۔ عتیق اسے بے وقوف بنا کر تمام کاروبار کے شیئرز اپنے نام کروانا چاہتا تھا۔

سکندر کے خوابوں کا محل یک لخت مسمار ہوگیا تھا۔ اس کا رواں رواں تڑپ اٹھا تھا، اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ انسان کتنی بے بس مخلوق ہے۔ کل تک اسے عروہ کی محبت وچاہت پر یقین تھا، عتیق اس کا جگری یار اور پارٹنر تھا مگر آج اس کی زندگی کے یہ دونوں اہم کردار ایک جھوٹ، ایک دھوکہ ثابت ہوئے تھے۔ اسے اپنی زندگی یک لخت ویران سی لگنے لگی تھی۔ وہ جذباتی طور پر اتنی توڑ پھوڑ کا شکار ہوگیا تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر گاؤں کی طرف نکل آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بابا ملک حیات جب بھی کچھ تنہائی چاہتے تھے تو شہر کی رنگینیوں سے منہ موڑ کر فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہوجاتے تھے۔ اب کافی عرصے سے انھوں نے کاروباری مصروفیات کے باعث فارم ہاؤس کا رخ نہیں کیا تھا۔

اس نے سوچا کہ بجائے وہ سب کو خود پر ہوئی واردات کی تفصیلات سنا کر اپنا مذاق بنوائے کیوں نہ وہ اپنے بابا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تنہا رہ کر خود کو اس صدمے سے نکالنے کی خود تبیل کرے۔ سورج تقریبا غروب ہو چکا تھا جب وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچا۔ اس نے گاڑی پختہ ڈرائیووے پر پارک کی اور فارم ہاؤس کی اندرونی عمارت کی جانب چل پڑا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ فارم ہاؤس بند پڑا تھا۔ ویسے بھی یہ فارم ہاؤس گاؤں سے کافی دور واقع تھا۔ نوکر صرف انھی دنوں میں فارم ہاؤس پر آتے تھے جب وہ لوگ چھٹیاں گزارنے آتے تھے۔ سکندر کو یاد آیا کہ آخری مرتبہ وہ دسویں جماعت کے امتحانات کے بعد چھٹیاں گزارنے یہاں آیا تھا۔ وہ صدر دروازے کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔

ایک نوعمر لڑکی صدر دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا حسن جہاں سوز اس کے بوسیدہ کپڑوں سے بھی چھلکا جا رہا تھا۔ لڑکی کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کی گردن پر اور چہرے پر بھی کاٹنے کے اور تشدد کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ سکندر کو احساس ہوا کہ لڑکی کسی مصیبت میں گرفتار تھی۔ اس نے کھنکھارتے ہوئے لڑکی کی توجہ حاصل کرنا چاہی۔ لڑکی اسے دیکھ کر دنگ سی رہ گئی۔ سکندر نے ملائمت سے پوچھا:

''بی بی! تم کون ہو اور یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟''

لڑکی اس کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ وہ حیرت سے بولی:

''تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟
تم میرے رونے کی آواز بھی سن سکتے ہو؟''

سکندر کو اس کی باتیں بہت عجب سی محسوس ہوئیں، اسے لگا کہ لڑکی شاید مالی بابا کی پاگل بیٹی تھی۔ جس کا ذکر اس کے بابا بھی اکثر کرتے رہتے تھے۔ اس نے لڑکی کو جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ لڑکی چلاتی باغ میں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ یہی چلا رہی تھی۔

''وہ آگیا ہے۔ ہمارا مسیحا!''

سکندر نے سر جھٹکا اور سوچا:

''پاگل اولاد بھی کس قدر بڑی آزمائش ہے۔ بیچارے مالی بابا پتا نہیں کیسے اسے اکیلے سنبھالتے ہوں گے۔''

اس نے تاسف سے سر ہلایا، جھک کر سیڑھیوں پر پڑے بڑے گملے کے نیچے سے گھر کی چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اس نے کمروں کی بتیاں جلائیں اور صوفے پر گر سا گیا۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بری طرح تھک چکا تھا۔ صوفے پر پڑے پڑے ہی جلد ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ

کسی غیر معمولی کارن سے کھل گئی۔ نشست گاہ میں بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں غیر معمولی ٹھنڈک کا احساس تھا۔ خاموشی بہت ہی مہیب تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے خاموشی نوحہ کرنے میں مصروف تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے آشنا ہوئیں تو اس نے دیکھا ایک انسانی جسم قالین پر بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔ سکندر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے مالی بابا کی پاگل بیٹی کا خیال آگیا، اس نے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا۔ اس کے ہاتھ میں شمع دان اور ماچس لگ گئی۔ اس نے موم بتی کو جلایا۔ کمرے کی تاریکی اب کچھ کم ہوچکی تھی۔ وہ سہما سہما سا شمع دان لئے ہوئے انسانی جسم کے قریب پہنچا۔ اس نے دیکھا وہ جسم کسی جوان لڑکی کا تھا۔ اس لڑکی نے بہت ہی رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی چولی اور گھاگرا بہت ہی رنگین تھا۔ اس کی نازک کمر پر بہت ہی خوبصورت طلائی کمر بند بندھا ہوا تھا۔ لڑکی کے بال سیاہ اور طویل تھے، مگر اس وقت خون میں تربتر تھے۔ اس کے سر پر بھی ایک رنگین رومال بندھا ہوا تھا۔

سکندر نے ڈرتے ڈرتے اس کے جسم کو ہلایا۔ لڑکی کا چہرہ اب مکمل طور پر سکندر کے سامنے آگیا۔ لڑکی جب زندہ ہوگی اس وقت وہ بہت خوبصورت رہی ہوگی مگر اس وقت اس کا حسین چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی خوبصورت سبز آنکھیں زندگی سے محروم پتھرائی ہوئی تھیں۔ وہ حسین لڑکی جو کسی وقت میں جیتی جاگتی ایک قیامت ہوگی اس وقت وہ محض ایک بے جان، سرد لاش تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کا چہرہ کسی چیز سے مار مار کر کچل کر رکھ دیا تھا۔

لڑکی کی حالت بتاتی تھی کہ اسے مارنے والا کوئی سفاک قاتل تھا، یہ لڑکی مالی بابا کی باولی بیٹی ہرگز نہیں تھی۔ سکندر کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

اچانک مردہ لڑکی میں حرکت ہوئی اس نے سکندر کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا اور کراہتے ہوئے بولی:

''بابو! میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر دیکھو میرے ساتھ کیا ظلم ہوگیا ہے؟''

اس کا حلق خوف سے خشک ہوگیا، اس کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی سی چیخ نکل گئی اور اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے شمع دان نیچے گر گیا۔ سکندر بہت شدید ڈر گیا تھا۔ پہلا خیال اسے یہی آیا کہ وہ کسی گھناؤنی سازش کا شکار ہو چکا تھا۔ عتیق اور عروہ نے مل کر اسے کسی بیگناہ کے قتل کے الزام میں پھنسا دیا تھا پھر اسے لگا کہ یہ کوئی پبلسٹی اسٹنٹ تھا وہ کسی لائیو شو کا حصہ بن چکا تھا جسے کسی چینل پر ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ عروہ اور عتیق یا ٹی وی کی ٹیم کو اس بات کا علم کیسے ہوا تھا کہ وہ فارم ہاؤس آگیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے پھانسی کا پھندا ناچ رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر یہ واقعی قتل کی واردات تھی تو پولیس اس کی بے گناہی تسلیم کرنے والی ہرگز نہیں تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب اس مشکل سے وہ کیسے باہر نکلے؟

اس نے خود کو ڈھارس دی اور اس نے ہانپتے کانپتے شمع دان ڈھونڈ کر دوبارہ روشن کیا، شمع دان کی روشنی میں ایک عجیب منظر اس کے سامنے تھا، اس نے بے یقینی سے اپنی آنکھیں ملیں۔ نشست گاہ کا قالین صاف ستھرا اس کے سامنے موجود تھا۔ لڑکی کے جسم کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ اس نے بھاگ کر سارے کمرے چیک کیئے مگر اسے کہیں بھی کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ صدر دروازہ بھی لاک تھا۔ وہ تھک ہار کر اپنے بیڈروم کو لاک کر کے لیٹ گیا۔ مگر اسے خوف وبے چینی کے مارے رات بھر نیند نہیں آئی۔

صبح ہوتے ہی سکندر گاؤں چلا گیا۔ اس نے ضرورت کی چیزیں مقامی کریانے کی دوکان سے خریدیں اور پھر اس نے فارم ہاؤس کے نوکروں کو کام پر آنے کے لئے کہا۔ اس نے دیکھا تمام نوکر متردد تھے۔ دو تین نے تو صاف انکار کردیا۔ اس کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ فارم ہاؤس آسیب زدہ تھا، وہاں روحوں کا بسیرا ہوگیا تھا۔ اس کے تفتیش کرنے پر انھوں نے بتایا کہ یہ تمام افتاد مالی کی باولی بیٹی کے گم ہوجانے

کے بعد سے شروع ہوئی تھی۔ بیٹی کے گم ہوجانے کے بعد مالی بابا بھی بیمار ہوگیا تھا اور چند دنوں کے اندر اندر وہ بھی اس کے غم میں چل بسا تھا۔ مالی بابا کی موت کے بعد فارم ہاؤس میں عجیب وغریب آوازیں آنے لگی تھیں۔ نوکروں کو اپنی جان پیاری تھی اس لئے انھوں نے وہاں جانا ترک کردیا تھا۔

سکندران لغویات اور توہمات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اصرار کرنے پر نوکر اس شرط پر راضی ہوئے کہ مغرب کی نماز سے پہلے پہلے وہ کام سے چھٹی کرلیا کریں گے۔

سکندر کے لئے یہ تمام صورتحال بہت غیر متوقع تھی، مگر وہ یہ پراسرار گتھی سلجھائے بنا واپس شہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ گاؤں میں آدھا دن گزار کر گھوم پھر کر وہ فارم ہاؤس پہنچا تو اس نے دیکھا نوکر جانے کی تیاری میں تھے مگر انھوں نے کمرے صاف کردیئے تھے۔ ماسی شاداں نے کھانا بنا کر روٹیاں پکا کر رکھ دی تھیں۔ نیا مالی فارم ہاؤس کے باغ کو ترتیب سے کاٹ چھانٹ چکا تھا۔ جلانے کی لکڑی بھی باہر بنے آتش دان کے پاس ڈھیر کردی گئی تھی۔ اس نے بادل ناخواستہ انھیں رخصت ہونے کی اجازت بھاری دل سے دے دی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اکیلے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پھر اس نے اپنی کافی بنائی اور باہر پڑی آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی توجہ سامنے پڑے لکڑی کے خوبصورت منقش جھولے پر پڑی۔ اس نے حیرت سے سوچا:

''ارے بابا نے کب سے یہ شوق پال لئے؟''

وہ کافی کا مگ پکڑے جھولے کے پاس گیا۔ جھولا کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھا۔ اس پر بچھے گدے پر پتوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار ہی پتے گرائے، اچانک اس کے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرائے۔ اس نے بے اختیار ہی اس چیز کو پکڑ لیا۔ اس کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی خوبصورت منقش کمر بند تھا جو اس نے کل رات مقتول لڑکی کی کمر پر بندھے دیکھا تھا۔ اس نے بے اختیار ہی اسے چھوڑ دیا۔ وہ ایک جھنکار کرتا زمین پر گر گیا۔ سکندر کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ اس نے بے بسی سے

''اس کا مطلب ہے کہ کل رات یہاں کچھ ہوا تھا مگر کیا؟''

اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس نے سرخ اینٹوں کے فرش پر نظر دوڑائی۔ کمر بند اب وہاں سے غائب تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے اعصاب جواب دیتے جارہے تھے۔ وہ بھاگتا ہوا گھر میں آیا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا، اسے ایک مترنم سنائی دی۔ وہ بے اختیار آواز کی سمت بھاگا، اس واضح طور پر پائل کی پکار اور چوڑیوں کی جھنکار سنی۔ کوئی سبک قدموں سے اس کے آگے بھاگ رہا تھا مگر وہ اسے دیکھنے میں ناکام تھا۔ وہ اونچی آواز میں بولا:

''تم جو کوئی بھی ہو سامنے آجاؤ۔ عروہ، میرے ساتھ گھناؤنے کھیل مت کھیلو۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ یہیں پر ہو۔''

اس کی آواز اپنی بازگشت میں ہی گم ہوکر رہ گئی۔ زنانہ ہنسی، پائل اور چوڑیوں کی چھنکار اچانک کہیں گم ہوگئی۔ گھر میں دوبارہ سے خاموشی کا راج تھا۔ سکندر جان چکا تھا کہ عتیق اور عروہ مل کر اسے پاگل بنانے ۔ وہ زور سے چیخ کر بولا:

''میں کسی اوچھے ہتھکنڈے سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تم لوگ جو مرضی کرو میں جھانسے میں آنے والا نہیں۔''

اس نے چند کتابیں مطالعے کے کمرے سے لیں اور اپنے کمرے میں لیٹ کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اسے نیند آ گئی۔ اس کی آنکھ کھولی تو اسے کچھ غیر معمولی احساس ہوا۔ کمرہ برف زار بنا ہوا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا وہ اپنے منہ سے نکلتی بھاپ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے سوچا:

''یہ اوائل سرما میں اتنی سردی کب سے ہونے لگی؟''

اچانک اسے دبی دبی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ خوف سے پسینے میں نہا گیا۔ اس کے علاوہ گھر میں کوئی ذی روح موجود تھا۔ اس نے کمرے کے کونے

اس نے پڑا اپنا بلا اٹھایا اور دبے پاؤں آواز کی سمت چلا۔ آواز اس کے ساتھ والے بیڈروم سے آرہی تھی۔ اس نے آہستہ سے تھوڑا سا کمرے کا دروازہ کھولا۔ کمرہ چاندنی سے روشن تھا، موتیئے اور گلاب کی خوشبو ہوا کے ساتھ آرہی تھی۔ کمرے کے وسط میں بچھے پلنگ پر ایک مرد چت لیٹا ہوا تھا، اندھیرے کے باعث اس کے چہرے کے نقوش واضح نہیں ہورہے تھے جب کہ ڈھیلے ڈھالے رنگین کپڑوں میں ایک بنجارن اس کے انتہائی قریب کھڑی تھی۔

عورت کی کلائی مرد نے تھام رکھی تھی۔ عورت کسمساتے ہوئے اپنی کلائی مرد سے چھڑوانا چاہ رہی تھی۔ اس کے انداز میں گریز صاف نظر آرہا تھا۔ جب کہ مرد اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنی جانب کھینچنے میں مصروف تھا۔ عورت مرد کی پیش قدمی روکتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔ مرد کی جوالا مکھی سانسوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

عورت دبی دبی آواز میں بولی:

''بابو! میں بنجارن ضرور ہوں مگر ویواہ سے پہلے سمبندھ کو پاپ سمجھتی ہوں۔

تم میرے بابا سے مجھے مانگ لو۔ تمھارے پاس پیسہ ہے میرے بابا اور قبیلے کو کچھ پیسہ اور زمین دان کردو۔ وہ بھی یہیں ٹک جائیں گے۔''

مرد کے اوپر خواہش کا بھوت سوار تھا وہ لگتا تھا بہرہ تھا۔ وہ عورت کی مزاحمت سے بے پروا اپنی دراز دستیوں میں مشغول تھا۔ وہ عورت کی مزاحمت اور مسلسل انکار پر جھنجھلا کر دھیمی آواز میں بولا:

''پگلی! پریم کیا تو ڈرنا کیا؟

جب دل مل چکے ہیں تو جسم بھی ملنے دو۔ اس میں کیسا پاپ ہے؟''

عورت ہول کر بولی:

''بابو! یہ بہت بڑا پاپ ہے۔ ہم غریب ضرور ہیں مگر پیشہ ور نہیں ہیں۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں تمھارے اس وقت بلانے پر بھاگی چلی آئی۔ بھگوان کے واسطے مجھے جانے دو۔''

سکندر کو نہ جانے کیوں مرد کی آواز بہت آشنا سی محسوس ہوئی، وہ ابھی تحیر کی بھول بھلیوں میں گم تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کسی کی تنہائی کے لمحات کو دیکھ رہا تھا، اسے حیا سی محسوس ہوئی اس نے جھٹ سے دروازہ بند کردیا۔ اس نے اپنے پھولتے ہوئے سانس کو ہموار کیا اور دروازے پر دستک دے کر اونچی آواز میں کہا:

''تم جو کوئی بھی ہو ہوشیار ہوجاؤ۔ میں اس گھر کا مالک ہوں اور اندر آرہا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھول ڈالا۔ اندر کا منظر اس کی امیدوں کے خلاف تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بستر کی چادر بے شکن تھی۔ کمرے میں چاندنی بھی مفقود تھی۔

بکھرے موتی

☆ درخت پر اوقات سے زیادہ پھل جائیں تو اس کی ڈالیاں ٹوٹنا شروع ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح انسان کو اوقات سے زیادہ مل جائے تو وہ رشتوں کو توڑنا شروع کردیتا ہے۔ انجام آہستہ آہستہ درخت اپنے پھل اور انسان رشتوں سے محروم ہوجاتا ہے۔

☆ الفاظ کا چناؤ سوچ سمجھ کر کریں جب آپ بات کررہے ہوتے ہیں تو آپ کے الفاظ آپ کے خاندان، مزاج اور آپ کے تربیت کا پتہ دے رہے ہوتے ہیں۔

☆ زندگی کوئی چائے کا کپ نہیں ہے کہ ایک چمچ شکر ملا کر ذائقے کی تلخی کو دور کرلیا جائے۔ زندگی کو تو عمر کے آخری لمحے تک گھونٹ گھونٹ پینا پڑتا ہے، چاہے تلخی کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہوجائے۔

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

سکندر کا سر چکرانے لگا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ باقی رات اسے کبھی خوشبو کے جھونکے آتے ہوئے محسوس ہوتے رہے، کبھی پائل کی چھنک سنائی دیتی، کبھی چوڑیوں کی جھنکار اس کے کانوں کے قریب سنائی دیتی۔ وہ صبح اٹھا تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے صبح اماں شاداں کو باورچی خانے میں ناشتہ بناتے دیکھا تو ان کے قریب جا کر بولا:

''اماں! یہاں پاس ہی کہیں بنجاروں نے پڑاؤ ڈالا ہوا ہے کیا؟''

اس نے دیکھا اماں شاداں کا ہاتھ کانپ سا گیا۔ وہ بے اعتنائی سے بولیں:

''مجھے نہیں پتا۔ یہ بتاؤ آج تم ناشتے میں کیا کھاؤ گے؟''

سکندر نے سر پر ہاتھ رکھا اور کچن ٹیبل کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دبی دبی آواز میں کہا:

''اماں! یقین کیجیے۔ میں جب سے یہاں آیا ہو، کچھ عجب ہو رہا ہے۔ کل مجھے یہاں ایک بنجارن اور ایک مرد نظر آئے تھے۔ شاید وہ گھر خالی سمجھ کر اندر آ گئے تھے۔

آپ لوگ کہتے ہیں کہ مالی بابا کی پاگل بیٹی گم ہو گئی تھی مگر جس روز میں آیا اس روز وہ صدر دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔''

سکندر نے دیکھا کہ اماں شاداں کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے سکندر کی بات سے شدید دھچکا لگا تھا۔ اماں شاداں نے مزید تیزی سے اپنے ہاتھ چلاتے ہوئے اپنی توجہ کام کی طرف مبذول کر لی تھی۔ سکندر کو احساس ہو گیا کہ اماں اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دینے والی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر چلا آیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس معمے کو خود حل کر کے دم لے گا۔

رات آئی تو سکندر تیار تھا۔ اس نے آج رت جگے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس نے کافی کا تھرماس بھر کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی موجود تھا۔ اس نے آج ان نوسر بازوں کو سبق سکھانے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا جو اس کے فارم ہاؤس کو آسیب زدہ قرار دے کر اپنا مطلب پورا کر رہے تھے۔ رات آہستہ آہستہ بھیگتی جا رہی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے مگر ابھی تک کوئی غیر معمولی حرکت اس نے محسوس نہیں کی تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تھی۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ جلد ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ حسب معمول برف کی طرح سرد تھا۔ ساتھ والے کمرے سے سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں اٹھا اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور دیکھا، تو دو لوگ ایک دوسرے میں گم تھے۔ مرد کا چہرہ اندھیرے میں تھا مگر عورت ایک نوجوان خوبصورت لڑکی تھی۔ عجب بات یہ تھی کہ یہ لڑکی اس کے لئے بالکل انجان تھی۔ وہ نہ بنجارن تھی اور نہ مالی بابا کی پاگل بیٹی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر دستک دے کر با آواز بلند اعلان کیا کہ وہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا مگر جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو حیران و پریشان رہ گیا، حسب معمول کمرہ خالی تھا۔

اچانک اسے باہر نشست گاہ سے کسی کے زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے اختیار ہی دوڑتا ہوا نشست گاہ کی طرف گیا۔ اس نے دیکھا رنگین کپڑوں میں ملبوس بنجارن اس کے سامنے نشست گاہ کے وسط میں کھڑی تھی۔ لڑکی کے سامان کا تھیلا سامنے صوفے پر پڑا تھا۔ اس سے جھانکتی رنگ برنگی پنکھیاں اور مٹی کے برتن بتا رہے تھے کہ وہ لڑکی یہ چیزیں فروخت کرتی تھی۔ وہ لڑکی اس وقت ایک مرد کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ سکندر نے دیکھا مرد کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ سکندر نے کان لگا کر سنا۔ لڑکی گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بابو! میری محبت کو میرے لئے گالی مت بناؤ۔ میں تمھارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ بھگوان کے لئے مجھے اپنا لو۔ اس معصوم کو اپنا نام دے دو۔ تم نے مجھے وچن دیا تھا کہ تم مجھ سے ویواہ کر لو گے۔''

مرد ایک مجسمے کی طرح ساکت و صامت کھڑا تھا۔ لڑکی نے بھاگ کر اس کے پیر پکڑ لئے۔ مرد نے

نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر لڑکی کے منہ پر پھینکی اور بے مہری سے بولا:

''مجھے کیا پتا کلموہی تو کس کا گناہ میرے سر تھوپ رہی ہے؟

تیری جیسی عورتوں کا کیا بھروسہ؟

پتا نہیں کس کس کا دل بہلاتی ہے؟''

لڑکی تڑپ اٹھی، اس نے مرد کا گریبان تھام لیا اور ہذیانی انداز میں چیخی:

''ہرجائی، پاکھنڈی کہاں گئے تیرے پوتر پریم کے وہ وعدے، وہ قسمیں، تجھے مجھ سے ویواہ کرنا پڑے گا ورنہ میں تیرا اصل چہرہ گاؤں بھر کو دکھا دوں گی۔ میرا بابا تجھے نہیں چھوڑے گا۔''

مرد نے اچانک آتش دان کے قریب پڑی ایک کریدنے والی سلاخ اٹھائی اور لڑکی پر ٹوٹ پڑا۔ لڑکی اپنے چہرے اور سر کو بچاتی قالین کے بیچ تک پہنچ گئی۔ وہ مرد لڑکی کے سر اور چہرے پر اندھا دھند ضربیں لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ذلیل بنجارن! مجھے بدنام کرے گی۔ میری شرافت کے لبادے کو تار تار کرے گی۔ دیکھ میں تجھے جہنم رسید کرتا ہوں۔''

میرا نام ملک حیات ہے، تیری جیسی دو ٹکے کی لڑکیوں کو میں اپنا نام سونپنے لگتا تو اتنے برسوں میں لاشوں کی قطار لگ جاتی۔ میں تیری جیسی زبان دراز عورتوں کو استعمال کے بعد اسی فارم ہاؤس میں زندہ گاڑ دیتا ہوں، تجھے تو پھر میں مار کر گاڑوں گا۔''

سکندر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا:

''ملک حیات تو میرے بابا کا نام ہے۔ یہ کیا دھمال ہو رہی ہے؟''

کون ہمیں بدنام کرنا چاہ رہا ہے؟''

یہ کسی ایڈوانس پراجیکٹر کا کمال لگتا ہے کہ مجھے اس فلمی قسم کے مناظر نظر آ رہے ہیں۔''

وہ ابھی انھی سوچوں کے مد و جزر میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ

مرد نے اپنا رخ بدلا، سکندر نے دیکھا اس کا باپ اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اس کا باپ اس کا مان اور آئیڈیل تھا۔ مگر آج وہ سن سا کھڑا اس کا اصل چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس نے اپنے باپ کا جو بہیمانہ اور سفاکانہ روپ دیکھا تھا وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ لڑکی کا بے جان لاشہ قالین پر پڑا تھا۔ اس کی خوبصورت بے جان سبز آنکھوں میں ایک تحیر تھا۔ سکندر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس کے والد کو معاشرے بھر میں لوگ دیوتا کی طرح پوجتے تھے۔ لوگ ان کی پارسائی کی قسمیں کھاتے تھے۔ وہ نہ صرف ارکان دین کے پابند تھے بلکہ کئی فلاحی تنظیمیں بھی چلاتے تھے۔

سکندر اور اس کے تینوں بہن بھائی بہت چھوٹے تھے جب ان کی والدہ گردن توڑ بخار سے گزر گئی تھیں۔ اس کے والد نے ساری جوانی ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں گزار دی تھی۔ رشتے داروں کے انتہائی اصرار پر بھی شادی نہیں کی تھی۔

سکندر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ابھی جو کچھ دیکھا وہ سب حقیقت میں رونما ہوا تھا یا وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا تھا۔ سکندر کو چکر سا آ گیا، اس نے آنکھیں ایک لمحے کے لئے بند کیں جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو کمرے میں سب کچھ اپنی جگہ پر تھا۔ نشست گاہ خالی تھی۔ سکندر کو اپنی دماغی صحت پر شک ہونے لگا تھا۔ اس کا سانس رک رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ مگر سامنے کا منظر دیکھ کر وہ ششدر سا رہ گیا۔

سامنے گلاب کی کیاریوں کی زمین شق ہو گئی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سے تین لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ گلاب کی کیاری درحقیقت ان لڑکیوں کا مرقد تھی۔ جلد ہی وہ گرتی پڑتی اس کے قریب پہنچ گئیں۔ یہ ساری لڑکیاں نوجوان اور خوبصورت تھیں۔ ان لڑکیوں میں سے ایک مالی بابا کی پاگل بیٹی بھی تھی، ایک بنجارن تھی اور ایک گاؤں کی کوئی

الہڑ مُیار تھی۔ وہ ان تینوں کو وہ مختلف اوقات میں فارم ہاؤس میں رونما ہونے والے پراسرار واقعات میں دیکھ چکا تھا۔ ان میں سے ہر لڑکی اپنے حسن میں یکتا اور بے مثال تھی۔ سب سے آگے والی بنجارن سے وہ بخوبی واقف تھا۔

سکندر کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوچکی تھی۔ اس نے بے یقینی سے سر ہلایا اور بولا:

''میں کسی دماغی مرض کا شکار ہوگیا ہوں۔ میں روحوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم لوگ میرے ذہن کا فتور ہو۔''

بنجارن سانپ کی طرح پھنکاری اور کہنے لگی:

''تیرا باپ ابھی چند لمحوں میں یہاں پہنچتا ہوگا۔ کل رات تجھے بس میں کرکے ہم نے اس بے غیرت کو فون کروادیا تھا۔ تیری روتی بسورتی آواز سن کر وہ تڑپ اٹھا تھا۔ اس کا انجام اب قریب ہے۔''

اس کی سبز آنکھوں میں انتقام کی آگ جل رہی تھی سکندر نے چاہا کہ وہ فون کرکے بابا کو یہاں آنے سے منع کردے مگر اس کا ہاتھ سیل فون تک نہیں پہنچ سکا۔ اسی اثنا میں اسے گاڑی کا جانا پہچانا ہارن سنائی دیا، سکندر نے دیکھا کہ اس کے والد گاڑی ڈرائیو وے پر پارک کرکے اس کی جانب کشاں کشاں چلے آرہے تھے۔ سکندر نے انھیں چیخ کر منع کرنا چاہا، انھیں پلٹ جانے کا کہنا چاہا مگر اس کی زبان گنگ ہوچکی تھی۔ اس کے والد جیسے ہی اس کے قریب پہنچے وہ اسے ان لڑکیوں میں گھرا دیکھ کر چونک اٹھے۔ سکندر نے ہلنا چاہا مگر وہ تو جیسے پتھر کا بن گیا تھا۔ لڑکیوں کے چہرے دیکھتے ہی ملک حیات اچھل پڑا۔ وہ خوف سے زرد پڑتے ہوئے بولا:

''تم تینوں تو مرچکی ہو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے تم تینوں کو جہنم رسید کیا تھا۔ تم کیسے یہاں موجود ہوسکتی ہو؟''

سکندر کو اپنے باپ کے اعتراف قتل کو سن کر بھی کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بے اختیار ہی بولا:

''بابا! آپ نے گناہ اور معصیت کا راستہ کیوں اپنایا؟ ہمارے مذہب نے آپ کو نکاح کا حق دیا تھا پھر کیوں؟

آپ نے ان لڑکیوں کی عزتوں سے کھلواڑ کیوں کیا؟

کیا آپ قرآن پاک نہیں پڑھتے تھے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

ترجمہ: اور زنا کے قریب مت جاؤ یہ بے [illegible] بے حیائی ہے۔ (سورہ بنی اسرائیل)۔

چوہدری ملک حیات گڑگڑاتے ہوئے بولا:

''پتر! میری مت ماری گئی تھی۔ میں اپنی خواہش کا اسیر ہوگیا تھا۔ اس معاشرے میں دوسرا نکاح کرنا مشکل اور زنا کرنا آسان ہے۔''

اس نے اپنے ہاتھ لڑکیوں کے سامنے جوڑ دیے اور کہا:

''مجھے تم سب معاف کردو۔ میں نے تم لوگوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں انسان سے بھیڑیا بن گیا تھا۔ میں اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی کر بیٹھا ہوں۔ میں زنا اور قتل جیسے دو گناہ عظیم کا مرتکب ہوچکا ہوں۔ تمھاری معافی شاید میرے اعمال سے گناہوں کو جھاڑ دے۔''

وہ تینوں یک زبان بول اٹھیں۔

''تجھے معاف کردیں؟ تو نے جس نے نہ صرف ہمارے جسم داغدار کیے ہیں بلکہ ہماری روح بھی گہنا دی ہے۔ ہم مر کر بھی بھٹکتی پھر رہی ہیں۔''

بنجارن آگے آکر بولی:

''یہ پاکھنڈی تو نہ صرف میرا بلکہ میرے [illegible] بھی قاتل ہے۔ میرا وہ بچہ جو اس کے کارن دنیا میں جنم نہ لے پایا۔''

مالی بابا کی پاگل نوعمر لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا

''اس ہوس کے درندے نے میرے بابا کو شہر ہفتوں کے لئے بھیج دیا اور پیچھے سے اسی فارم ہاؤس میں میرے ساتھ منہ کالا کرتا رہا۔ اسے یہ خیال تھا کہ شاید میں بالکل پاگل ہوں۔ ایک رات جب میں روتے ہوئے اسے کہا کہ میں اپنے بابا کو سب کچھ بتادوں گی تو اس نے مجھے زندہ ہی گلاب کی کیاریوں میں گاڑ دیا۔ میرا ابا بامیرے غم میں تڑپ تڑپ کر مرگیا۔''

ملک حیات کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا:

''میں بے بس تھا۔ میں مجبور تھا اس سے پہلے میں روپے سے ہی جسم خریدتا رہا تھا۔ مجھے تو یہی حل پتا تھا۔ میں نے تو تمھیں کہا تھا کہ مجھ سے پیسہ لے لو اور خاموشی سے لوٹ جاؤ۔ جب تم لوگ نہیں مانیں تو مجھے مجبوراً یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔''

سکندر آگے بڑھا اور بولا:

''بابا کیوں؟ آخر کیوں؟

آپ سب کی نظروں میں مذہبی اور متقی بنے رہے۔ آپ کے لئے کیا دنیا والوں کی نظر میں پاکباز اور عظیم بننا اتنا ضروری تھا کہ آپ لٹیرے اور قاتل بن گئے۔

دوسری شادی ایک حلال راستہ تھا، ہماری والدہ تو فوت ہوچکی تھیں مگر آپ حلال ذریعہ اپنانے سے ہچکچاتے رہے کیوں؟''

ملک حیات پھٹی پھٹی آواز میں بولا:

''تمھاری ماں کی وفات کے دس سال بعد جب مجھے جسمانی تقاضوں نے تنگ کرنا شروع کیا۔ اس وقت تک تم بچے، ہمارے رشتے دار، دوست، احباب، پڑوسی سب مجھے دیوتا بنا چکے تھے۔ جسے کوئی انسانی حاجت نہیں رہی تھی۔ جو ہر انسانی اور بشری کمزوری سے پاک تھا۔ محلے کی عورتیں، رشتے دار عورتیں، دوستوں کی بیویاں، جواں سال بیٹیاں سب مجھے اوتار سمجھتیں کوئی مجھے بھائی کہتی اور کوئی مجھے انکل۔

میرا دل کرتا تھا کہ میں ان کو بتاؤں کہ میں ان کا بھائی یا انکل ہرگز نہیں تھا۔ میں ایک کمزور انسان تھا۔ میں تو اپنے آپ سے ڈرنے لگا تھا میرا دل کرتا تھا کہ کسی بھی راہ چلتی عورت کے گلے کا ہار بن جاؤں۔ میرے بشری تقاضے مجھے پاگل کرنے لگے تھے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اپنی دوسری شادی کی خواہش کسی سے بیان نہ کرپایا۔

پھر ایک روز میں یہاں چھٹیاں گزارنے اکیلا آیا۔ شاید شیطان میری تاک میں تھا یا میں خود شیطان بن گیا تھا۔ یہاں مجھے پروین مل گئی۔ میرے چند جھوٹے وعدوں پر یقین کرکے اس نے اپنا آپ مجھے سونپ دیا۔ پھر میرے ڈرانے پر وہ چند ہزار لے کر بھاگ بھی گئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا۔ مجھے بھی اندازہ ہوگیا کہ میں اپنی طلب اس ناجائز ذریعے سے بھی مٹا سکتا تھا، مجھے معصیت اور گناہ کی زندگی میں لطف آنے لگا۔ میں نت نئی عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا اور شادماں رہتا۔ میرے بچوں اور دنیا کے سامنے میری شخصیت کی پاکبازی بھی قائم تھی۔ بس مجھے پھر پتا ہی نہیں چلا کہ کب اور کیسے میں زانی سے قاتل بھی بن گیا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ سینہ دباتے ہوئے روتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ سکندر نے بھاگ کر ان کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ اس کے والد کا وقت آخر آچکا تھا۔ اس نے بے بسی سے کہا:

''بابا! مظلوم کی آہ عرش کو ہلا دیتی ہے۔ کاش آپ نے دین کا راستہ چھوڑ کر معصیت کے راستے کو نہ اپنایا ہوتا۔ اب کیا ہوگا؟''

بابا کیا آپ کو بخشش مل جائے گی؟''

اس کی بات سن کر ملک حیات کے جسم پر تشنجی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ تکلیف سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے اوندھے منہ ہوگئے۔

سکندر نے انھیں مشکل سے سیدھا کیا اور وہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ چوہدری ملک حیات کا دم نکل چکا تھا۔ ان کی بے نور آنکھیں اسے تک رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھایا تو تینوں لڑکیوں کی روحیں اس کے سامنے سے غائب ہوچکی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ ان کا انتقام پورا ہوچکا تھا۔ لٹیرے کو اس کے گناہوں کی سزا مل چکی تھی۔ برائی اور شر کی بھیانک رات بیت چکی تھی۔ دور گاؤں کی مسجد میں موذن نماز فجر کی اذان دے رہا تھا۔

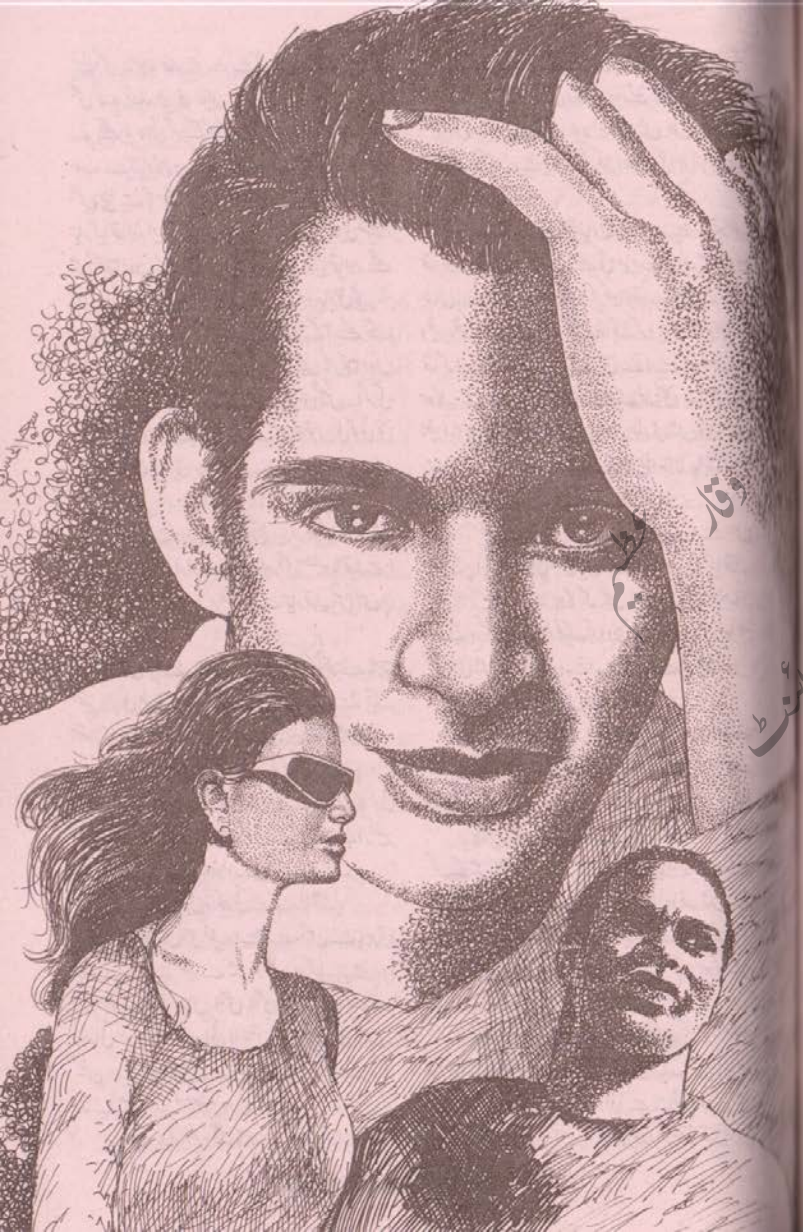

موت کی سرگوشی

مظہر الحق علوی

قسط نمبر 4

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی اور روح کو دہلا دینے والی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو تحیر کے سمندر میں غوطہ زن کرکے رکھ دے گی صدیوں بعد ہارر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تحفۂ خاص

ایک ایسے..... شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت..... سے نکل آیا تھا

تو معلوم ہوا کہ سینور جیدو فیراری ابھی ابھی تشریف لے گئے تھے۔

میں بغیر کسی عجلت کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ڈھلان سے اتر کر شہر کو جاتی ہوئی سڑک پر چل دیا اور راستے میں ہی جیدو کو جالیا وہ بڑی فراغت سے ٹہلتا ہوا چل رہا تھا اور حسب معمول سگار پھونک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ تھا اور مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ میرے گھر کے حرارت خانے کے یہ پھول کس نے دیئے تھے۔

میں اس کے قریب سے نکلا چلا گیا۔ اس نے بے پروائی سے میری طرف دیکھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ چاندنی سے بے حد دلکش معلوم ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک معمولی سے ماہی گیر سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس کی نگاہیں ایک لمحہ کے لئے مجھ پر جمی رہیں اور پھر اس نے نظریں مجھ پر سے ہٹالیں۔

ایک مجنونانہ خواہش میرے دل میں ابھر آئی اور میرا دل چاہا کہ پلٹ کر اس پر ٹوٹ پڑوں، اس کا حلق دبوچ لوں، اسے اپنے قدموں پر ڈال دوں، تھوک دوں اس پر اور اپنے پیروں تلے روند دوں۔ لیکن میں نے ان غضبناک اور خطرناک جذبات کو دبا دیا۔

مجھے تو اس سے اچھا کھیل کھیلنا تھا۔ میں نے تو ایک بے حد عمدہ اور انتہائی کربناک عذاب اس کے لئے بچا رکھا تھا۔ جس کے مقابلے میں یہ دست بدست لڑائی لڑنی حماقت اور کم درجہ چیز تھی۔ انتقام کے پھل کو تو انتہائی غصے کی تپش میں آہستہ آہستہ پکنے دینا چاہیے یہاں تک کہ پوری طرح سے پک کر وہ خود ٹپک پڑے۔ چنانچہ وقت سے پہلے، یعنی پکنے سے پہلے اسے جلد بازی میں توڑ لینا مناسب نہیں کیونکہ وہ کچے یا ادھ پکے پھل کی طرح بے رس ہوتا ہے اور ترش بھی کڑوا بھی۔

چنانچہ میں نے اپنے دوست کو اپنی بیوہ بیوی کے۔ کیا کہوں اسے؟ ہاں۔ اپنی بیوی کے غم زدہ دل کو بہلانے والے اور خود اسے تسلی دینے والے ''مخلص ساتھی'' کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ نہ اس سے کچھ کہا، نہ اس پر حملہ کیا اور نہ اس کی طرف دیکھا۔ بلکہ اسے اس کے کالے دل سے مشورہ کرتے اور آپ ہی آپ مسکراتے چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا۔

میں شہر میں پہنچا اور رات گزارنے کے لئے ایک سرائے تلاش کرلی، جہاں میرے ''ہم پیشہ'' یعنی ماہی گیر وغیرہ اور ایسے ہی غریب لوگ رہتے اور سوتے تھے اور کمال ہے کہ میں گہری اور ایسی بے خبر نیند سویا کہ

پہلے کبھی نہ سویا تھا۔ حیرت ہے کہ میں نے کوئی خواب بھی نہ دیکھا۔ میری حالیہ بیماری تھکن، صدمے اور غم نے مجھے نڈھال کر کے ایسی نیند سلا دیا تھا شاید۔ لیکن سب سے زیادہ زور آور اور تیر بہدف خواب آور دوا کا جس چیز نے کام کیا تھا وہ انتقام کا وہ نقشہ تھا، جو میں نے تیار کیا تھا اور ایسا خوفناک اور ایسا لرزہ خیز انتقامی نقشہ، میں سمجھتا ہوں پہلے کبھی کسی انسان نے نہ بنایا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

آپ اسے انسانیت سوز کہیں گے؟ مجھے ننگ انسانیت اور ناعیسائی کہیں گے؟ چنانچہ میں پھر کہتا ہوں کہ مسیح نے کبھی کسی عورت سے محبت کی ہی نہیں۔ اگر کی ہوتی تو پھر وہ ہمارے لئے انصاف اور قانون کی کوئی نئی دفعہ اور کوئی عمدہ شرعی سزا چھوڑ دیتے۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن میں علی الصبح بیدار ہو گیا تو گزشتہ رات میں نے جو ارادہ کیا تھا وہ اور بھی مضبوط تھا۔ میرا منصوبہ پوری طرح اور ہر طرح سے تیار تھا۔ بس اس پر عمل ہی کرنا تھا۔

میں سرائے سے باہر آیا اور لوگوں کی نظر سے چھپتا مقبرے کی طرف چلا۔ ایک تھیلی میں، میں نے ایک ہتھوڑی، چند مضبوط کیلیں اور چھوٹی لالٹین رکھ لی تھیں۔

قبرستان میں پہنچ کر میں نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا کہ کیا پتہ قبروں میں سوئے ہوؤں کا کوئی عزیز فاتحہ کے لئے آیا ہو اور کہیں قریب ہی ہو۔

لیکن کہیں کوئی، دکھائی نہ دے رہا تھا۔

چنانچہ میں اسی خفیہ راستے سے، جس سے باہر آیا تھا، دوبارہ اپنے مقبرے میں داخل ہو گیا۔ یہ میرا وہ دارالعقوبت تھا جہاں ابھی ابھی میں نے بھیانک روحانی خوف اور جسمانی اذیتیں برداشت کی تھیں۔ لیکن وہ سب اذیتیں میری حالیہ دماغی حالت کے مقابلے میں بہت کم معلوم ہوتی تھیں۔

میں سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں خفیہ خزانے کا وہ صندوق تھا۔ روپوں کے نوٹوں کی ساری گڈیاں نکال کر میں نے اپنی جیبوں میں رکھ لیں، نیفے میں اڑس لیں، کپڑوں میں چھپا دیں اور جب میں ان چھوٹے چھوٹے پیکٹوں سے یوں لد کر کھڑا ہوا تو کئی ہزار فرانک کا آسامی تھا۔

اب میں نے وہ ہتھیار نکالے جو اپنے ساتھ لایا تھا اور صندوق کے اس حصے کی مرمت شروع کر دی جہاں سے میں نے اسے توڑ کر کھولا تھا۔ میں نے کیلیں وغیرہ ٹھوک کر اسے ایسا ٹھیک ٹھاک کر دیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسے توڑنا تو دور کی بات کسی نے اسے چھوا تک نہ ہوگا۔ میں نے بڑی تیزی سے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنا کام پورا کیا۔ کیونکہ میں بڑی جلدی میں تھا۔ میں دس پندرہ دن کے لئے نیپلز سے باہر چلا جانا چاہتا تھا۔ اور میرا ارادہ اسی دن روانہ ہو جانے کا تھا۔

مقبرے سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے اس تابوت پر ایک نظر ڈالی جس میں مجھے لٹا کر دفن کیا گیا تھا۔

"مناسب نہ ہوگا کہ میں اس کی بھی مرمت کر کے اور کیلیں ٹھوک کر ٹھیک کر دوں۔ جیسے اب بھی میری نعش اسی میں ہے؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور پھر میں نے اس سوال کا جواب دیا۔

"نہیں بہتر ہوگا کہ اسے اسی طرح ٹوٹا ہوا اور کھلا چھوڑ دیا جائے کیونکہ آخر میں اسی سے میرا مقصد پورا ہوگا۔"

چنانچہ مقبرے میں مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ سب کچھ کر کے میں اسی خفیہ سوراخ سے باہر آ گیا اور اسے پہلے کی ہی طرح ٹھیک سے بند کر دیا۔ بلکہ اس دفعہ میں نے اسے بند کرنے میں کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لیا۔

اس طرف سے فرصت پا کر اور مطمئن ہو کر میں سیدھا "مولو" پہنچا۔

وہاں موجود ملاحوں سے پوچھ تاچھ کی تو معلوم ہوا کہ ساحلی بستیوں کی چکر لگانے والی ایک کشتی پالیرمو کے لئے بس روانہ ہونے ہی والی ہے۔ پالیرمو بھی کسی دوسرے مقام کی طرح میرا مقصد پورا کر سکتا تھا۔ اس

کشتی کے کپتان کو تلاش کرتے مجھے دیر نہ لگی۔ وہ جھلسی ہوئی رنگت اور ہنستی ہوئی آنکھوں والا بشاش آدمی تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی کشتی میں سفر کرنا چاہتا ہوں تو اس نے بے حد دل پذیری سے مسکرا کر اپنے حیرت انگیز حد تک سفید اور خوب صورت دانتوں کی نمائش کر دی اور میں نے اس کے ساتھ اس کرائے پر سودا طے کر لیا جو میرے خیال میں بے حد مناسب تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کرایہ اس کی توقع سے بہت زیادہ یعنی اصل سے تگنا تھا۔ لیکن اس قبول صورت معاش نے ایسے اخلاق، ایسی شائستگی اور ایسی ہر دلعزیزی سے مجھے سونگھا تھا کہ مجھے ذرا بھی شک نہ ہوا تھا۔ اس کے برخلاف میں اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

صبح کے نو بج رہے تھے جب ہمارے چھوٹے سے جہاز نے لنگر اٹھا دیا۔ صبح چمکیلی تھی اور ہوا ٹھنڈی تھی۔ جہاز کے پہلوؤں سے ٹکراتی ہوئی لہریں دھیمی دھیمی آوازیں پیدا کر رہی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک انہیں جن بھلی بری باتوں کا تجربہ ہوا تھا وہ ایک دوسرے کو سرگوشیوں میں بتا رہی تھیں۔

میں جہاز کے سرے پر بے مقصد اور بیکار بیٹھا بحر متوسط کے پرسکون اور شفاف پانیوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ سمندر کی تہہ میں سنہری ریت پر چت پڑی تھی، اس کے ریشمی بال اس کے سرو سینے کے گرد زرد آبی بیلوں کی طرح تیر رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں موت کی تکلیف میں بھنچی ہوئی تھیں، اس کے بہتے ہوئے ہونٹ سرد اور جامنی ہو گئے تھے اور اب کبھی وہ ہنس سکیں گے اور نہ مسکرا سکیں گے۔

اور میں نے سوچا اور خدا کا یا پتہ نہیں کس کا شکر ادا کیا کہ میرا تصور مجھے میری بیوی کی یہ تصویر دکھا رہا ہے اور اسے اپنے عاشق کی بانہوں اور پہلو میں نہیں دکھا رہا یا وہ منظر نہیں دکھا رہا جو گزشتہ رات میں نے خود اپنے ولا ویلا کے باغ میں دیکھا تھا اور جو اب تک میرے دماغ کے پردے پر سلگ رہا تھا۔

میں انہی خیالات میں گم بیٹھا ہوا تھا کہ اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے چونک پڑا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہاز کا کپتان میرے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے سگریٹ پیش کی۔

"شوق فرمائیں گے سگنور؟" اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

میں نے میکانکی طور سے ہوانا کا بنا ہوا وہ خوشبو دار سگریٹ قبول کر لیا۔ "سگنور؟ یہ تم نے مجھے سگنور کیوں کہا جبکہ میں ایک معمولی سا ماہی گیر ہوں؟" میں نے اکھڑ پن سے پوچھا۔

پست قامت کپتان نے شانے اچکائے اور بڑے ادب سے تعظیماً میرے سامنے جھک گیا۔ اس کی اس حرکت میں نہ طنز تھا اور نہ مضحکہ خیزی۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ جو اس کی خوب صورت آنکھوں میں سے بھی جھانک رہی تھی اور جو اس کے زیتونی رنگ کے رخساروں میں دلفریب گڑھے بھی پیدا کر رہی تھی۔

"آ۔ ہاں۔ بالکل۔ بالکل۔ سنگور کہتے ہیں تو یونہی سہی۔ جیسی سگنور کی مرضی اور خوشی..... ما....." اور اس نے ایک بار پھر شانے اچکائے اور ایک بار پھر میرے سامنے تعظیماً جھک گیا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا اور قدرے سختی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

پرندے کی سرعت اور پھرتی سے، جو اس کی خصوصیت تھی، سسلی کا وہ ملاح ایک بار پھر میرے سامنے جھک گیا اور اس دفعہ اس نے اپنی انگلی میری کلائی پر رکھ دی۔

"اسکوسا، دی پرگو! لیکن یہ ہاتھ مچھلیاں پکڑنے والے کے نہیں ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ کپتان نے غلط نہ کہا تھا۔ میرے ہاتھ میرا راز کھول رہے تھے کہ وہ کسی طرح میرے بہروپ سے میل نہ کھاتے تھے۔

محنت کشوں اور ماہی گیروں کے ہاتھ ایسے خوب صورت اور نرم نہیں ہوتے، ان کے ہاتھ تو کھردرے اور بے ڈھنگے ہوتے ہیں۔ یہ پست قامت کپتان بے حد باریک بین اور ہوشیار تھا کہ اس نے میرے لباس اور ہاتھوں کے درمیان فرق دیکھ لیا تھا حالانکہ اب تک میں جن لوگوں سے ملا تھا ان میں سے کوئی بھی ایسا تیز نظر نہ تھا اور نہ ہی کسی نے اس طرف دھیان دیا تھا۔

کپتان کی بات نے پہلے تو مجھے گڑبڑا دیا لیکن ایک دو منٹ کے بعد میں نے اس کی نظر سے نظر ملائی، مسکرایا اور سگریٹ سلگا کر بے پروائی سے کہا۔

''ایسا نے!! اچھا تو پھر...... کیا میرے دوست؟''

اس نے اپنے ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھے مطمئن کرنا چاہتا ہو۔

''نہیں نہیں کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ سگنور میرے ساتھ بالکل محفوظ ہیں۔ میری زبان بڑی محتاط ہے اور میں صرف انہی چیزوں کے سلسلے میں زبان کھولتا ہوں جن کا تعلق مجھ ہی سے ہے۔ اس کا تو مجھے یقین ہے کہ سگنور نے جو یہ بھیس بدلا ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔ آ۔ دیو۔ بڑے دکھ ہیں۔ اس زندگی میں۔ بے شمار غم ہیں۔ مثلاً محبت ہے۔'' وہ اپنی انگلیوں پر شمار کرنے لگا۔ ''انتقام ہے، جھگڑے ہیں، روپے پیسے کی کمی ہے یا دولت گنوانا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی آدمی کو کسی بھی موسم میں ہر موسم میں جگہ جگہ بھٹکا سکتی ہے۔ ہاں بھائی! ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ سگنور مجھ پر بھروسہ کر کے میری کشتی میں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں سگنور کو اپنی بہترین خدمات کا یقین دلاتا ہوں۔''

اور اس نے اپنی ٹوپی اس دلفریب انداز سے اٹھائی اور ایسے خلوص اور صاف دلی سے میرے سامنے جھکا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے خاموشی سے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا جو اس نے اپنے ہاتھ میں ایسی گرم جوشی سے لیا کہ اس کے اس انداز سے احترام، ہمدردی اور دوستی ٹپکی پڑتی تھی۔ لیکن آپ کہیں گے کہ اس کے باوجود اس نے مجھ سے دگنا، تگنا، کرایہ وصول کیا۔ بے شک لیکن اب وہ مجھے بلیک میل کر کے بیس گنی زیادہ رقم وصول کرسکتا تھا جو اس نے نہ کیا۔ بلکہ حد تو یہ ہے۔ اور یہ اس کی صاف دلی کا ثبوت ہے کہ اس نے بڑی مہارت سے موضوع بدل دیا اور جو سگریٹ ہم پی رہے تھے اس کے تمباکو کے متعلق باتیں کرنے لگا۔

''بہت اچھی تمباکو ہے۔ ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت عمدہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ بے شک تمباکو بہت اچھی تھی۔

وہ خوش دلی سے مسکرایا اور اس کے خوب صورت سفید دانت چمک گئے۔

''ہونی ہی چاہئے کیونکہ یہ اس شخص کا تحفہ ہے جس نے بہترین برانڈ کے ہی سگریٹ پئے ہیں۔''

''آ۔ دیو! بے حد عمدہ او تعریف... حالانکہ لٹیرا ہے۔''

''کون؟'' ''کارمیلو یزی۔''

میں حیرت سے چونک پڑا۔ قسمت کی عجیب ستم ظریفی کہ اس نے مجھے اس مشہور ڈاکو سے یوں وابستہ کردیا تھا۔ اس وقت میں اسی کا دیا ہوا سگار پی رہا تھا۔ میری موجودہ ساری دولت وہی تھی جو اس نے لوٹ لوٹ کر میرے خاندانی مقبرے میں اکٹھی کی تھی۔ چنانچہ میں جو کچھ تھا اور جتنا امیر تھا اسی ڈاکو کارمیلو یزی کی وجہ سے تھا۔

''تو پھر تم اس ''کارمیلو یزی کو جانتے ہو؟'' میں نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔

''جانتا ہوں؟ ارے صاحب میں اس سے اتنا ہی واقف ہوں جتنا اپنے آپ سے۔''

''کب سے جانتے ہو؟''

''کب سے؟ یہی کوئی دو مہینے ہوئے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ آج سے دو مہینے پہلے وہ اسی کشتی پر میرے

ساتھ تھا۔ اب سگنور پوچھیں گے کہ یہ کیسے ہوا۔ سو میں سگنور کو شروع سے پورا واقعہ سناتا ہوں۔ سگنور بیزار تو نہ ہوں گے؟''

''بالکل بھی نہیں۔''

''تو یہ آج سے کوئی دو مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔ میں جائیتا میں تھا۔ کارمیلو میرے پاس آیا اور کہا کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے اپنے جہاز میں ''ترمینی'' پہنچا دوں جہاں سے وہ ''مانتے ماجوری'' کے پہاڑوں میں چلا جائے گا جہاں اس کی پناہ گاہ تھی اور اس خدمت کے عوض اس نے مجھے اپنا بہت سا سونا پیش کیا کہ اتنی دولت میں نے کم سے کم اس جنم میں تو کبھی نہ دیکھی تھی۔ خیر۔ تو وہ تریسا کو لے کر آیا۔ میں کشتی پر اکیلا تھا۔ میرے عملے کے آدمی ساحل پر بستی میں گئے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔

''مجھے تردینی لے جاؤ اور میں تمہیں اتنا روپیہ دوں گا اور اگر انکار کیا تو تمہیں ذبح کردوں گا۔'' ہا۔ ہا۔ ہا۔ بڑے مزے کی بات کہی تھی یہ اس نے۔ ارے۔ صاحب! میں تو اس کے منہ پر ہنس دیا۔ میں نے تریسا کے بیٹھنے کے لئے عرشے پر ایک کرسی رکھ دی اور اسے کھانے کے لئے چند بڑے بڑے شفتالو دیئے اور پھر کارمیلو سے کہا۔ ''دیکھو میرے دوست کارمیلو! دھمکیاں دینے سے کیا فائدہ، نہ تو مجھے ذبح کرو گے اور نہ ہی میں تم سے غداری کروں گا۔ تم چور ہو اور بہت بڑے چور ہو کہ خوامخواہ مجھے ڈرا دھمکا رہے ہو۔ تم تو کسی سرائے کے مالک سے بھی زیادہ گرے ہوئے ہو میرے بھائی (کیونکہ تم جانو سگنور کہ سرائے میں داخل ہونے کے بعد تم اس وقت تک گلو خلاصی حاصل نہیں کرسکتے جب تک تاوان ادا نہ کردو۔) اور میں نے اس سے کہا۔

''کارمیلو! مجھے دولت نہیں چاہئے بلکہ تمہاری دوستی چاہئے۔ تم مجھے اتنا ہی روپیہ دے دو جتنا کہ ترمینی تک کا کرایہ بنتا ہے اور میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا، کسی اور وجہ سے نہیں تو تریسا کی خاطر ہی سہی۔''

میری یہ بات سن کر کارمیلو کو تعجب ہوا۔ پھر وہ مسکرایا، اپنی مخصوص پراسرار مسکراہٹ جس کا مطالبہ احسان مندی بھی ہوسکتا تھا یا خون اور قتل بھی۔ اس نے تریسا کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر سے یوں اٹھی کہ اس کی گود میں رکھے ہوئے شفتالو عرشے پر بکھر گئے۔ اس نے اپنے دونوں نازک ہاتھوں میں میرے ہاتھ لے لئے، اس کی خوب صورت نیلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بولی۔

''تم بہت اچھے آدمی ہو۔ بہت ہی اچھے۔ کسی عورت کو تم سے بہت زیادہ محبت ہوگی یا ہونی چاہئے۔'' تریسا نے مجھ سے کہا۔

''اور یہ اس نے سچ کہا تھا اور جس کے لئے میں مادر مقدس مریم کا مشکور ہوں۔''

''بڑے خوش قسمت اور سکھی آدمی ہو تم۔'' میں نے اپنے ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ لا کر کہا۔ ''کیونکہ تمہاری زندگی اور کشتی کے لئے بھی، راہبر ستارہ موجود ہے۔ یعنی ایک عورت جو تم سے پیار کرتی ہے اور وفادار بھی ہے۔ ہے نا؟''

اس نے احتراماً سر سے ٹوپی اتار کر میرے سوال کا براہ راست اور مختصر جواب دیا۔

''ہاں۔ سنگور۔ اور وہ عورت میری ماں ہے۔''

میں اس کے اس بے تصنع اور خلاف توقع جواب سے بے حد متاثر ہوا اور میرے دل میں تلخ تاسف کی ایک لہر سی اٹھی۔ کیوں۔ ہائے کیوں میری ماں اس قدر جوان مری۔ پس اس شفقت، اس پیار اور اس روحانی مسرت و سکون سے محروم رہا جو اس ادنیٰ ملاح کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔ اب میں کیوں اکیلا رہوں گا اور مرتے دم تک ایک عورت کے جھوٹ کا بوجھ برداشت کرتا رہوں گا اور اس کی بے وفائی مجھے آخر تک غمزدہ اور مایوس رکھے گی......؟ کیوں۔ ہائے کیوں میری زندگی لعنتی بن گئی ہے؟

شاید میرے بشرے سے میری دلی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا کیونکہ کپتان نے پوچھا۔

''سگنور کی والدہ نہیں ہیں؟''

''ابھی میں بچہ ہی تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔''

میں نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ اس کی یہ خاموشی ہمدردی کی تھی۔ چنانچہ اسے اس دوستانہ الجھن سے نجات دلانے کی غرض سے میں نے کہا۔

''تم نے تریسا کا ذکر کیا تھا۔ کون ہے یہ تریسا؟''

''سگنور! تمہارے اس سوال کا جواب میں کیا دوں؟ کوئی نہیں جانتا کہ تریسا کون ہے۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ کارمیلو بیزی سے پیار کرتی ہے۔ اس قدر پیاری اور نازک نازک سی عورت ہے وہ کہ انگلی لگنے سے مرجھائے اور کارمیلو..... سگنور! تم نے دیکھا ہے کارمیلو کو؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ایبانے! کارمیلو کیم کیم، اکھڑ اور جنگل کے ریچھ کی طرح کالا ہے۔ بلکہ ریچھ ہے بالکل کہ اس کے بدن پر بال ہی بال ہیں اور دانت بھی ریچھ کے دانتوں جیسے ہیں۔ اور تریسا۔ تم نے رات کے وقت بادل کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا ہے جو چاند کے قریب سے گزرتا ہے تو سنہری گالا سا بن جاتا ہے، سنہری اور سفید؟ بس یہ ہے تریسا۔ وہ ایک بچے کی طرح نازک نازک اور چھوٹی چھوٹی ہے، اس کے بال ملائم اور لہرادار ہیں، پہاڑی جھیل کی سی پاک اور شفاف آنکھیں ہیں، سفید اور نازک ہاتھ ہیں، اتنے نازک کہ خشک ٹہنی بھی نہ توڑ سکیں تاہم وہ کارمیلو کے لئے اور اس کے ساتھ مل کر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کارمیلو کی زندگی کی بس یہی ایک کمزوری ہے۔ تریسا۔ اس کے دل کا یہی ایک نرم گوشہ ہے۔''

''پتہ نہیں وہ اس کی وفادار بھی ہے یا نہیں۔'' میں نے کچھ اپنے آپ سے اور کچھ اونچی آواز میں کہا۔

کپتان نے میرے یہ الفاظ سن لئے اور حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''وفادار؟ آ آ۔ دیو۔ سگنور تریسا سے واقف نہیں ہے اسی لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ کارمیلو کے ہی گروہ کا ایک آدمی تھا۔ بے حد دلیر، زبردست گاٹو اور خوبرو۔ وہ تریسا کا دیوانہ تھا۔ وہ جہاں بھی جاتی وہ اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ ایک دن تریسا اسے اکیلی مل گئی۔ اس نے اس کو..... تریسا کو اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کی۔ تریسا نے خود اسی بدمعاش کے چاقو سے خنجر گھسیٹ کر غضبناک دیوی کی طرح اس پر وار کر دیا۔ اس وار سے وہ اس وقت تو نہ مرا لیکن بعد میں کارمیلو نے اسے قتل کر دیا۔ ایسی ننھی سی عورت میں ایسے شیطان کا ہونا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تریسا کا یہ دعویٰ ہے کہ کارمیلو کے علاوہ کسی نے اس کو تو ایک طرف رہا اس کے بال کی ایک لٹ کو بھی نہیں چھوا۔ بے شک وہ کارمیلو کی وفادار ہے..... اور یہی بڑے افسوس کی بات ہے۔''

''کیوں؟ تم نہیں چاہتے کہ وہ اس کی وفادار رہے؟''

''نہیں نہیں۔ بے وفا عورت تو موت کی مستحق ہوتی ہے..... تاہم افسوس تو اس بات کا ہے کہ تریسا نے کارمیلو جیسے آدمی کو اپنا محبوب بنایا.....''

''تو کیا ہوا اس میں؟''

''ایک نہ ایک دن وہ قانون کی گرفت میں ہوگا اور پھر وہ عمر بھر کے لئے سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا اور تریسا مر جائے گی.....''

''یہ تو تم بڑے یقین سے کہہ رہے ہو!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''بے شک۔ اگر صدمے اور غم نے اس کا خاتمہ نہ کر دیا تو پھر وہ یقیناً خودکشی کر لے گی۔ دیکھنے میں وہ پھول کی طرح نازک اور کمزور ہے لیکن اس کی روح آہن کی طرح مضبوط ہے۔ جس طرح محبت میں وہ آپ اپنی مالک رہی ہے اسی طرح موت پسند کرنے میں بھی خود مختار رہے گی۔ ہاں بھئی۔ اکثر عورتوں کو خدا نے ایسا ہی بنایا ہے..... اور عموماً وہی عورتیں سب سے زیادہ دلیر ہوتی ہیں جو بظاہر کمزور ہوتی ہیں۔''

اور یہاں ایک ملاح اپنے آقا سے چند احکامات لینے آ گیا اور ہماری گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ باتونی کپتان نے مسکرا کر اور جھک کر مجھ سے معذرت طلب کی اور سگریٹوں کا پیکٹ میرے پاس رکھ کر اور

مجھے اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں چھوڑ کر چلا گیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے تنہائی کی سخت ضرورت بھی تھی۔

مجھے اطمینان کا وقفہ چاہئے تھا جس میں میں یکسوئی سے سوچ سکتا۔ حالانکہ میرے خیالات ایک نئے نظام شمسی کی طرح صرف ایک جلتے ہوئے مرکز کے گرد گردش کر رہے تھے..... انتقام.....

''بے وفا عورت تو موت کی مستحق ہوتی ہے۔'' سسلی کے ان پڑھ باشندے اس اکھڑ کپتان نے بھی یہی کہا تھا۔

''جاؤ اور مارڈالو اسے۔ جاؤ اور مارڈالو اسے۔'' یہ الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ یہاں تک کہ بے خیالی میں میری زبان بھی انہیں ادا کرنے لگی۔

''جاؤ اور مارڈالو اسے۔ جاؤ اور مارڈالو اسے۔'' میں اونچی آواز میں تکرار کر رہا تھا۔

اس عورت تریسا کے متعلق سوچا تو میری طبیعت بگڑنے لگی۔ ایک ایسے کم ذات اور ظالم لٹیرے کی معشوقہ اور داشتہ جس کا نام ہی بدن پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ سنگدلی اور ظلم کا دوسرا نام ہی کارمیلو بیزی تھا۔ اور پھر وہ خوب صورت بھی نہ تھا بلکہ بدہیئت اور بدصورت تھا۔ بقول کپتان، ریچھ تھا۔ ہاں ایسے آدمی کی داشتہ اور اس نے اپنے آپ کو دوسرے آدمیوں کے بس سے بچا رکھا تھا۔ اسے فخر تھا اس بات پر کہ وہ پاکباز تھی اور اپنے پہاڑی بھیڑیے کی وفادار تھی، اس آدمی کی جو عیار تھا اور جس کے مزاج کا کچھ ٹھیک پتہ نہ تھا۔ وہ اپنے خونی اور پتھر دل محبوب کی وفادار تھی اس کے علاوہ کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تک نہ تھی۔

اور نینا..... ایک شریف، اعلیٰ خاندان اور صحیح النسب رئیس کی بیوی۔ جس نے باعزت اور باقاعدہ شادی کا شریفانہ تاج اپنے سر سے اتار کر خاک دھول میں پھینک دیا، ایک قدیم خاندان کے وقار اور عزت کو اپنے پیروں تلے روند دیا، جو اس قدر گر گئی کہ یہ کم درجہ عورت تریسا، سب کچھ جان لینے کے بعد، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے سے یہ کہہ کر انکار کرے گی کہ وہ ناپاک ہے۔

''خدایا! ایسا تو اس کارمیلو بیزی نے کیا کیا ہے کہ اسے ایک عورت کا سچا پیار اور ہیرے جیسا دل اور قابل فخر وفاداری ملی اور اس نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اس کے عوض میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا کہ میں انتقام لینے پر تل گیا؟''

یکایک مجھے اپنی بچی یاد آ گئی۔ اس کی یاد نور کی ایک شعاع کی طرح میرے دل میں اتر آئی۔ میں تو قریب قریب اسے بھول ہی گیا تھا۔ میری ننھی اور معصوم کلی اسٹیلا۔

اور اس کا معصوم چہرہ مسکراتی ہوئی آنکھوں اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ جو ہمیشہ میرے بوسے کے لئے نیم وا رہتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے تو میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل کر میرے گالوں پر بہنے لگے۔

''کیا کروں اس کا؟''

انتقام کی اس تجویز پر، جس کا مکمل ترین نقشہ میں نے تیار کر لیا تھا۔ عمل کر کے اسے انجام تک پہنچا دوں گا تو اسٹیلا کا کیا ہوگا؟ کیا میں اسے اپنے ساتھ دور۔ بہت دور۔ دنیا کے کسی گوشے میں لے جاؤں گا۔ اپنی زندگی وقف کر دوں گا اس کے لئے؟

ہائے! وہ بھی تو ایک عورت تھی اور خوب صورت بھی۔ ایک ایسا پھول جو زہریلی زمین پر کھلا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے دل کو بھی گھن لگا ہوا نہیں ہے جو بلوغت کے لمس کا منتظر ہے کہ ادھر بلوغت چھوئے اور وہ اپنا تباہ کن کام شروع کر دے۔

میرے دوستو! اے مردو! سنبھلو کہ خوب صورت اور بے وفا عورتوں کے روپ میں زہریلے سانپ تمہاری زندگی سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اور اگر ان سے خدا نے تمہیں اولاد دی ہے تو پھر یہ تمہارے لئے دوہری لعنت ہے۔ اسے سماج کی نقاب میں، جو ہم پہننے پر مجبور ہیں، کتنا ہی چھپاؤ تم اس کرب اور اذیت اور نفرت اور

غصے کو بہر حال نہ دبا سکو گے جو اس وقت ابھر آئے گا۔ جب ایک فرشتہ کا سا معصوم بچہ اپنی پیار بھری اور اعتبار سے بھرپور نگاہیں تمہاری مکار اور بے وفا بیوی کی آنکھوں میں ڈال کر اسے مقدس لفظ ''ماں'' پکارے گا۔ خدا کی قسم اس وقت تم جو کڑواہٹ اور تلخی محسوس کرو گے وہ راکھ پھانک کر اور نیم کے پتے چبا کر بھی محسوس نہ کرو گے بلکہ اس کے مقابلے میں وہ تمہیں میٹھے معلوم ہوں گے۔

اس رات میں عرشے پر ہی سویا۔

کپتان نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے چھوٹے سے کیبن میں سو سکتا ہوں۔ بلکہ اس پر اس نے اصرار کیا لیکن میرے انکار پر اس کے ہمدرد دل کو ٹھیس پہنچی اور وہ اداس ہو گیا۔

''چاندنی راتیں ہوں تو کھلے آسمان کے نیچے سونا مناسب نہیں۔'' وہ بولا۔ ''کہتے ہیں کہ ایسی راتوں میں آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔''

میں مسکرایا۔ اگر میری قسمت میں پاگل ہونا لکھا ہوتا تو گزشتہ رات میں پاگل ہو گیا ہوتا۔

''تم فکر نہ کرو میرے دوست۔'' میں نے کہا۔ ''چاندنی تو مجھے سکون اور مسرت بخشتی ہے۔ اس کا اثر میرے دماغ پر سوائے سکون کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں یہاں اطمینان سے گہری نیند سوؤں گا۔ چنانچہ تم میری فکر نہ کرو۔''

وہ چند ثانیوں تک شش و پنج کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر ایک دم سے پلٹ کر چل دیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ گرم کمبل لئے واپس آ چکا تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے شکریہ کے ساتھ کمبل قبول کر لیا۔ کپتان خوش ہو گیا۔ اس نے مجھے شب بخیر کہا اور کوئی گیت گنگناتا ہوا عرشے کا زینہ اتر کر اپنے کیبن کی طرف چلا گیا۔

میں اوڑھ لپیٹ کر لیٹ گیا۔ نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف رات کا سکوت طاری تھا۔ اندھیرے آسمان میں تارے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ نیچے سمندر کی لہریں کشتی کے پہلوؤں کو تھپیڑے دے رہی تھیں۔ ''لپ۔ لپ۔ لپ۔'' میری جگہ کوئی اور ہوتا یا خود میرے لئے حالات مختلف ہوتے تو یہ آواز مجھے لوریاں دے کر اور کشتی کا ہولے ہولے ڈولنا مجھے جھولا جھلا کر سلا دیتا۔ لیکن اس وقت تو میرے دل میں انتقام کی جوالا بھڑک رہی تھی، خیالات دماغ میں غول بیابانی کی طرح چیخ رہے تھے اور میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

''دنیا کا کوئی قانون میری عزت کے پھٹے ہوئے دامن کو رفو نہیں کر سکتا۔ چنانچہ...... اب میں ہی قانون ہوں میں ہی منصف ہوں، میں ہی جیوری ہوں...... اور...... میں ہی جلاد ہوں۔ اور مجرموں کے لئے جو سزا میں نے مقرر کی ہے اس سے بڑھ کر کوئی دوسری سزا نہیں اور جو عذاب میں انہیں دوں گا اس سے بڑھ کر کم سے کم اس دنیا میں کوئی دوسرا عذاب نہیں۔''

اور یہ کہہ کر مسکرایا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند پھر بھی نہ آئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ہوا موافق رہی اور سورج غروب ہونے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہم پالیرمو پہنچ گئے۔

ابھی ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا ہی تھا کہ بندوقوں اور پستولوں سے مسلح افسروں اور پولیسوں کا ایک دستہ جہاز پر چڑھ آیا اور جہاز کی تلاشی کا پروانہ کپتان کو دکھاتے ہوئے بتایا کہ انہیں کارمیلو یزی کی تلاش ہے۔

مجھے اپنے دوست کپتان کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی کہ خدا جانے وہ پھنس جائے گا یا اسے گرفتار کر لیا جائے گا یا جانے کیا ہو گا۔ لیکن وہ ذرا بھی پریشان نہ تھا بلکہ اس نے مسکرا کر سرکار کے ان مسلح [illegible] کو خوش آمدید کہا اور ان کی آمد پر خوشی کا یوں اظہار کیا جیسے وہ اس کے گہرے دوست ہوں۔

اس نے ان لوگوں کے لئے چیانتی شراب کی بوتل کھولتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ لوگ میری رائے پوچھتے ہیں تو میرے خیال میں وہ بدمعاش کارمیلو جائینا میں کہیں ہے۔ میں آپ لوگوں سے جھوٹ نہ کہوں گا۔ اس سے مجھے کیا فائدہ؟ ایں؟ میں تو ہر طرح آپ کی مدد کرنے کو

تیار ہوں...... اور کروں گا۔''

ایک افسر نے مشکوک نظروں سے کپتان کو دیکھا۔ ''لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے۔'' وہ ٹھیٹھ کاروباری لہجے میں بولا۔ ''کہ دو مہینے ہوئے کارمیلو جائینا سے فرار ہو گیا ہے اور یہ کہ نیپلز اور پالیرمو تک کی ساحلی بستیوں کا چکر لگانے والے لاورا نامی ایک تجارتی جہاز کے کپتان نے فرار ہونے میں اس کی مدد کی ہے اور یہ کہ اس کپتان کا نام آندرے لوزانی ہے۔ تم آندرے لوزانی ہو اور یہ جہاز لاورا ہے...... چنانچہ ہم صحیح جہاز پر آئے ہیں۔ اس سے تو تمہیں انکار نہ ہو گا۔ کیوں؟''

''واہ بھئی! واہ! آپ لوگ تو گویا کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتے۔'' کپتان نے اس افسر کے شانے پر خوش دلی اور بے تکلفی سے ہاتھ مار کر کہا۔ ''اگر کہیں جنت کا داروغہ رضوان بدمذاقی کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کے لئے جنت کا دروازہ بند کر دے تو آپ اتنے چالاک ہیں کہ جنت میں داخل ہونے کا دوسرا اور بہتر دروازہ تلاش کر لیں گے۔ بے شک میرا ہی نام آندرے لوزانی ہے اور یہی لاورا نامی کشتی ہے۔ لیکن دوسری باتوں میں'' اور اس نے انکار کے اشارے کے طور پر اپنی شہادت کی انگلی ہلائی۔ ''آپ غلط ہیں۔ ایک دم غلط ہیں۔'' اور اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''بے شک غلط...... لیکن اس بات پر ہم بحث اور جھگڑا نہ کریں گے۔ کیا فائدہ؟ خیر یہ لو۔ تھوڑی سی چیانتی اور پیو۔ میں جانتا ہوں بھئی کہ ڈاکوؤں کو تلاش کرنا بڑا ہی گلا خشک کر دینے والا کام ہے۔ بھئی! آپ سب اپنے اپنے گلاس بھر لیں۔ بوتل خالی کر دو یارو...... نیچے گودام میں ابھی بیس بوتلیں اور ہیں۔''

افسر لوگ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے اپنے لبریز گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لئے۔ ایک افسر نے، جو کہ ان سب میں کم عمر تھا، کپتان آندرے کی طرف گویا دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کو پھنسا کر باتوں باتوں میں راز اگلوا لے گا۔

''شاباش آندرے! بڑے دل والے ہو تم۔'' وہ بولا۔ ''چنانچہ آؤ، ہم سب دوست بن جائیں۔ اس کے علاوہ کسی ڈاکو کو بطور مسافر اپنے جہاز پر جگہ دینا کوئی بری بات تو نہیں۔ وہ تو تمہارے لئے ایک مسافر ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ایسا مسافر عام مسافروں سے کچھ زیادہ ہی دے مرتا ہے۔''

لیکن آندرے یوں پھنسنے والا نہ تھا۔ اس نے قابل تعریف ایکٹنگ کی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دیدے یوں گھمائے جیسے اس کے دل کو سخت دھکا لگا ہو۔

''مقدس ماں اور تمام ولی آپ کو معاف کریں کہ آپ نے ایسی بات کہی۔'' وہ بولا۔ ''میں تو ایک ایماندار اور مذہبی ملاح ہوں۔ میں بھلا ایک لعنتی لٹیرے سے رشوت لوں گا؟ توبہ۔ توبہ۔ یہ تو حرام کی کمائی ہوئی۔ اگر میں نے ایسا کیا کبھی تو پھر بدقسمتی میرا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کارمیلو یزی کو نہیں جانتا اور اس کے متعلق بھی کچھ نہیں جانتا۔ آپ لوگ دعا کریں کہ میری اس کی مڈبھیڑ کبھی نہ ہو۔ توبہ۔ توبہ۔''

اس نے یہ الفاظ ایسی صاف دلی اور بظاہر پارسائی سے کہے کہ افسر الجھن میں پڑ گئے۔ اس کے باوجود انہوں نے جہاز کی تلاشی لی۔ اپنی اس مہم کی ناکامی کی خجالت چھپانے کے لئے انہوں نے جہاز پر موجود ہر شخص سے، جس میں میں بھی شامل تھا، پوچھ تاچھ کی۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کا بھی کوئی اطمینان بخش نتیجہ ظاہر نہ ہوا۔

خوش قسمتی سے انہوں نے میرے لباس کو میرے پیشے سے ہی منسوب کر کے مجھے ایک غریب ماہی گیر ہی یقین کر لیا۔ حالانکہ انہوں نے حیرت اور تجسس سے میرے سفید بالوں کی طرف دیکھا لیکن کوئی مشتبہ بات نہ دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔

کپتان آندرے کی مزید مہمان نوازی اور پرجوش معذرت خواہی کے بعد وہ لوگ شکست خوردہ سے رخصت ہوئے اور اس یقین کے ساتھ کہ کارمیلو یزی کے متعلق انہیں جو اطلاع ملی تھی وہ غلط تھی۔

وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہوئے ہی تھے کہ کپتان آندرے کھلنڈرے بچے کی طرح چٹکی بجا بجا کر پورے عرشے پر خوشی سے ناچنے لگا۔

''پارہا کو!'' وہ جھوم کر بولا۔ ''یہ لوگ اعترافات سننے والے پادری سے تو کسی کا راز اگلوا سکتے ہیں لیکن مخلص آندرے لوزانی کی زبان نہیں کھلوا سکتے اور اس آدمی کے بارے میں کچھ نہیں پتہ کر سکتے جس نے مجھے ایسے عمدہ سگریٹ دیئے ہیں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ جائینا جاؤ اور چپہ چپہ اور گوشتہ گوشہ تلاش کرلو۔ کارمیلو تو مانتے میگاروں میں اپنے مزے سے آرام کرتا رہے گا اور کسی سرکاری کتے کا سایہ تک اس کے آرام میں خلل انداز نہ ہوگا۔''

اس وقت خدا حافظ کہنے کے لئے میں اس کی طرف بڑھا تو وہ میری طرف گھوم گیا۔

''آہ! سگنورا'' وہ بولا۔ ''مجھے واقعی افسوس ہے کہ تم ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ تم تو مجھے الزام نہیں دے رہے نا کہ میں نے ایک ایسے شخص کا راز راز رکھا جس نے مجھ پر اعتبار کیا تھا؟''

''نہیں تو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بلکہ میں تو کہوں گا کہ کاش کہ دنیا میں اور بھی تم۔ آدمی ہوتے تو پھر یہ دنیا کچھ تو بہتر بنتی۔ آ۔ دیو! اور اس کے ساتھ میرا شکریہ بھی قبول کرو۔'' اور میں نے اسے وہ کرائے کی رقم ادا کردی جو ہمارے درمیان طے پائی تھی۔ ''میں تمہاری ہمدردی اور مہربانی کو کبھی فراموش نہ کروں گا..... اور ہاں اگر تمہیں کبھی کسی بھلے برے حال میں دوست کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھے بلا بھیجنا۔''

''لیکن۔'' اس نے کچھ تجسس سے اور کچھ سادگی سے کہا۔ ''اگر سگنور نے مجھے اپنا نام نہ بتایا تو میں انہیں کہاں اور کیسے تلاش کروں گا ضرورت کے وقت؟''

گزشتہ رات میں اسی مسئلے پر غور کرتا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بہروپ کے ساتھ ساتھ ایک نیا نام رکھنا بھی ضروری تھا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اس لڑکے کا نام جو اسکول میں میرا ہم جماعت تھا، جو میرا دوست رہا تھا اور جو ''پینشین لیدو'' نہر میں نہا رہا تھا تو ڈوب گیا تھا۔

چنانچہ اب میں نے آندرے کے سوال کا جواب فوراً اور بلا جھجک دیا۔

''کونٹ سیزر اولادیا کے لئے پوچھنا اور لوگ تمہیں مجھ تک پہنچا دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''میں جلد ہی نیپلز لوٹ جاؤں گا اور وہیں تمہیں ملوں گا۔ چنانچہ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بے تکلف چلے آنا۔''

سسلی کے اس باشندے آندرے لوزانی نے اپنی ٹوپی اتار کر اور جھک کر مجھے سلام کیا۔

''تو میرا خیال غلط نہ تھا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''یعنی یہ کہ سگنور کے ہاتھ میری ماہی گیروں کے ہاتھ نہیں ہیں۔ صاحب! میں تو ایک ہی نظر میں شریف اور مہذب آدمی کو پہچان لیتا ہوں حالانکہ ہم سسلی والے کتے ہیں کہ ہم سب ہی شریف آدمی ہیں۔ اچھی ڈینگ ہے لیکن افسوس کہ صحیح نہیں ہے۔ اے ریواردارسی، سگنورا خیر۔ جب بھی میری خدمت کی ضرورت ہو مجھے حکم کرنا۔ میں خادم ہوں آپ کا۔''

اور میں اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر ساحل پر کود گیا۔

''اے ریواردارسی!'' میں نے ساحل پر کپتان کی طرف ہاتھ ہلایا۔ ''شکریہ۔ ہزار بار شکریہ۔''

''اور یوں میں اس سے اس کے چھوٹے سے جہاز پر اس طرح کھڑا چھوڑ کر رخصت ہوا کہ وہ ننگے سر تھا، ٹوپی اس کے ہاتھ میں تھی اور اس کے چہرے پر دوستی اور ہمدردی کی تمازت تھی، مخلص اور خوش دلی بدمعاش جس کے گناہ اور ثواب اچھائی اور برائی کے عقائد گڈمڈ تھے۔ اس کے باوجود اس کے جھوٹ ہمارے مخلص دوستوں کے سچ سے ہزار گنا بہتر تھے اور قارئین یقین کریں کہ کراماً کاتبین جو ہمارے اعمال لکھتے ہیں، ایسے جھوٹ میں جو کسی کی زندگی بچاتا ہے اور ایسے سچ میں جو کسی کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے فرق کرنا جانتے ہیں اور اسی مناسبت سے آسمانی جزا و سزا مقرر کرتے ہیں۔

پالیرمو کے بازار میں پہنچا تو سب سے پہلی فکر اپنے لباس کی ہوئی جو بہترین کپڑے کا اور بہترین سلا ہوا ہو اور ایسا ہو جیسا کہ رئیس اور نواب پہنتے ہیں۔

میں ایک درزی کی دکان میں بلا جھجک گھس پڑا اور اسے بتایا کہ محض دل لگی کی خاطر میں ماہی گیروں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور عارضی طور پر ان کا لباس پہن کر ان کی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔

شاید وہ میری اس کہانی پر یقین نہ کرتا لیکن جب میں نے اسے کئی سوٹ بنانے کا آرڈر دیا، اپنا نام کونٹ سیزر اولادیا بتایا اور شہر کے بہترین ہوٹل کا پتہ دیا تو وہ تو بچھ بچھ گیا۔ اس نے بڑی فرمانبرداری اور خاکساری سے میری خدمت کی۔ حتیٰ کہ اپنا نجی عقبی کمرہ بھی میرے استعمال کے لئے کھول دیا۔

اس کمرے میں پہنچ کر میں نے ماہی گیر کا لباس اتار کر ایک خاندانی شریف اور رئیس کا لباس پہن لیا۔ یہ ایک سلا ہوا تیار سوٹ تھا جو خوش قسمتی سے مجھے بالکل فٹ تھا۔

چنانچہ یوں اپنی حیثیت کے مطابق عمدہ لباس پہن کر میں ایک رئیس بن کر درزی کی دکان سے نکلا اور پالیرمو کے سب سے بڑے بہترین اور مہنگے ہوٹل میں چند ہفتوں کے لئے کمرے حاصل کر لئے..... اور یہ چند ہفتے میرے وہ تھے جو انتقام لینے کی تیاریوں میں بے حد مصروف گزرے۔

سب سے پہلا اور اہم کام یہ تھا کہ وہ سارا روپیہ، جو میرے پاس تھا، حفاظت سے رکھ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے پالیرمو کے سب سے بڑے، مشہور اور گویا مرکزی بینکر کو تلاش کر لیا۔ اس سے میں نے اپنے نئے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ کئی برسوں کے بعد میں سسلی واپس لوٹا ہوں۔

بینکر نے خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور حالانکہ میرے پاس اتنی بہت سی دولت دیکھ کر، جو میں ساتھ لایا تھا۔ وہ حیران ضرور ہوا۔ تاہم وہ میری دولت کو بہ حفاظت رکھنے کا انتظام کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور دوسری تھیلی کے جواہرات جن میں زیادہ تر غیر معمولی حجم کے تھے، دیکھ کر تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور اس کے منہ سے تعریفی کلمات کے سوتے پھوٹ بہے۔ اس پر میں نے اصرار کر کے ایک بڑا ناتراشیدہ زمرد اور دو ناتراشیدہ ہیرے دیئے اور کہا کہ ان کی وہ خود اپنے لئے انگوٹھیاں بنا لے۔

ظاہر ہے کہ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا۔ لیکن ان جواہرات نے اس کے دل میں جو لالچ پیدا کر دی تھی وہ آخر کار غالب آ گئی اور اس نے میری دریا دلی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھنے کے بعد یہ قیمتی جواہرات قبول کر لئے اور دیر تک میرا شکریہ ادا کرتا رہا۔

میری اس رشوت کا یہ اثر ہوا کہ اس نے نہ تو میری شناخت کے سلسلے میں کوئی گواہ لانے کو کہا اور نہ ہی ضمانت طلب کی۔ آپ جانئے اگر وہ یہ قانونی کارروائی کرتا تو میں حقیقت میں بڑی مشکل میں پھنس جاتا۔ کیونکہ اپنی موجودہ حالت یعنی بدلے ہوئے بھیس میں، کسی بھی گواہ اور ضامن کو تلاش کرنا میرے لئے اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوتا۔

یہ کام اطمینان بخش طور سے ہو گیا تو اب میں دوسرے اہم کام کی طرف متوجہ ہوا۔ یعنی یہ کہ اپنے آپ کو وضع قطع، چال ڈھال، اخلاق و عادات، لب و لہجے اور ظاہری صورت و شکل میں اس طرح بدل دیا جائے کہ کونٹ سیزر اولادیا اور گزرے ہوئے فابیو رومانی کے درمیان ذرہ برابر بھی مشابہت نہ رہے۔

مونچھیں تو میں شروع سے ہی رکھتا تھا جو کہ اب بالوں کے ساتھ سفید ہو گئی تھیں۔ چنانچہ اب میں نے داڑھی چھوڑ دی۔ اور داڑھی بھی جیسی کہ توقع تھی، سفید ہی ہو گی۔

لیکن میری ''بزرگی'' کی ان ظاہری نشانیوں کے مقابلے میں میرا چہرہ بالکل جوان اور بھرا بھرا تھا جس پر اب جوانی کی چمک اور حیات کی دمک آنے لگی تھی، میری آنکھیں جو بڑی اور خوب صورت تھیں۔ ''موت سے پہلے'' والی اصلیت پر آنے سے جھانکتی ہوئی وہی دلیری اور سرکشی..... اور میں سمجھتا ہوں جو بھی مجھے میری ''موت'' سے پہلے جانتا تھا اور میرے مزاج اور خصوصیت سے واقف تھا وہ ان آنکھوں کے ذریعے

مجھے پہچان سکتا تھا یا وہ باتیں کہہ رہی تھیں جنہیں بھول جانا ضروری تھا۔ وہ راز نہ کھلے جس کا راز ہی رہنا نہایت ضروری ہے۔

''تو پھر اب میں ان آنکھوں کا کیا کروں جو کہانیاں بیان کررہی تھیں؟''

اس سوال پر میں نے غور شروع کیا اور جلد ہی ایک فیصلہ کرلیا۔

اپنی نظر کو کمزور ظاہر کرنا آسان تھا۔ میں کہہ سکتا تھا کہ میری آنکھیں اتنی کمزور ہیں کہ دھوپ اور روشنی برداشت نہیں کرسکتیں۔

چنانچہ میں دھوئیں کے رنگ کا چشمہ لگالوں گا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے ایک کالا چشمہ خرید لیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اور آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر چشمہ لگایا تو...... نتیجہ خاطر خواہ اور اطمینان بخش تھا...... یہ کالا چشمہ میرے بہروپ میں جو کمی تھی اسے پوری کرکے میرے بہروپ کو، میری بدلی ہوئی شخصیت کو مکمل کررہا تھا۔

سفید بال، سفید مونچھیں، سفید داڑھی اور کالی عینک کی وجہ سے میں ایک آسودہ حال اور خوش باش پچاس سالہ آدمی دکھائی دیتا تھا۔ جو ہر طرح سے تندرست تھا البتہ کوئی بیماری تھی تو وہ آنکھوں کی کمزوری تھی۔

یہ تو گویا۔ اب مجھے اپنی آواز بدلنی تھی۔

میری آواز غیر معمولی طور پر نرم تھی اور میں قدرے جلدی جلدی بولتا تھا لیکن تلفظ صحیح اور صاف تھا اور جو اطالوی کی عادت تھی۔ میری بھی تھی۔ یعنی بولتے وقت الفاظ کے ساتھ ساتھ میں ہاتھ اور سر ہلاتا اور اشارے کرتا تھا۔ اور اب میں اس ایکٹر کی طرح مشق کرنے لگا جو ایک خاص پارٹ ادا کرنے کی تیاری کررہا ہو۔ چنانچہ میں نے اپنا لہجہ کرخت اور تقریباً ''کھرا'' اور سرد بنالیا جس میں تلخی اور بیزاری کی ہلکی سی آمیزش تھی۔ رہے ہاتھوں اور سر سے اشارے کرنا تو اب میں کم سے کم ہاتھ ہلاتا تھا اور وہ بھی اسی وقت جب بہت ضروری ہوتا۔ جو کہ سخت مشکل کام تھا۔ چنانچہ اس میں مجھے خاصی محنت کرنی پڑی اور ضرورت سے زیادہ وقت اس کی نظر ہوگیا۔ لیکن میں نے ایک انگریز کو اپنا ''ماڈل'' بنایا تھا جو اسی ہوٹل میں مقیم تھا جس میں کہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جس کا میٹھا پن اور سرد مہری ایک لمحے کے لئے بھی اس سے الگ نہ ہوتی تھی۔ وہ آدمی کیا تھا برف کا تودہ تھا۔ انسانی برف کا تودہ...... ہر طرف سے مکمل شریف اور کم گو اور پروقار اور ایسا وقار انگریز لوگ اس وقت اپنے آپ پر طاری کرلیتے ہیں جب وہ کسی دوسرے ملک میں مقیم ہوں۔

اور میں نے اسی انگریز کے طور طریقوں اور عادات واطوار کی نقل شروع کردی۔ چنانچہ اب میرے ماتھے پر بل رہتے تھے اور منہ سختی سے بند جیسے میں ہنسی اور مسکراہٹ سے قطعی ناآشنا تھا اور میں چاروں طرف ہر منظر کو اسی طرح پروقار حقارت سے دیکھتا تھا۔

اور بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ میں اپنی ان کوششوں میں پوری طرح سے کامیاب رہا تھا کیونکہ ایک دفعہ میں نے ہوٹل کے ایک ویٹر کو دوسرے ویٹر سے سرگوشی میں کہتے سنا۔

''سالا سفید ریچھ۔''

یہ میری شان میں کہا گیا تھا لیکن میں غصہ ہونے کے بجائے اپنے آپ ہی مسکرایا۔

میں نے ایک کام اور کیا۔

میں نے نیپلز کے ایک مشہور اور نامی اخبار کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا۔ اور میں جانتا تھا کہ یہ اخبار ویلا رومانی میں بلاناغہ جاتا تھا۔ اور خط کے ساتھ ہی لفافے میں پچاس فرانک رکھ دیئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے دوسرے شمارے میں میرے متعلق ایک پیرا گراف چھاپ دے۔ یہ پیراگرف کچھ یوں تھا۔

''ایک رئیس ابن الرئیس کنور کونٹ سیزر اولاویا اپنے آبائی وطن سے کئی برسوں تک باہر رہنے کے بعد، معلوم ہوا کہ اب بے پناہ دولت لے کر واپس آرہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اب وہ نیپلز کو ہی اپنا گھر بنائیں گے۔ آبائی وطن بہرحال وطن ہوتا ہے۔ آدمی کی

نال جس زمین پر گری ہوئی ہو وہ دھرتی آخر اسے پکارتی اور اس کی کشش اس کو لے ہی آتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی کے رہنما اور مقدس ہستیاں اپنے ممتاز رئیس کو نہ صرف خوش آمدید کہیں گی بلکہ سوسائٹی میں انہیں وہ مقام بھی دیں گی جو سنگنور سیزر اولاویہ کے شایان شان ہوگا۔''

میں نے جو کچھ لکھ کر دیا تھا وہ ایڈیٹر نے بڑی جوش سے لفظ بہ لفظ چھاپ دیا۔ جس اخبار میں یہ پیرا گراف شائع ہوا اس کی ایک کاپی ایڈیٹر نے ہزاروں سلاموں کے ساتھ مجھے بھیج دی۔ البتہ ان پچاس فرانک کے متعلق خاموش رہا جو میں نے لفافے میں رکھے تھے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ وہ اس نے بڑے اطمینان اور خوشی سے اپنی جیب میں رکھ لئے ہوں گے۔ اگر میں نے اسے دگنی رقم بھیجی ہوتی تو بلاشبہ اس نے اپنے اخبار میں اعلان کردیا ہوتا کہ میں بادشاہ یا شہنشاہ ہوں اور یہ کہ کسی خاص وجہ سے میں نے بھیس بدل رکھا ہے۔

☆......☆......☆

پالیرمو میں میرے قیام کا وہ آخری دن تھا۔

دوسرے دن میں وہاں سے رخصت ہوجانے والا تھا۔

ہوٹل کے سگریٹ نوشی کے کمرے میں، کھڑکی کے قریب میں آرام کرسی میں نیم دراز تھا اور سگریٹ پی رہا تھا اور کھڑکی کے باہر عین سامنے خلیج کے جگمگاتے پانیوں کا نظارہ کررہا تھا۔

شام کے آٹھ بج چکے تھے اور غروب آفتاب کے بعد کے سرخ، نارنجی اور سیاہ رنگ ابھی پوری طرح آسمان پر سے غائب نہ ہوئے تھے۔ تاہم سمندر کی طرف سے آتی ہوئی ہواؤں خنکی آنے والی سرد رات کی پیشگوئی کررہی تھی۔

اب میں ایک ایسے شخص کا کردار ادا کررہا تھا جو دنیا کو ہر طرح سے بھول چکا اور اس سے بیزار ہوچکا تھا۔ اب میں ایک، بظاہر تند خو خشک مزاج اور قنوطی رئیس تھا۔ ایک ایسا شخص جسے دنیا اس کے مقیم مناظر اور دوسرے چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور میں سمجھتا ہوں کہ اب اگر میں اپنی پرانی خصوصیات سے واپس لانا چاہوں، فابیو بننا چاہوں تو مجھے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے قنوطیت اور اجڈ پن کا مطالعہ اتنے عرصے تک کیا تھا اور اس کی ایکٹنگ یوں ڈوب کر کی تھی کہ اب میں سچ مچ اجڈ اور قنوطی بن گیا تھا۔ ایک ڈرامے میں مجھے مرکزی کردار ادا کرنا تھا اور مجھے اپنا پارٹ از بر تھا۔

میں خاموشی اور خالی الذہن بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ دفعتاً شور وغل کی آوازیں سن کر چونکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کا جم غفیر سیلاب کی طرح بہتا اسی طرف آرہا ہے۔ میں نے کھڑکی میں جھک کر دیکھا لیکن کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں حیران تھا کہ یہ زبردست شور وغل کا ہے کا ہوسکتا ہے کہ ایک ویٹر نے سگریٹ نوشی کے کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھولا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان چیخ کر کہا۔

''کارمیلویزی، سنگنور کارمیلویزی۔''

''کارمیلویزی!'' میں نے بظاہر انجان پن سے پوچھا۔

''ہاں سنگنور۔ وہ مشہور ڈاکو۔ پکڑا گیا آخر کار۔''

حالانکہ یہ خبر میرے لئے بھی اتنی ہی دلچسپ تھی جتنی کہ اس ویٹر کے لئے، تاہم میں نے اپنی دلچسپی کا اظہار اپنی کسی حرکت سے ہونے نہ دیا۔ میں اپنا پارٹ اور وہ خصوصیات بھولا نہ تھا۔ جو میں نے اپنے آپ پر طاری کرلی تھیں بلکہ انہیں اپنی زندگی کا ایک جز بنالیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے منہ سے سگریٹ نکال کر صرف اتنا کہا۔

''تو پھر بڑا بدمعاش پکڑا گیا۔ میں حکومت کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟''

''وہاں بڑے چوک میں۔'' ویٹر نے جوش سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''اگر سنگنور کارمیلو کو دیکھنا چاہیں تو نکڑ تک چلے جائیں۔ کارمیلو بندھا ہوا اور پابہ زنجیر سنگنور کو نظر آجائے گا۔ خدا ہی اس پر رحم کرے۔ لوگ تو یوں ٹوٹے پڑرہے ہیں جیسے گڑ کی بھیلی پر مکھیاں۔ باپ رے باپ۔ کیا بھیڑ ہے...... میں بھی وہیں جارہا ہوں۔ ایسا منظر بار بار

دیکھنے کو تھوڑی ملتا ہے؟''

اور وہ کارمیلو ڈاکو کو دیکھنے اس بچے کی طرح بھاگا جو پہلی دفعہ میلہ دیکھنے جارہا ہو۔

میں نے اپنی ہیٹ سر پر رکھی اور ٹہلتا ہوا وہاں پہنچا جہاں یہ ''میلہ'' لگا ہوا تھا اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ وہ حقیقت میں ایک یادگار اور قابل تصور منظر تھا۔

میدان سروں کا ایک سمندر بنا ہوا تھا۔ جس میں اشارے کرتے ہوئے ہاتھ جیسے موجیں ہوں اور لوگوں کی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ جیسے ان کا دبا دبا شور۔ لوگوں کی اس بے پناہ بھیڑ کے بیچ میں گھڑسوار فوجی سپاہیوں کا ایک دستہ کھڑا ہوا تھا جن کی کھنچی ہوئی برہنہ تلواروں کی دھار پر شام کے سورج کی شعاعیں کروٹیں بدل رہی تھیں اور یہ لوگ اور ان کے گھوڑے بھی یوں بے حس وحرکت تھے جیسے کانسی کے بنے ہوئے پتلے ہوں۔

یہ فوجی پولیس کے گھڑسوار ''کاربینیری'' ہیڈ کوارٹر کے سامنے مستعد کھڑے ہوئے تھے اور ہیڈ کوارٹر کے دروازے پر افسروں کی ایک پارٹی اپنے گھوڑوں پر سے اتر رہی تھی کہ آگے روانہ ہونے سے پہلے ڈاکو کی گرفتاری کے متعلق اپنی تفصیلی رپورٹ پیش کرے۔

اور ان مسلح اور چوکنے فوجی سپاہیوں کے درمیان ڈاکو کارمیلو یزی تھا۔ اسے ایک مضبوط اور موٹے خچر پر بٹھا کر اس کے دونوں پاؤں خچر کے پیٹ کے نیچے آپس میں باندھ دیئے گئے تھے اور کلائیوں میں موٹی موٹی ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر کے طوفانی بادلوں کی طرح کالا اور خوفناک تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی نہ تھی اور اس کے گھنے، کالے لمبے اور الجھے ہوئے بال اس کے شانوں پر پڑے ہوئے تھے اور اس کی مونچھیں اور داڑھی ایسی کالی اور اتنی گنجان تھی کہ انہوں نے اس کے چہرے کے خوفناک خطوط کو تقریباً چھپا رکھا تھا۔ لیکن وہ بے انتہا مایوسی اور بے پناہ غصے سے اپنا نچلا ہونٹ چبا رہا تھا۔ چنانچہ میں اس کے شیر کے دانتوں جیسے تیز اور سفید دانت اس کی گھٹاٹوپ مونچھوں اور داڑھی کے درمیان دیکھ سکتا تھا۔ اور اس کی آنکھیں...... میرے خدا...... اس کی گھنی بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں لپکتے ہوئے شعلوں کی طرح غضبناکی سے روشن تھیں۔

کارمیلو یزی لحیم شحیم آدمی تھا۔ پورا دیو کا دیو۔ حیرت انگیز حد تک لمبا چوڑا اور اس کی پیٹھ پر بندھے ہوئے اس کے ہاتھ، جن کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں، دو زبردست اور جان لیوا ہتھوڑوں کی طرح تھے۔ جو ایک ہی ضرب میں آدمی کی کھوپڑی پچکا سکتے اور اس کی جان لے سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ کارمیلو یزی مجسم خوف اور گھن تھا۔ اس میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہ تھی جو آدمی کے دل میں اس کے لئے ہمدردی یا رحم کا جذبہ پیدا کرسکتی۔ حتیٰ کہ اس وقت وہ جس غصے، بے پروائی اور ہمت کا مظاہرہ کررہا تھا وہ بھی آدمی کے دل میں نفرت پیدا کررہی تھی اور میں سمجھتا ہوں لوگ آپس میں یا دل میں یہی کہہ رہے تھے کہ...... ''بنتا ہے سالا۔''

لیکن زندان کا صرف ایک ہفتہ اس کی اس بے پروائی اور ہمت کو یوں نچوڑ دے گا جس طرح پکے ہوئے انگوروں میں سے ان کا رس نچوڑ لیا جاتا ہے۔

رہا اس کا لباس تو حیران ہوں کہ ان کو بیان کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں! وہ مختلف رنگوں کا مجموعہ تھا، ڈھیلا تھا، پرشکن تھا اور اس طرح تہ در تہ تھا کہ کوئی فنکار ہی اس کی تعریف کرسکتا تھا۔ اس کی کمر پر ایک سرخ چوڑا پٹکا بندھا ہوا تھا جس نے اس لباس کو گویا تھام رکھا تھا۔ اس کے ریچھ کے سے چاکلیٹی بازو شانوں تک کھلے تھے۔ گریبان بھی کھلا تھا اور اس کا گلا چکی کے پاٹ جیسا سینہ دکھائی دے رہا تھا جس کا اٹھنا اور گرنا اس کے سینے میں کھولتے ہوئے غصے اور خوف کا پتہ دے رہا تھا۔

اور جیسے آسمان بھی اس ڈاکو کے عجیب وغریب لباس کا مقابلہ کررہا ہو۔ سرخ بادلوں کی ایک پوری فوج کی فوج جیسے آسمان پر قواعد کررہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج دیوتا نے اپنے سرخ، یاقوتی شراب کا پیالہ آسمانی فرش پر پٹخ دیا ہو اور اب اس سے شراب بہہ کر آسمان پر ادھر ادھر پھیل رہی ہو۔ یہ غروب آفتاب

کے بعد کی سرخی تھی جو زمین پر کھڑے ہوئے ان اروں چہروں کو بھی سرخ کررہی تھی جو اس ظالم ڈاکو کو ک سے دیکھنے کے لئے اوپر اٹھے ہوئے تھے جس کے نام سے بھی پورا اسسلی لرزتا تھا۔

میں بھیڑ میں راستہ بناتا آگے بڑھا کہ کارمیلو کو ریب سے دیکھ سکوں۔ عین اس وقت اس نے یوں اتھ ہلائے جیسے بندھن توڑنا چاہتا ہو۔ بتوں کی طرح بے حس وحرکت کھڑے ہوئے فوجی سپاہیوں کے بدن ں جیسے جان پڑگئی اور چشم زدن میں ان کی برہنہ لواریں کارمیلو کے سر اور سینے کی طرف جھک گئیں۔

کارمیلو نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

''کورپودی کرسٹو!'' وہ بولا۔ ''احمق ہو تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ جس آدمی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ ہرن کی طرح بھاگ لے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میں جال میں پھنسا ہوا ہوں۔ لیکن اس سے کہو، کہواس سے کہ میرے پاس آئے۔ اس کے لئے ایک پیغام ہے میرے پاس۔''

سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف اور اپنے اروں طرف لگی ہوئی بے پناہ بھیڑ کی طرف دیکھا اور وئی فیصلہ نہ کرسکے کہ کیا کریں۔

سپاہیوں سے مزید کچھ کہے بغیر یا ان سے کوئی ات کئے بغیر کارمیلو نے اپنے آپ کو تان کر اور اں پر کھڑے ہو کر سر اوپر اٹھایا اور چیخ کر کہا۔

''لو جی بیکاردی! کپتانو! تم سمجھتے ہو کہ میں ہیں دیکھ نہیں سکتا۔ دیوا، ارے میں تو تمہیں دوزخ ں بھی دیکھ اور پہچان لوں گا۔ آؤ۔ نزدیک آؤ۔ میں تم ستی الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ آؤ کہ الوداع کہوں۔''

اس کی گونج دار اور کرخت آواز اس سرے سے سرے تک چلی گئی اور سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ دم سے خاموش ہوگئے۔ کچھ تو حیرت سے اور کچھ ف سے۔

اور پھر بھیڑ میں ایک طرف کچھ ہلچل سی ہوئی۔ وں نے دب دبا کر ایک نوجوان کو راستہ دیا۔ یہ نوجوان دبلا پتلا، بلند قامت اور خوبرو تھا۔ چہرے کا رنگ تقریباً زرد تھا اور آنکھیں ہنستی ہوئی سی تھیں۔ اس نے ''برے گلیری'' سی صاف ستھری اور نفیس وردی پہن رکھی تھی جس سے اس نوجوان کی نفاست پسندی کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ایک چھیلے کی سی۔ اور حقیقت میں وہ چھیلا ہی تھا۔ بے باکی اور بے پروائی سے کہنیوں کے ذریعہ راستہ بناتا آرہا تھا۔

وہ کارمیلو یزی کے قریب آ کھڑا ہوا اور لاپروائی اور بے تعلقی سے اس سے گفتگو شروع کی۔ نوجوان کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔

''ایانے!'' اس نے کہا۔ ''آخر کار تم پکڑے گئے کارمیلو۔ تم نے مجھے بلایا؟ لو میں آ گیا۔ کہو! کیا کہنا ہے تمہیں بدمعاش۔''

''کارمیلو نے اپنی گھنی داڑھی میں بڑبڑا کے غضبناک گالی بک دی۔ اور پھر دانت پیسنے لگا۔ لمحہ بھر کے لئے وہ اس درندے کا سا دکھائی دیا جو کسی پر جھپٹ پڑنے والا ہو۔

''تم نے غداری کی مجھ سے۔'' وہ بولا۔ اس کی آواز دھیمی لیکن لرزہ خیز تھی۔ ''تم نے میرا پیچھا کیا۔ تم نے مجھے تلاش کرلیا۔ تریسا نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔ ہاں۔ اب وہ تمہاری ہے۔ تمہاری یہ آرزو پوری ہوئی۔ جاؤ حاصل کرلو اسے۔ وہ تمہاری منتظر ہے۔ جاؤ۔ اگر تم اس کی زبان کھلوا سکتے ہو تو کھلوا لو اس سے کہ وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔''

کارمیلو یزی کے لہجے میں اور آواز میں کوئی خاص بات تھی جس نے نوجوان کو چونکا دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ گھبرا کر بولا۔ ''تم نے کہیں اسے میرے خدا۔ بدمعاش! تم نے اسے مار تو نہیں ڈالا؟''

کارمیلو نے ایک وحشیانہ فلک شگاف نعرہ لگایا۔

''نہیں۔ میں نے نہیں۔ خود اس نے اپنی جان لے لی۔'' اس نے جیسے وجد کے عالم میں جھوم کر کہا۔

''ہا۔ ہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سن کر تم کانپ جاؤ گے۔ اس

نے میرا چاقو گھسیٹ کر خود اپنے سینے میں اتار لیا۔ ہاں۔ تمہارا جھوٹا چہرہ اور منحوس صورت دوبارہ دیکھنے پر اس نے موت کو ترجیح دی۔ تمہاری ناپاک آغوش سے موت کی آغوش کو بہتر سمجھا۔ جاؤ تلاش کرلو۔ جاؤ۔ وہ وہاں پہاڑوں میں لیٹی ہوئی ہے مردہ اور مسکراتی ہوئی اور اس کا آخری بوسہ میرے لئے تھا، سن رہے ہو۔ میرے لئے۔ بس اب جاؤ۔ شیطان سمجھے تم نے۔''

ایک بار پھر سپاہیوں نے اپنی تلواریں دھمکی آمیز انداز میں بلند کیں اور کارمیلو ایک بار پھر کھولتے ہوئے غصے کو دبا کر خاموش اور بے پروا اور بے تعلق ہو چکا تھا۔ لیکن وہ نوجوان، جس سے کارمیلو نے یہ باتیں کہی تھیں، یوں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ زمین پر ڈھے جائے گا۔ اس کا زرد چہرہ اور بھی زرد ہوگیا اور اب وہ حیرت اور تجسس سے خاموش آنکھیں پھاڑے کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان سے اس شخص کے سے میانگی انداز سے گزر رہا تھا، جو خود ہی نہ جانتا ہو کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل کو سخت دھکا اور صدمہ پہنچا تھا جو خلاف توقع تھا۔ اسے ایک زبردست زخم لگا تھا جو بہت گہرا تھا۔ چنانچہ ایک طویل مدت تک مندمل نہ ہو پائے گا۔

میں اس سپاہی کے، جو میرے زیادہ قریب تھا، پاس پہنچا اور پانچ فرانک کا سکہ چپکے سے اس کے ہاتھ میں کھسکا دیا۔

''میں بات کر سکتا ہوں اس سے؟'' میں نے پوچھا۔

سپاہی ہچکچاہٹ کے بعد بولا۔

''ایک منٹ کے لئے سگنور۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے جلد کہہ دیجئے۔'' اور اب میں نے کارمیلو کو نیچی لیکن صاف آواز میں مخاطب کیا۔

''تمہیں آندرے لوزانی کو پیغام دینا ہے؟ میں اس کا دوست ہوں۔'' اس نے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر گھمبیر مسکراہٹ نمودار ہوئی جو رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''آندرے عمدہ آدمی ہے۔ اگر اس سے ملاقات کر رہے ہو تو اس سے کہہ دینا کہ تریا اب اس دنیا میں نہیں رہی اور میں خود مردے سے بدتر ہوں ... اسے پتہ چل جائے گا بلکہ وہ سمجھ لے گا کہ تریا کو ... نے قتل نہیں کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا وہ ... اپنے سینے میں اتار چکی تھی اور یہ اچھا ہی کیا اس نے۔''

''اس نے دوسرے کی بننے کے بجائے مرجانا بہتر سمجھا؟'' میں نے پوچھا۔ کارمیلو یزی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو میری نظر مجھے دھوکا دے رہی تھی یا پھر ... میں اس پتھر دل ڈاکو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس سپاہی نے جس نے پانچ فرانک کی رشوت قبول کی تھی۔ سر سے اشارہ کیا اور میں کارمیلو کے پاس سے ہٹ گیا۔

عین اس وقت اس چھوٹے سے دستے کا افسر ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے باہر آیا۔ وہ اس شان اور وقار سے چل رہا تھا اور پٹری کے پتھروں پر اس کے قدم بڑی مضبوطی سے پڑ رہے تھے کہ اس کے جوتوں میں لگی ہوئی مہمیز کی پھرکیاں ''ٹھن۔ ٹن۔ ٹھن ٹن۔'' ... رہی تھیں۔ وہ اچک کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس نے چیخ کر حکم دیا تو بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی۔ لوگ دائیں بائیں دب کر راستہ دے چکے تھے۔

سپاہیوں نے گھوڑوں کو مہمیز کیا اور وہ آہستہ آہستہ چل پڑے۔ چند منٹوں بعد ہی سپاہی اور ان کے درمیان سب سے الگ دکھائی دیتا ہوا دیوہیکل کارمیلو یزی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

اب لوگ حالیہ واقعہ پر رائے زنی کرتے مختلف ٹولیوں میں بکھر کر اپنے گھروں یا دکانوں یا دھندوں کی طرف جانے لگے اور چند ثانیوں بعد ہی یہ میدان پوری طرح سے خالی ہو چکا تھا۔

اور میں اکیلا اس میدان میں ٹہل رہا تھا میں تصور میں نازک اور حسین تریا کو...... جیسا کہ کپتان آندرے نے اس کا حلیہ بیان کیا تھا...... مردہ پڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ مانتے میگوری کے پہاڑوں میں اکیلی پڑی ہوئی تھی اور اس کے سینے میں چاقو کا گہرا زخم تھا جس نے

اس کی جان لی تھی۔

''تو پھر دنیا میں ایسی عورتیں بھی ہیں جو بے وفائی پر موت کو ترجیح دیتی ہیں۔''

حیرت کی بات ہے، واقعی حیرت کی بات ہے لیکن یہ مفلس اور عام عورتیں ہوں گی نچلے طبقے کی سادہ لوح عورتیں جیسی کہ اس ڈاکو کی معشوقہ تھی۔ محلوں میں رہنے والی اور ریشمی لباس پہننے والی اور عمدہ کھانے کھانے والی نام نہاد شریف عورتیں تو خنجر اور چاقو کو تو بہت اوچھا ''تسلی دینے والا'' سمجھتی ہیں۔ اس کے بجائے اپنے غم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے وہ اپنا ایک عاشق بلکہ کئی عاشق منتخب کرلیں گی۔ پھر ان کا ''مرنے والا'' جنت میں جائے گا یا جہنم میں ان کی بلا سے۔ بندی کو تو حلوے مانڈے سے کام۔''

اس میدان میں یوں سوچتے اور یوں ٹہلتے ہوئے میں بار بار کاربیزی کے دفتر کے سامنے سے گزر رہا تھا اور پھر یکایک شوق تجسس سے بے تاب ہو کر میں اس عمارت میں داخل ہوگیا کہ کارمیلو یزی کی گرفتاری کے متعلق چند تفصیلات معلوم کرلوں۔ ایک خوبرو اور ہوشیار نظر آتے ہوئے شخص نے میرا استقبال کیا اور اس تعارفی کارڈ پر جو میں نے اسے دیا تھا، ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اٹھ کر مجھے سلام کیا۔

''جی ہاں۔'' اس نے میرے سوالوں کے جواب میں کہا۔ ''اس کم بخت کارمیلو یزی نے بہت پریشان کیا ہمیں۔ لیکن ہمیں شک تھا کہ وہ جائیتا سے، جہاں وہ روپوش تھا، روانہ ہو چکا ہے ادھر ادھر سے چند اضافی معلومات ہم نے حاصل کیں اور انہی کی بنیاد پر ہم نے اس کا کھوج لگا لیا۔''

''آسانی سے گرفتار ہوگیا یا مقابلہ کیا اس نے؟''

''ارے سگنور! اس نے تو بزدل بکری کی طرح اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ بیزار نہ ہوں اور فرصت سے ہوں تو۔''

''سنائیے میں سن رہا ہوں۔''

''ہوا یوں کہ ہمارے ایک آدمی نے اس عورت کا پیچھا کیا۔

''جو میلوی کے ساتھ رہتی تھی۔ تریا نام تھا اس کا۔ وہ اس کے پیچھے پہاڑوں میں گیا اور ایک تنگ درے یا شگاف میں جا کر وہ غائب ہوگئی۔ ہمارے جاسوس نے واپس آ کر ہمیں بتایا اور ہم نے ایک مسلح دستہ وہاں بھیج دیا۔ وہ لوگ آدھی رات کے وقت دو دو کر کے آگے بڑھے اور اس درے کو گھیرے میں لے لیا جس میں یزی چھپا ہوا تھا۔ صبح طلوع ہوتے ہی وہ ایک دم سے درے میں دھنس پڑے اور اسے پکڑ لیا۔ کہتے ہیں کہ اس پر اس نے ...... حیرت کا اظہار نہ کیا بلکہ صرف اتنا کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم آؤ گے۔'' وہ اپنی داشتہ، یعنی تریا کی لاش کے قریب بیٹھا ہوا تھا، اس کے سینے میں خنجر کا تازہ زخم تھا۔ جس سے خون بہہ رہا تھا...... بلاشبہ یزی نے اسے مار ڈالا تھا حالانکہ وہ اس سے انکار کر رہا اور کہہ رہا ہے کہ تریا نے خودکشی کر لی۔ لیکن آپ جانتے ہیں سگنور وہ اتنی ہی آسانی سے جھوٹ بول لیتا ہے جتنی آسانی سے ہم سانس لیتے اور چھوڑتے ہیں۔''

''اس کے ساتھی کہاں تھے؟ میرا تو خیال تھا کہ خاصا بڑا گروہ ہے اس کا۔''

''اوہ اور آپ کا خیال غلط نہیں سگنور۔''

''پھر؟''

''اس کے تین خاص اور اہم آدمیوں کو ہم نے ابھی کوئی پندرہ دن پہلے ہی پکڑ لیا تھا۔ اس کے گروہ کے دوسرے بدمعاش تو پتہ نہیں کہاں غائب ہوگئے۔ ہمیں ان کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود کارمیلو نے انہیں رخصت کر دیا اور وہ ملک کے طول و عرض میں بکھر گئے۔ بہرحال اب اس کا گروہ نہیں رہا اور ایسے لوگوں کے متعلق سچ ہی کہا گیا ہے کہ ان کا گروہ نہ ہو تو پھر ان کی طرف سے کوئی خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ بقول کسی کے اکیلا چنا بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔''

''تمہارے خیال میں یزی کو کیا سزا دی جائے گی؟''

''ظاہر ہے کہ عمر قید۔'' اس کے علاوہ اور کوئی سزا نہیں اس کے لئے۔''

میں نے اس افسر کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر دفتر سے باہر آ گیا۔ یہ چند باتیں معلوم ہو جانے کے بعد میں ایک طرح کی خوشی اور اطمینان محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ خزانہ، جو مجھے اپنے خاندانی مقبرے میں سے ملا تھا، اب بے خوف و خطر میرا، پہلے سے بھی زیادہ میرا تھا۔ اب تو اس کا قطعی کوئی امکان ہی نہ تھا کہ کارمیلو کے گروہ کا کوئی آدمی اس کی تلاش میں مقبرے میں داخل ہونا تو دور رہا نیپلز کے قریب تک آنے کی جرات نہ کرے گا۔ اور میں نے سوچا..... اور سنجیدگی سے مسکرا کر سوچا..... کہ اگر کارمیلو کو میری کہانی معلوم ہو جاتی تو وہ شاید اس بات سے خوش ہوتا کہ وہ اس کی دفن کی ہوئی دولت ایک مناسب و موزوں اور عبرت ناک انتقام کے لئے خرچ کی جائے گی۔

میری ساری مشکلات خود بخود حل ہو رہی تھیں، میری راہ کی تمام رکاوٹیں دور ہو گئی تھیں۔ میرا راستہ اب بالکل صاف تھا۔ ہر چھوٹا اور معمولی سا واقعہ انگشت نما تختہ تھا جس پر کی شہادت کی انگلی صرف ایک اور سیدھے راستے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ جو مجھے منزل مقصود تک پہنچانے والا تھا۔ خود خدا میری مدد کر رہا تھا جس طرح کہ وہ ہر اس شخص کی مدد کرتا ہے جو انصاف کے راستے پر چلتا ہے۔ ان بے وفا لوگوں کو اس بھرم میں نہ رہنا چاہئے کہ چونکہ وہ باقاعدہ گرجا میں جاتے ہیں اور ہاتھ باندھ کر اور جھک کر اور چہرے پر خوف خدا طاری کر کے لمبی لمبی عبادتیں کرتے ہیں اور طول طویل دعائیں پڑھتے ہیں کہ خدا کو دھوکا دے جائیں گے۔

میری بیوی عبادتیں کر سکتی ہے، مقدس قربان گاہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر سر جھکا سکتی ہے۔ مصلوب مسیح کی طرف معصوم آنکھوں سے اور اعتقاد سے دیکھ سکتی ہے۔ اور اس طرح وہ جو دعائیہ الفاظ کہے گی وہ سارے کے سارے جھوٹے ہوں گے جو خود اس پر آ پڑیں گے۔ اس کی عبادتیں اس کے منہ پر ماردی جائیں گی۔ مکار اور جھوٹے لوگوں کے لئے عبادت بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔ ان کا عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو برہنہ تلوار پر گرانا۔ اپنی عزت کی خاطر تلوار اٹھالی جائے تو وہ حفاظت کرتی ہے، بچاؤ کرتی ہے لیکن اگر بزدلی سے آخری سہارے کے طور پر اٹھائی جائے تو جان لے لیتی ہے۔

ستمبر کا تیسرا ہفتہ ختم ہو رہا تھا۔ جب میں نیپلز واپس پہنچا۔

موسم نسبتاً ٹھنڈا ہو گیا تھا اور طاعون کی وبا کا زور کم ہونے کی خبروں نے خوفزدہ لوگوں کی امیدیں اور ڈھارس بندھانی شروع کر دی تھی۔ کاروبار ایک بار پھر شروع ہو گئے تھے۔ عیش و عشرت کے دلدادہ اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو چکے تھے اور سوسائٹی ایک بار پھر اپنے نام نہاد رقص میں یوں مشغول ہو گئی تھی جیسے اس نے کبھی رقص کرنا بند کیا ہی نہ تھا۔

میں تقریباً سویرے ہی شہر میں پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اپنے کام کی ابتدائی تیاریاں کرنے کا مجھے کافی وقت مل گیا۔

سب سے پہلے تو میں نے شہر کے بہترین ہوٹل میں بہترین کمرہ حاصل کر لیا۔ اور ہوٹل کے پورے عملے پر..... اوپر سے لے کر سب سے نچلے درجہ تک پر اپنی بے پناہ دولت اور اپنی اہمیت کا سکہ جما دیا۔ باتوں باتوں میں، میں نے ہوٹل کے مالک پر یہ ظاہر کر دیا کہ میں ایک عمدہ اور آرام دہ بگھی اور اعلیٰ نسل کا گھوڑا بھی خریدنا چاہتا ہوں اور یہ کہ مجھے ایک اعلیٰ درجہ ''والیٹ'' (خدمت گار) کی ضرورت کے سلسلے میں مجھے اس پر بھروسہ ہے۔ اور یہ کہ اس کا مشورہ درکار ہے کہ یہ چیزیں میں کہاں سے حاصل کر سکتا ہوں۔

یہ تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ میرا غلام بن گیا اور جیسی خبر گیری اور خدمت میری کی گئی کبھی کسی بادشاہ کی بھی نہ کی گئی ہوگی، حد تو یہ ہے کہ میرا حکم لانے میں پہل کرنے کے لئے خود ویٹر بھی ایک

دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں سچ مچ دھکا پیل کر رہے تھے اور میری بے انتہا دولت، دریا دلی، سخاوت اور فضول خرچی کی داستانیں یہاں سے وہاں تک بیان کی جانے اور پھیلنے لگی تھیں۔

اور یہی میں چاہتا تھا۔

اور اب نیپلز میں میرے پہلے دن کی شام ہوئی اور میں نے رئیس ابن رئیس، بے پناہ دولت کے مالک کونٹ سیزر اولادیہ نے جس کی خوشامد کرنے میں لوگ فخر محسوس کرتے تھے اور جس کی دولت کو لوگ حسد و رشک سے دیکھتے تھے، ہاں اسی کونٹ سیزر اور اولادیہ نے انتقام کی راہ میں پہلا قدم اٹھایا۔

وہ اس خوب صورت شہر کی خوب صورت ترین شام تھی۔ سمندر کی طرف سے فرحت بخش ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان موتی کا سا شفاف اور دودھیا تھا لیکن اس کے کناروں پر یاقوتی بادلوں کی لہراتی ہوئی جھالر سی ٹنگی ہوئی تھی اور کہیں کہیں بادلوں کے نارنجی ٹکڑے یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی غیبی گلستان سے پھولوں کی پنکھڑیاں جھڑ پڑی ہوں، خلیج کے پانی کی سطح پر ہوا کے جھونکے، ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر رہے تھے اور جھاگ کے چھوٹے چھوٹے گالے ان لہروں پر بہہ بہہ کر ساحل تک آ رہے تھے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں ہوٹل سے نکلا اور اس مشہور اور ہر دلعزیز کیفے کی طرف چلا، جو کہ ان دنوں میری پسندیدہ میٹھک رہا تھا۔ جب میں فابیو رومانی تھا۔ جیدو فیراری بھی ہر شام وہاں آتا تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ آج بھی میں اسے وہیں موجود پاؤں گا۔ کیفے کے سرخ و سفید اور سنہرے بڑے کمرے حسب معمول لوگوں سے بھرے ہوئے تھے اور چونکہ موسم سہانا اور شام سرد تھی اس لئے کئی میزیں گھسیٹ کر سڑک کے قریب رکھ دی گئی تھیں اور ان میزوں پر لوگ برف کی ملائی کھا رہے، شراب یا کافی پی رہے اور جان لیوا طاعون کی وبا کا زور ٹوٹنے اور اس کے رفتہ رفتہ ختم ہونے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

کیفے میں داخل ہوتے ہی میں نے متلاشی نظروں لیکن بے تعلقی سے چاروں طرف دیکھا۔ بے شک میرا خیال غلط نہ تھا۔ ایک طرف وہ آرام اور بے پروائی سے بیٹھا ہوا تھا۔ میرا سابق دوست، غدار دشمن اور عیار رقیب جیدو فیراری، وہ ایک کرسی پر ٹیک لگائے اور دوسری پر پاؤں پھیلائے کسی نواب کی سی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ عمدہ قسم کا سگار پی رہا تھا اور اس کے خوشبودار دھوئیں میں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ لباس میں ملبوس تھا اور غم کی یہ علامت اور اس کی یہ ریاکارانہ پوشاک اس کی گوری رنگت اور خوب صورت چہرے سے نہ صرف میل کھا رہی بلکہ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے بھی وہ جامہ زیب آدمی تھا۔

اس کا ایک خوب صورت ہاتھ بار بار ہونٹوں میں دبے ہوئے سگار کو ٹھیک کرنے کے لئے اٹھ رہا تھا اور اس ہاتھ کی چھنگلیاں میں ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ بے حد قیمتی ہیرا تھا۔ یہ جو شام کی روشنی میں یوں چمک رہا تھا کہ خود اس سے شعاعیں نکلتیں اور ارد گرد کے منظر کو روشن کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ اتنے فاصلے پر سے بھی میں نے ہیرے کی اس بے حد قیمتی انگوٹھی کو پہچان لیا۔

''اچھا! تو یہ محبت کا تحفہ ہے میرے دوست! یا یہ انگوٹھی تم نے اپنے بے حد پیارے مرحوم دوست کی یادگار کے طور پر پہنی ہے۔'' میں دل میں بولا۔

اور میرے دل میں بہ یک وقت نفرت، حقارت اور غصے کا زبردست طوفان اٹھا، لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور گویا نہلتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں جیدو بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک میز بھی ابھی خالی ہوئی تھی چنانچہ میں کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔

اس نے اخبار کے اوپر سے بے تعلقی سے مجھے دیکھا لیکن کالا چشمہ لگائے ہوئے اور سفید بالوں والے آدمی میں کوئی خاص بات نہ تھی جو اس کی دلچسپی کا باعث بن سکتی۔ چنانچہ وہ مجھے ایک نظر دیکھ کر دوبارہ سگار پھونکنے اور اخبار پر نظریں دوڑانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اپنی عمدہ اور خوب صورت چھڑی میز پر بجائی تو ایک ویٹر دوڑا آیا۔ میں نے کافی کا آرڈر دیا، سگار سلگایا اور جیدو کی طرح ہی بے پروائی سے بے تعلقی سے اور آرام سے بیٹھ کر دھواں اڑانے لگا۔

اور اب میرے انداز یا وضع میں کوئی بات اسے قابل توجہ معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس نے اپنا اخبار میز پر رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگا اور اس دفعہ وہ بڑی دلچسپی اور قدرے بے چینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کا کومانے، ہمون ایمی۔''میں نے سوچا۔

لیکن میں دوسری طرف دیکھنے اور ارد گرد کے منظر سے دلچسپی لینے لگا۔ میری کافی آ گئی۔ میں نے اس کا بل ادا کیا اور غیر معمولی طور پر زیادہ رقم ٹپ کے طور پر ویٹر کی طرف پھینک دی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ویٹر بڑے شوق اور چاؤ سے میری میز صاف کرنے لگا اور پھر کمرے میں مختلف میزوں پر بکھرے ہوئے تمام اخبار سمیٹ کر میرے لئے لے آیا۔ اور اب میں نے اس ویٹر کو جو ہر آدمی کی طرح میرا غلام بن چکا تھا، اپنی کرخت آواز تحکمانہ لہجے میں اور یہ دونوں چیزیں میں نے مشق کر کے بنائی تھیں۔ یوں مخاطب کیا کہ قریب بیٹھا ہوا جیدو سن سکے۔

''کیوں بھئی تم نیپلز کے توچپے چپے سے واقف ہوگے؟''

''جی سگنور۔''

''تو تم اس شہر کے ایک امیر کونٹ فابیو رومانی کے گھر کا راستہ تو جانتے ہی ہوگے؟ بہت مشہور رئیس ہیں یہ فابیو صاحب۔''

اور میرا تیر نشانے پر بیٹھا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ جیدو یوں چونکا جیسے غیر معمولی طور پر بڑی بھڑ نے اسے ڈنک مار دیا ہو اور پھر وہ اپنی کرسی پر چوکنا اور مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ یعنی اب وہ آرام اور بے تعلقی سے بیٹھا ہوا نہ تھا۔

اب میں نے ویٹر کی طرف دیکھا تو وہ انتہائی غم اور افسوس کے اظہار کے طور پر اپنے دونوں ہاتھ، شانے اور آنکھیں اوپر اٹھا چکا تھا۔ ''آہ! گراف دیو! ای مورتو۔'' وہ بولا۔

''انتقال کر گئے۔'' میں بظاہر حیرت سے یوں اچھل پڑا جیسے اس خبر سے میرے دل کو سخت دھچکا لگا ہو۔'' ارے! ابھی تو وہ جوان تھے! ناممکن، میں سمجھتا ہوں یہ تم کسی دوسرے فابیو کا ذکر کر رہے ہو۔''

''نہیں۔ سگنور یہ سچ ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

''وہ۔ لا پیستے کا شکار ہو گئے سگنور۔ طاعون جس کا کوئی علاج ہی نہیں۔ وبا نہ بوڑھا دیکھتی ہے اور نہ جوان، نہ غریب دیکھتی ہے اور نہ امیر۔''

اور میں اپنے ہی ہاتھوں میں سر دے کر یوں بیٹھ گیا جیسے اس خبر نے میرے دل کے ٹکڑے اڑا دیے ہوں۔ چند ثانیوں تک یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد میں نے سر اٹھایا اور بے حد دکھ بھری آواز میں کہا۔

''ہائے! افسوس! تب تو میں دیر سے پہنچا۔ میں فابیو کے والد کا دوست ہوں۔ میں کئی برسوں سے ملک سے باہر تھا اور مجھے فابیو سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کیونکہ جب میں یہاں سے گیا ہوں تو وہ بچہ ہی تھا۔''

میں ایک آہ بھر کے خاموش ہو گیا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے ویٹر سے پوچھا۔

''اس کا کوئی عزیز، کوئی رشتہ دار تو ہوگا ہی؟ شادی شدہ تھا وہ؟''

''ہاں سگنور! کونتیس رومانی رہتی ہیں ولا میں، لیکن سنا ہے کہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد وہ کسی سے ملتی جلتی نہیں۔ کونتیس بے حد خوب صورت اور جوان ہیں، حور کی طرح ایک بچی بھی ہے ان کی۔''

جیدو کی ایک عاجلانہ جنبش نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور میں نے اپنی سیاہ عینک سے اس کی طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

ڈراؤنا سفر

شہزاد خان-صادق آباد

وہ عجیب و غریب بھیانک شکل کا مالک تھا، لمبے دستے والی کلہاڑی ہاتھ میں تھامے اور چہرے پر خرگوش کا ماسک لگائے وہ اچانک اچھل کر سڑک پر آگیا تو......

پل پل اور لمحہ لمحہ خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن بھیانک رات کا شاخسانہ

بڑی شفاف سڑک تھی جس کے دونوں طرف لگی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی سے سامنے سڑک پر دکھائی دینے والی ہر چیز بڑی واضح نظر آرہی تھی۔ یہ رات کے تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا ایک نیلے رنگ کی ہنڈا براند ویگن جس میں اس وقت سات افراد جن میں دو لیڈیز اور ایک مرد، تین بچے اور ایک چھوٹی بچی شامل تھی۔ ویگن سڑک پر پچاسی کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے فراٹے بھرتی مشرق کی جانب بڑھتی جا رہی تھی۔ گاڑی میں ہلکا ہلکا میوزک چل رہا تھا اور مرد کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ایک خوبصورت اور درمیانی عمر کی عورت ہاتھ میں کوک کی ڈسپوزایبل بوتل تھامے بڑی نخوت سے آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ایک اور عورت جس کی عمر تقریباً پینتالیس کے لگ بھگ ضرور ہوگی براجمان تھی اور اس کے ساتھ ایک بچہ اور ایک بچی

بیٹھے تھے اور ان کی پچھلی سیٹوں پر دو بچے بیٹھے موبائل پر گیم کھیلنے میں مصروف تھے۔

گاڑی کی رفتار سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے مسافروں کو اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کی بہت جلدی ہے۔ جس رفتار سے وہ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے اس سے کسی ناخوشگوار حادثے کا اندیشہ تھا لیکن گاڑی کا اسٹرینگ جن ہاتھوں میں تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ڈرائیو کرنے والا ڈرائیونگ میں بلا کا تجربہ رکھتا ہے اس لئے گاڑی بغیر ڈگمگائے سیدھی سڑک پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ''میرے خیال میں ہمیں رات بارہ بجے کے قریب شام نگر پہنچ جانا چاہیئے۔'' مرد کی آواز گاڑی میں گونجی۔

جی مجھے بھی یہی لگتا ہے کیونکہ پچھلی بار جب ہم گھر سے نکلے تھے تو اس وقت ہماری گاڑی کی اسپیڈ ساٹھ کلومیٹر تھی اور ہمیں تین گھنٹے لگے تھے لیکن اب جب ہم پچاسی کی اسپیڈ سے جا رہے ہیں تو امید ہے ایک گھنٹہ پہلے ہی شام نگر پہنچ جائیں گے اور رسم سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ ساتھ بیٹھی اس خوبصورت عورت نے کوک سپ کرتے ہوئے جواباً کہا۔

''لیکن بھائی جان میں آپ سے یہی کہوں گی کہ آپ گاڑی کو زیادہ تیز نہ چلائیں کیونکہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' پیچھے بیٹھی دوسری عورت نے لقمہ دیا۔ وہ چہرے سے حقیقت میں ڈرپوک ہی لگ رہی تھی۔ اس کی بات سن کر سامنے بیٹھے دونوں مرد اور عورت زور سے ہنس دیئے۔ وہ اس کی بزدلی اور خوف سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ''ثناء تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے میں پہلی بار اتنی اسپیڈ سے ڈرائیو کر رہا ہوں...... آپ میرے ساتھ بہت کم سفر کرتے ہو اس لئے مجھے اتنی اسپیڈ سے گاڑی چلاتے دیکھ کر گھبرا رہے ہو۔'' مرد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ پیچھے سے کوئی جواب موصول ہوتا اس نے اچانک زور سے بریک لگا دیئے اور گاڑی الٹتے الٹتے بچی۔

اُف میرے خدایا یہ کیا چیز تھی جو اچانک سڑک کے دائیں طرف سے لڑھکتی ہوئی عین ان کی گاڑی کے سامنے ایک فٹ بال کی مانند اچھلی اور سڑک کے دوسری جانب چلی گئی۔ اگر وہ بروقت بریک نہ دباتا تو شاید وہ عجیب چیز ان کی ونڈ سکرین سے ٹکرا جاتی۔ اچانک بریک لگنے اور گاڑی کے ڈگمگاتے ہی ساتھ والی عورت اور پیچھے کے تمام افراد خوفزدہ ہو کر چیخنے چلانے لگے اور خود مرد کی حالت بھی بہت پتلی ہو رہی تھی کیونکہ وہ بھی اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا تھا۔

اگر وہ ڈرائیونگ میں مہارت نہ رکھتا ہوتا تو اس وقت وہ سڑک کے کنارے زخمی حالت میں پڑے ایمبولینس کا انتظار کر رہے ہوتے۔ لیکن اس وقت اس کی مہارت نے اس سمیت اس کی فیملی کے تمام افراد کو محفوظ رکھا تھا۔ گاڑی ایک جانب کھڑی کر کے اور تمام افراد کی خیریت دریافت کر کے وہ اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا...... اس کی فیملی نے اسے ایسا کرنے سے روکا لیکن وہ انسانی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر باہر نکل چکا تھا۔ اس کا رخ اس جانب تھا جس طرف وہ عجیب چیز لڑھکتی ہوئی گئی تھی۔ اس کے گھر کے تمام افراد گاڑی میں بیٹھے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

دوسرے لمحے وہ مرد بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا گاڑی کی جانب ہی لپکا اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے سرنج سے اس کے چہرے کا تمام خون کھینچ لیا ہو اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں گاڑی کے اندر سے ہی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ گاڑی کے نزدیک پہنچتے ہی دوسرے لمحے اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے آگے بڑھا دیا لیکن ابھی وہ ایک فرلانگ ہی گئے ہونگے کہ سامنے سڑک پر ایک انسانی جسم اچھلتا ہوا نمودار ہوا جو سر سے محروم تھا اور اس کی گردن سے خون فوارے کی مانند نکل رہا تھا۔ اسے اس طرح اچھلتے دیکھ کر تاتاری قبیلے کی یاد تازہ ہو گئی جب وہ لوگوں پر ظلم ڈھانے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتے رہتے تھے اور انہیں اذیت دے کر خوش ہوتے تھے۔ اس

قبیلے میں ایک ایسا دل دہلا دینے والا کھیل یہ بھی تھا کہ وہ مجرموں کو سزا کے طور پر ایک ایسے انسانیت سوز اور گھناؤنے کھیل کو اپنے تئیں سرانجام دیتے تھے کہ جس کو دیکھ کر انسانیت بھی شرما جائے۔ ان کے مطابق وہ زندہ انسانوں کا سر گردن سے تھوڑا اوپر تک کاٹ ڈالتے تھے اور پھر جب خون کا فوارہ ان کی گردنوں سے پھوٹ پڑتا تو وہ فوراً ان کی گردنوں پر لوہے کی توانما پلیٹیں خوب گرم کر کے رکھ دیتے تھے جو انسانی جسم کی کھال کے ساتھ اس چپک جاتی تھیں جیسے کسی نے لوہے کے ساتھ انہیں چپکا دیا ہو۔ ایسا کرنے سے جسم سے نکلنے والا خون باہر نکلنے کی کوشش کرتا لیکن رکاوٹ ہونے کی وجہ سے انسانی جسم کے اندر دوبارہ لوٹ کر ایک انتشار پیدا کر دیتا اور اس ساری کارروائی میں وہ انسانی جسم یوں اچھلتے جیسے رقص کر رہے ہوں...... موت کا رقص۔ انسانی دل دہلا دینے والا رقص۔

بہرحال اس طرح کے ہزاروں قصے ہماری تاریخی کتابوں میں ملیں گے جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ظالم، اور خونخوار انسان پیدا ہونے کے بعد دوبارہ مٹی میں مل گئے۔

اس وقت جو صورتحال ان کے سامنے تھی وہ بھی انہیں خوفزدہ کر دینے والی حقیقت تھی جسے دیکھ کر اچھا بھلا انسان بھی خوف سے چیخنے لگتا۔

رات کا وقت تھا اور شام نگر کی طرف جانے والی اس سڑک پر اتنا رش نہ ہوتا تھا کیونکہ اس علاقے میں زیادہ تر لوگوں کے پاس اپنی سواری نہیں تھی وہ لوگ زیادہ تر بسوں میں سفر کرتے تھے اور اس علاقے میں آنے والی اور جانے والی بس اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق سفر پورا کر کے اپنی منزل مقصود پر آرام کر رہی تھی۔ اس لئے راوی چین ہی چین لکھتا تھا اور اس سنسان سڑک پر اس وقت وہ واحد گاڑی مالکان تھے اور ان کے سامنے زندہ حالت میں ایک انسانی جسم اچھل اچھل کر سڑک کے بیچ رقص کر رہا تھا۔

یہ ایک اور مصیبت دیکھ کر گاڑی کے اندر بیٹھے لوگ خوف سے چیخنے لگے۔ لیکن مرد نے ان کے چیخنے کی پرواہ کئے بغیر جلدی سے گاڑی کو اس جسم کے نزدیک پہنچ کر ایک سائیڈ سے نکالنے کی کوشش کی اور دوسرے لمحے ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہو گیا۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید وہ دائیں طرف سے نمودار ہونے والے اس انسان سے ٹکرا جاتا جو اچانک اچھل کر سڑک پر آ گیا تھا اس کے چہرے پر خرگوش کی شکل کا ایک ماسک چڑھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں لمبے دستے والی ایک کلہاڑی تھی۔

اب ساری گیم ان سب کی سمجھ میں آ گئی تھی اس اچھلتے جسم کا قاتل یہی ماسک پہنے شخص تھا۔ وہ بے گناہ کون تھا......؟ اس شخص نے اسے کیوں قتل کیا......؟ رات کے اس وقت وہ بے گناہ شخص یہاں سڑک کے دوسری طرف کیا کر رہا تھا......؟ یہ ماسک پہنے شخص کون ہے......؟ یہ سب سوالات کے جوابات کسی کے پاس نہ تھے اور نہ ہی وہ یہ جاننا چاہتے تھے کیونکہ اس وقت جن حالات میں وہ سب پھنسے ہوئے تھے اس سے جان چھوٹ جائے یہی غنیمت تھی۔ اس شخص کے اچانک سامنے آتے ہی گاڑی ایک زوردار ٹکر کے ساتھ اس کے ساتھ ٹکرائی جس سے وہ شخص جھٹکا لگتے ہی دور جا گرا......

کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر ہی گر گئی اور دوسرا لمحہ ان سب پر بہت بھاری تھا کیونکہ اتنی زوردار ٹکر لگنے کے باوجود وہ ماسک پہنے شخص یوں اچھل کر دوبارہ کھڑا ہو گیا تھا جیسے اسے کسی گاڑی نے نہیں بلکہ کسی نے ہاتھ سے ہلکا سا دھکا دے دیا ہو۔ گاڑی کی ٹکر لگتے ہی مرد نے جلدی سے گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی تھی ورنہ بے قابو ہونے سے وہ الٹ بھی سکتی تھی۔ وہ گاڑی کے اندر سے اس گرتے شخص کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک اس کے دوبارہ اٹھ کر ان کی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر جیسے انہیں ہوش آ گیا اور مرد نے جلدی سے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی لیکن اس بار وہ اپنے ہوش میں تھا اور اس نے دوبارہ گاڑی اس سامنے آنے والے

شخص پر چڑھادی گاڑی ایک بار پھر اس کے جسم سے ٹکرائی۔ لیکن اس بار انہوں نے اس کا انجام دیکھنے کی بجائے گاڑی بڑی تیزی سے آگے بڑھادی۔ بیک مرر میں انہیں وہ شخص سڑک پر لیٹا دکھائی دیا یوں لگتا تھا جیسے اس بار اسے زیادہ چوٹ لگی تھی شاید اسی لئے وہ دوبارہ اٹھتا دکھائی نہیں دیا۔ اس ساری صورتحال میں رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے وہ کافی لیٹ ہوگئے تھے ورنہ اس وقت وہ شام نگر کے نزدیک پہنچ چکے ہوتے۔ گاڑی تیزی سے فراٹے بھرتی سڑک پر دوڑتی جارہی تھی اور پھر جلد ہی وہ مین سڑک سے دائیں طرف بنی ایک اور میٹل سڑک پر مڑ گئے۔ یہ چھوٹی سڑک جو تقریباً بارہ فٹ چوڑی ہوگی سیدھی شام نگر کے اندر تک جاکر ختم ہوتی تھی۔ صبح اور شام کے وقت اسی سڑک پر سفر کرکے بس مین سڑک پر پہنچتی تھی جو سیدھی شہر کی جانب جاتی تھی۔

اس وقت گاڑی میں جو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان مرد تھا اس کا نام منظور احمد تھا جس کا شہر میں ایک برتن بنانے والا چھوٹا سا کارخانہ تھا جس میں پچیس تا تیس افراد ملازم تھا۔ اس کے ساتھ اس کی فیملی کے افراد کے ساتھ ساتھ اس کی بہن بھی اس وقت گاڑی میں موجود تھی۔ وہ لوگ چونکہ پہلے شام نگر میں ہی رہتے تھے لیکن تعلیم حاصل کرنے کے بعد منظور احمد شہر میں ہی اپنا ایک بزنس اسٹیبلش کرچکا تھا۔ لیکن آسودہ زندگی گزارنے کے باوجود وہ اپنے علاقے کے لوگوں سے ملنے جلنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں گنواتا تھا اس لئے اس بار بھی جب اسے شام نگر سے ایک دوست کے بیٹے کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا تو وہ اپنی تمام مصروفیات بالائے طاق رکھ کر شادی میں شریک ہونے کے لئے نکل پڑا تھا۔ دن بھر کام کاج نمٹا کر انہوں نے رات کو سفر کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ تاکہ موسم بھی ٹھیک ہوگا اور وہ سکون سے شام نگر پہنچ جائیں گے۔

لیکن اس وقت جن حالات سے ان کا سامنا ہوچکا تھا اس سے وہ سب بہت خوفزدہ ہوگئے تھے اور جلد از جلد شام نگر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ بڑوں کو فکر مند اور گھبراہٹ میں دیکھ کر بچے بھی خوفزدہ نظروں گاڑی کے باہر جھانکنے کی کوشش میں لگے ہوئے انہیں ہر لمحہ یوں لگتا تھا جیسے اچانک کوئی ان کی گاڑی سامنے آجائے گا یا چلتی گاڑی کا شیشہ توڑ کر ان کی گردنوں کو دبوچ لے گا۔ اسی خوف کی کیفیت میں وہ کرنے پر مجبور تھے۔

یہ چھوٹی سڑک تقریباً چالیس کلومیٹر طویل تھی اور ابھی انہیں مزید سفر کرنا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت تھے جن کے دوسری طرف کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور ہر گزرتا لمحہ ان پر یہ خوف طاری کررہا تھا اچانک درختوں کے اندر سے کوئی اور بلا اچھل کر ان کے سامنے نمودار ہوجائے گی۔ گاڑی میں ہر کوئی خاموش تھا اور خوفزدہ نظروں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پیچھے بیٹھی عورت منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے میں مصروف تھی وہ دعائیں وغیرہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ اور پھر ان کا خوف ان سب پر غالب آگیا......

ایک بن مانس کی شکل اور جسامت میں جس کے تمام جسم پر سیاہ گھنے بال تھے گاڑی کی روشنی میں سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے ٹہلنے کا انداز یوں تھا جیسے کوئی اپنے گھر کے باغیچے میں چہل قدمی کررہا ہو۔ ابھی فاصلہ بمشکل پچاس ساٹھ فٹ کا ہوگا لیکن گاڑی کی روشنی میں اس کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سڑک چھوٹی ہونے کی وجہ سے کیا کریں؟...... ظاہر ہے دونوں طرف گھنے درخت تھے اور یہ بلا بھی شاید ان ہی درختوں کے اندر کہیں رہتی ہوگی جو اس وقت عین ان کے سامنے موجود تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر ان سب کی خوف سے چیخیں نکل گئیں۔ خود منظور احمد بھی گھبرا گیا تھا۔ وہ چونکہ اسی علاقے میں رہ چکا تھا لیکن اس طرح کے بھیانک واقعات اس نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ ہوسکتا ہے شام نگر کے باسیوں کا شاید ایسی چیزوں کا واسطہ پڑ چکا ہو لیکن وہ شام نگر چھوڑ چکے تھے انہیں معلوم ہوتا ابھی تو وہ خود ان مسائل میں الجھے ہوئے تھے اور اپنی جان بچنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

وہ بن مانس نما انسان گاڑی کی روشنی دیکھ کر دانت نکالے غرارہا تھا اف میرے خدایا...... رات کے اس پراسرار سناٹے میں ایک سنسان سڑک پر اپنی فیملی کے ساتھ موجود ہونے کا احساس اور سامنے ایک غیر مرئی مخلوق کا زندہ حالت میں موجود ہونا ایک اچھے بھلے انسان کے جسم میں خون جمادینے کے لئے کافی تھا۔

بچوں نے چیخ چیخ کر گاڑی میں ایک شور برپا کررکھا تھا پیچھے بیٹھی عورت انہیں چپ کروانے کی بھرپور کوشش میں تھی لیکن جیسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چیخنے پر مجبور تھے۔ خود اس عورت کی اپنی حالت پتلی ہورہی تھی۔ منظور احمد گاڑی میں لگے بیک مرر میں اپنے پیچھے نظریں جمائے یہ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا کہ شاید کوئی اور گاڑی بھی ان کے پیچھے آرہی ہو تو شاید مدد مل جائے لیکن یہ اس کی صرف خام خیالی ہی تھی کیونکہ میلوں تک کسی گاڑی کی کوئی ہیڈ لائٹس وغیرہ کا نام ونشان تک نہ تھا اور دوسرے لمحے اس نے سر جھٹکتے ہوئے رکی گاڑی کو فل اسپیڈ سے اسی بلا کی جانب بڑھا دیا اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے چوتھا گیئر لگایا اور سیدھا اس سامنے نظر آنے والی بلا کی جانب دیکھتے ہوئے گاڑی اس پر چڑھادی......

بلا شاید اس سلوک کی توقع بالکل نہیں رکھتی تھی اور ابھی تک سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی اپنے دانت نکچا رہی تھی گاڑی کو کسی بپھری ہوئی عفریت کی طرح اپنے نزدیک بڑھتے دیکھ کر اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کرتی گاڑی کسی بپھرے ہوئے وحشی سانڈ کی طرح اس سے ٹکراتی ہوئی فراٹے بھرتی آگے نکل گئی......

وہ عفریت گاڑی کی زوردار ٹکر سے اچھل کر سڑک کے بائیں جانب گری اور لڑھکتی ہوئی اندر درختوں میں کہیں غائب ہوگئی۔ وہ لوگ اس کے انجام کو دیکھنے کی بجائے گاڑی میں خوف سے سمٹے اور خود کے زندہ بچ جانے پر شکر ادا کرتے آگے بڑھتے چلے گئے۔

منظور احمد کی حاضر دماغی کام آگئی تھی ورنہ شاید وہ عفریت ان میں سے کسی کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوچکی ہوتی۔ رات مزید گہری ہوتی چلی جارہی تھی لیکن ابھی ان کا سفر باقی تھا۔ انہیں ہر لمحہ یہی محسوس ہونے لگا جیسے ابھی درختوں کے دونوں طرف سے کوئی نہ کوئی مصیبت وارد ہوجائے گی۔ ان پر اس قدر خوف طاری ہوچکا تھا کہ انہیں درخت بھی دیوؤں کی مانند لگ رہے تھے کہ جیسے ان کے نزدیک پہنچتے ہی ان پر جھپٹ پڑیں گے۔ ان کے محتاط اندازے کے مطابق ابھی انہیں مزید بیس کلومیٹر کا سفر طے کرنا تھا لیکن یہ بیس کلومیٹر انہیں دو ہزار کلومیٹر کے برابر محسوس ہورہے تھے کیونکہ جس طرح کے حالات پیش آرہے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ان پر گزرنے والا ہر پل ایک نئی مصیبت لے کر آرہا تھا۔

گاڑی میں ایک گھمبیر خاموشی طاری تھی ہر شخص اپنے اپنے دل میں قرآنی آیات کا ورد کررہا تھا اور اس مصیبت زدہ سفر کے ختم ہونے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ منظور احمد اب محتاط ہوگیا تھا اور سڑک کے سامنے نظر

سادگی

ایک برطانوی فوجی افسر جو کسی مشہور سیاستدان کا بیٹا تھا، کسی رنگروٹ سے ناراض ہوگیا، اور اسے برا بھلا کہنے لگا۔ اسے اپنی خاندانی وجاہت پر بڑا ناز تھا۔ اس نے رنگروٹ کو کافی سست کہا۔

''جانتے ہو میرا باپ کون ہے؟''

رنگروٹ نے سادگی سے جواب دیا۔

''میرے علم میں آپ وہ پہلے شخص ہیں جو اپنے باپ کے بارے میں دوسروں سے معلومات حاصل کررہے ہیں۔''

(شمس الحق شمسی۔ ڈرگ روڈ کراچی)

رکھنے کے ساتھ دائیں بائیں بھی دیکھتا جارہا تھا وہ اگر اکیلا ہوتا تو شاید اتنا فکر مند نہ ہوتا لیکن اس وقت اس کے ساتھ پوری فیملی تھی اور وہ انہیں کسی قسم کی مصیبت سے دوچار کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پیٹرول ٹینک فل کروالیا تھا اس لئے اس طرف سے کوئی پریشانی نہ تھی۔ چھوٹی سڑک پر گاڑی کی رفتار تیز کرنے پر کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ یہ ایک میٹل سڑک تھی دوسرا رات کے وقت دور دور تک کسی اور گاڑی کا نام ونشان نہیں تھا اس لئے وہ آگے بڑھتے جارہے تھے۔

ابھی انہوں نے چھ سات کلومیٹر تک فاصلہ مزید طے کیا ہوگا کہ اچانک ان کی گاڑی کی بریکیں چیختی ہوئیں سڑک پر رکتے رکتے بھی پچیس تیس فٹ تک گھسٹتی ہی چلی گئیں۔ اچانک بریک لگانے سے سڑک پر ٹائروں کے نشان پڑ گئے اور ربڑ کے جلنے کی بدبو گاڑی کے آس پاس پھیل گئی۔ منظور احمد آنکھیں پھاڑے غور سے بیک مرر میں دیکھ رہا تھا گاڑی کے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر ایک ایک شخص پڑا دکھائی دیا۔ اس کا سفید لباس خون میں لت پت تھا اور وہ یوں ٹیڑھے میڑھے انداز میں سڑک پر پڑا تھا جیسے کسی نے گیلا تولیہ نچوڑ کر رسی پر ڈال دیا ہو۔

یااللہ...... یہ کون تھا؟...... اس وقت رات کے اندھیرے میں اچانک سڑک پر کیسے نکل آیا؟ کہیں حقیقت میں تو انہوں نے اپنے علاقے کے کسی مسافر کو تو نہیں مار دیا؟ ہوسکتا ہے یہ شخص یہیں آس پاس کے کسی اور علاقے کا ہو اور کسی مصیبت میں گرفتار ہو؟ یہ سب سوالات ان سب کے ذہنوں میں بجلی کی طرح کوند رہے تھے اور وہ سب بے بسی سے گاڑی میں بیٹھے اپنے ہونٹ چبا رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ کیا اسے اسی طرح اس حالت میں سڑک کے درمیان چھوڑ کر فرار ہوجائیں۔ ہوسکتا ہے وہ زندہ ہو اور اگر اسے طبی امداد مل جائے تو شاید اس بے گناہ کی جان بچ جائے۔ یہ سب کچھ منظور احمد کے دماغ میں گڈمڈ ہورہا تھا۔ ''کیا کریں گاڑی سے اتر کر جا کر دیکھوں۔''

منظور احمد کی آواز گونجی اور وہ سب یوں اچھل پڑے جیسے گاڑی میں کوئی بم پھٹ پڑا ہو کیونکہ وہ سب خوف سے آنکھیں پھاڑے گاڑی کے پیچھے سڑک پر خون میں لت پت اس شخص کو دیکھنے میں مصروف تھے۔

''نہیں نہیں...... جلدی سے نکل چلو پتہ نہیں حقیقت میں کوئی انسان ہی ہے یا اس بھیس میں کوئی مصیبت۔'' ساتھ بیٹھی اس کی بیوی نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی شاید وہ بہت خوفزدہ ہوگئی تھی۔ بچے سہمے سہمے اپنے ساتھ بیٹھی اس عورت سے چمٹے ہوئے تھے۔ انہیں شاید پوری طرح حقیقت سے آشنائی نہ تھی اسی لئے وہ صرف خوف سے سمٹے بیٹھے تھے۔

منظور احمد نے کچھ دیر تک سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ کوئی اور رسک نہیں لینا چاہتا تھا لیکن اسے اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ رات کے اس وقت اس سنسان سڑک پر ان عجیب وغریب حالات میں ایک پیدل شخص زندہ کیسے بچ سکتا ہے؟ اس لئے ہو نہ ہو یہ کوئی اور افتاد ہوسکتی تھی اسی لئے اس نے اپنی بیوی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

ابھی بھی مزید دس کلومیٹر تک کا فاصلہ طے باقی تھا۔ وہ سب دل ہی دل میں خیر خیریت سے شام نگر پہنچنے کی دعائیں کررہے تھے۔ ابھی انہوں نے بمشکل دو کلومیٹر تک فاصلہ طے کیا ہوگا کہ انہیں دور سڑک کے دائیں جانب گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں ایک عورت سفید لباس میں چلتی دکھائی دی۔ وہ یوں سڑک سے دائیں جانب درختوں کے نیچے چل رہی تھی جیسے کسی پائیں باغ میں چہل قدمی کررہی ہو۔ اس کے کھلے بال ہوا نہ ہونے کے باوجود دائیں بائیں اڑ رہے تھے سوچنے کی بات تھی کہ موسم میں کسی قدر خنکی تھی لیکن ہوا کا نام ونشان نہ تھا پھر اس کے بال ہوا میں کیسے اڑ رہے تھے؟

جیسے جیسے وہ اس کے نزدیک پہنچ رہے تھے اس کے خدوخال واضح ہوتے جارہے تھے اس کے جسم پر سفید لباس تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے پاؤں

لگے تھے لیکن پیچھے کی جانب نہیں تھے جس طرح عام طور پر کہا جاتا ہے کہ چھل پیری یا چڑیل کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں۔

لیکن اس وقت جو عورت ان کے سامنے موجود تھی وہ اپنے سیدھے پاؤں سے چل رہی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ ماڈرن بلا ہو؟ یہ مضحکہ خیز خیال منظور احمد کے دل میں اس نازک صورتحال میں بھی آگیا اور وہ اپنی سوچ پر پہلی بار ہنس پڑا۔ اس کے ساتھ بیٹھی اس کی بیوی اس کے ہنسنے پر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی دماغی حالت مشکوک ہوگئی ہو۔ اسے کچھ کچھ شک ہونے لگا کہ ان پے در پے نامناسب حالات کا اثر کہیں اس کے شوہر کے دماغ پر نہ ہوگیا ہو لیکن دوسرے لمحے اسے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا کیونکہ منظور احمد نے ان سب کو اس لڑکی کی جانب اشارہ کرکے اصل بات بتائی جس پر اسے ہنسی آئی تھی۔ اب وہ سب بھی دور نظر آنے والی اس لڑکی کی جانب ہی دیکھ رہے تھے۔

منظور احمد نے اس لڑکی سے فاصلہ رکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم کردی تھی۔ پھر بھی آہستہ آہستہ گاڑی اور اس لڑکی کے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا سمجھ سے بالا تر تھا کہ آیا وہ لڑکی کھڑی تھی یا چل رہی تھی؟ کیونکہ گاڑی اس کے نزدیک ہورہی تھی اور وہ لڑکی چلتی نظر آنے کے باوجود آگے کیوں نہیں جارہی تھی؟ جب ان کے اور لڑکی کے درمیان فاصلہ تقریباً پندرہ فٹ کے قریب رہ گیا تو لڑکی نے اچانک اپنا چہرہ گاڑی کی طرف گھما دیا......

اُف خدایا اس لڑکی کی آنکھیں بے نور تھیں اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کی جگہ سفید سفید آنکھیں انہیں یوں گھور رہی تھیں جیسے وہ ان سب کو گاڑی میں بیٹھے ہونے کے باوجود بہت اچھی طرح دیکھ رہی ہو۔ اس کے بال ہوا میں زیادہ اڑنے لگے اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں اوپر اٹھا لیا جیسے تصور میں کسی کی گردن دبوچ رہی ہو اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کے لمبے ناخن چھ چھ انچ کے تو ضرور ہونگے اور ایک ایک انچ کے قریب مڑے ہوئے تھے اور یوں اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے وہ ابھی اچھل کر ان میں سے کسی کی گردن دبوچ لے گی۔ وہ سب جو بڑی متجسس نظروں سے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

یوں اچانک پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھا تو ان سب کے منہ سے خوف کے مارے چیخیں نکل گئیں اور منظور احمد خود بہت خوفزدہ ہوگیا تھا اور اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹتا چھوٹتا بچا۔ ورنہ گاڑی دائیں طرف درختوں سے ٹکرا جاتی۔ اس نے گاڑی کو کنٹرول کرتے ہوئے اور اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے گیئر بدلا اور گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے اسے اس لڑکی سے ٹکرانے کی بجائے آگے بڑھا دیا۔ وہ یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکی شاید اسی صورتحال کے لئے تیار نہیں تھی اور اچھل کر ایک جانب جھکی اور دوسرے لمحے گاڑی شائیں کی آواز سے اس کے نزدیک سے نکل گئی اور انہوں نے جب بیک مرر میں دیکھا تو وہ ان ہی کی طرف دیکھ کر غصے سے تلملا رہی تھی۔ ظاہر ہے اپنے شکار کو یوں ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر شکاری کب چین سے بیٹھتا ہے۔ اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ اس سے کافی دور نکل آئے۔

منظور احمد نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی اور پھر کچھ منٹوں کے بعد انہیں شام نگر کے مکانات نظر آنے لگے۔ یہ دیکھ کر ان سب کے سینوں سے یوں ہوا خارج ہوئی جیسے کسی غبارے کے منہ سے اچانک دھاگہ کھولنے کے بعد ہوتی ہے۔

چھوٹی سڑک سیدھی شام نگر کے اندر تک جاتی تھی اس لئے انہیں پریشانی نہیں تھی۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ سڑک سے اتر کر اس گلی میں داخل ہوگئے جہاں شادی والے گھر میں ان کا بڑی بے چینی سے انتظار ہورہا تھا۔

اگر قسمت ان کا ساتھ نہ دیتی تو شاید اس وقت وہ سب خوشی کے گیتوں کی جگہ ایک صفِ ماتم بچھوانے کا سبب بنے ہوتے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ''جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔''

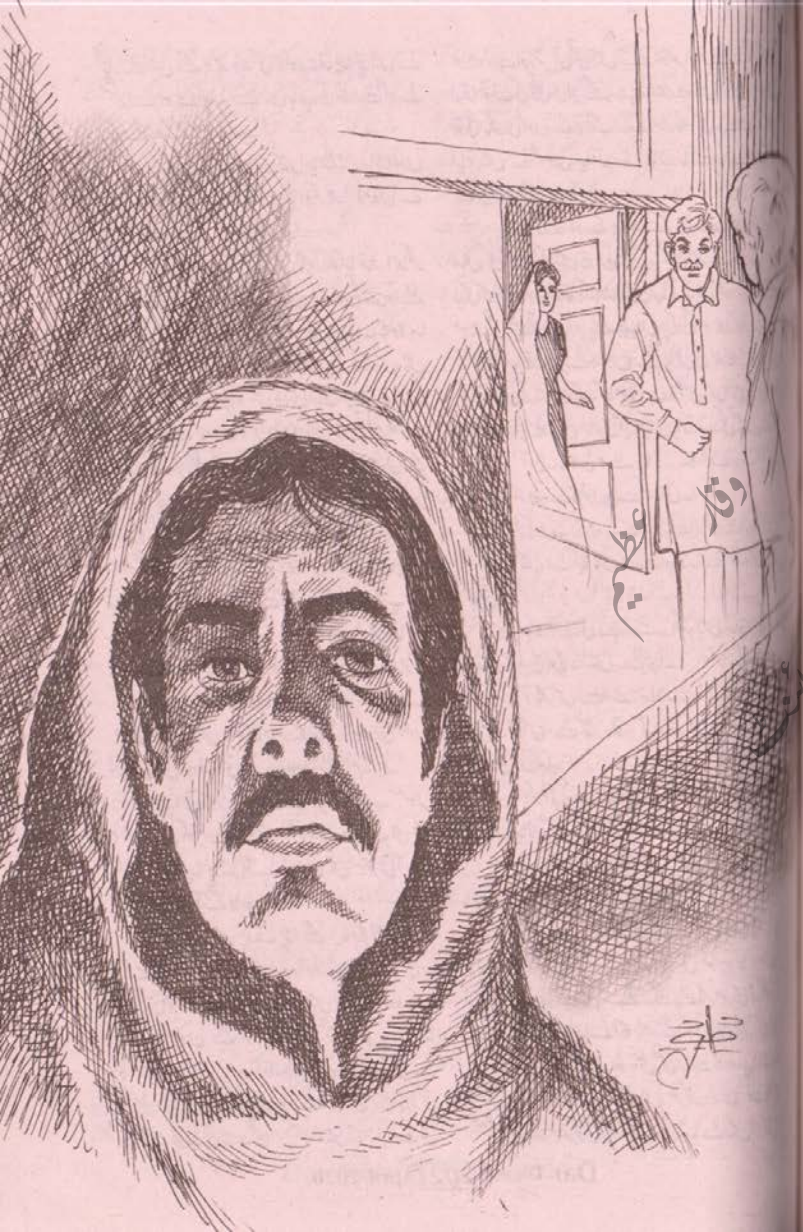

پراسرار قوت

رضوان علی سومرو۔ کراچی

خوبرو حسینہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس نے نوجوان سے کہا تمہارے ساتھ گزارے ہوئے وقت میں کبھی نہ بھولوں گی اور ویسے کبھی نہ چاہوں گی کہ میرا زہر تمہاری رگوں میں دوڑنے لگے اور پھر.....

خوف کے دھندلکوں میں لپٹی تحریر جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری عمر پچیس سال تھی والد کے انتقال کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اپنا گھر اور شہر سب چھوڑ دیا اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں آ کر مقیم ہو گیا تھا گاؤں کا نام احمد نگر تھا احمد نگر بڑا ہی خوبصورت حسین اور قدرتی نظاروں سے بھرپور تھا چونکہ والد صاحب کے سوا میرا کوئی اور تھا بھی نہیں والدہ بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں اور چنانچہ ابا نے مجھے ماں بن کر بھی پالا اور باپ بن کر بھی والد صاحب کی بیماری نے بہت سے ایسے رشتہ داروں کے چہروں پر سے پردہ ہٹا دیا تھا جو کہ محبت کے دعوے میں سب سے آگے تھے ضرورت پڑنے پر وہ سب پیچھے رہ گئے میں نے اس وقت اپنے آپ کو سب سے زیادہ بے بس محسوس کیا تھا کہ میرے والد سرکاری اسپتال میں صرف اس لئے مر گئے کہ ان کے پاس علاج کروانے کے لئے پیسے نہ تھے گھر میں جو جمع پونجی تھی وہ سب خرچ ہو گئی۔ گھر کرائے کا تھا مالک مکان نے اتنی مہربانی کی کہ اتنی دیر تک مجھے ٹھہرنے کی اجازت دی جب تک ان کی تدفین نہ ہو گئی کفن دفن سارا خرچہ والد صاحب کے ایک دوست نے اُٹھایا تھا اُن کو بہت بعد میں ان کی بیماری کا پتہ چلا اور جب پتہ چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی والد صاحب انتقال کر چکے تھے چنانچہ میں والد صاحب کے دوست کے ساتھ ہی احمد نگر چلا آیا تھا۔

والد صاحب کے دوست نے شادی نہیں کی تھی اس کی کیا وجہ تھی مجھے معلوم نہیں تھا چنانچہ ان کا ایڈجسٹ ہونے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں وہ اکیلے تھے چنانچہ ایک کمرے میں وہ شفٹ ہو گئے، دوسرے میں میں۔ ''وہ بیٹے تم میرے عزیز ترین دوست اکلوتے لڑکے ہو اس لئے اب میں تم کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔'' انکل غفار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے انکل اب میرا آپ کے سوا اور بھی کون۔ میں یہاں ہی رہوں گا اور جاب کر کے آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میری بات سن کر وہ چند لمحے تک خاموش رہے اور پھر جذباتی لہجے میں بولے۔ ''بیٹے کاش اگر میری شادی ہوتی تو آج تمہارے جتنا میرا بھی ایک بیٹا ہوتا تو کیا میں اپنے بیٹے کو کام کرنے دیتا۔''

ان کی محبت سے میں کافی متاثر ہوا میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کے ایسے روپ بھی ہوتے ہیں وہ اپنے نہ ہوتے ہوئے بھی میرے لئے اتنا کچھ کر

تیار تھے لیکن مجھے بوجھ بننا بھی منظور نہ تھا چنانچہ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے ماں باپ کی خدمت کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔۔۔۔“

وہ بولے۔ ”نہیں میں نہیں جانتا میں چاہتا ہوں کہ تم پڑھو تعلیم مکمل کرو پھر جو چاہو کرنا۔“ انہوں نے میری بات کاٹ کر حتمی لہجے میں کہا۔

ان کی ضد کے آگے میں مجبور ہو گیا تھا۔ احمد نگر آنے کے ایک ہفتے کے بعد ہی میں نے کالج میں داخلے کے کوشش شروع کردی تھی احمد نگر یوں تو ایک چھوٹا سا گاؤں تھا مگر بہت ترقی پذیر تھا انتظامیہ نے گاؤں میں ہر ممکن سہولت دینے کی کوشش کی تھی ایک اسپتال تھا ایک اسکول تھا ایک پوسٹ آفس تھا اسکول میں تعلیم صرف میٹرک تک ہی ممکن تھی چنانچہ کالج کی تعلیم کے حصول کے لئے دور جانا پڑتا تھا کالج گاؤں سے کافی دور تھا چنانچہ میرا داخلہ کالج میں بہ آسانی ہو تو گیا لیکن آنا جانا ایک بڑی ہی پرابلم تھی کالج جانے کے لئے مجھے بس اسٹاپ تک پیدل جانا پڑتا تھا بس اسٹاپ گھر سے کافی دور تھا بس اسٹاپ تک جانے کے دو راستے تھے پہلا راستہ تو کافی طویل تھا اس میں وقت زیادہ لگتا تھا لیکن دوسرا راستہ کافی مختصر تھا جو کہ کھیتوں سے ہو کر جاتا تھا چنانچہ میں ہر دفعہ کھیتوں والے راستے سے ہو کر ہی جاتا تھا تاکہ میں جلد از جلد پہنچ سکوں بس دن میں دو دفعہ چلتی ایک صبح اور دوسرا شام میں۔

یہ اس روز کی بات ہے کہ میں حسب معمول ناشتہ کر کے گھر سے نکلا تھا انکل مجھ سے پہلے ہی نکلا کرتے تھے چنانچہ میں اپنے خیالوں میں مستغرق آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک میں چونک پڑا مجھے ایسا لگا جیسے کہ کسی نے میرا نام پکارا ہو دوسری بار وہ آواز نہایت واضح تھی وہ آواز کسی عورت کی تھی اس سناٹے میں جہاں دور دور تک سوائے کھیتوں کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔۔۔۔

کاشف۔۔۔ اس بار وہ آواز دوبارہ میرے کانوں سے ٹکرائی وہ آواز سن کر میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی ایک عجیب سی بات تھی اس آواز میں آواز نہایت ہی خوبصورت اور شریں تھی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی نہ تھا خوف کی ہلکی سی لہر مجھے اپنے اندر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی کچھ ہی لمحوں کے توقف کے بعد پھر کسی نے میرا نام لیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ آواز سامنے والے برگد کے پیڑ کے پیچھے سے آرہی ہے۔۔۔

میں ڈرتے ہوئے برگد کے پیڑ کے پیچھے گیا تو وہاں کسی کو نہ پا کر میں حیران رہ گیا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں کوئی نہ تھا بلکہ فضا میں نہایت ہی مسحور کن خوشبو موجود تھی جیسے تھوڑی دیر پہلے یہاں پر کوئی موجود ہو۔۔۔

اچانک میرے کانوں نے پائل کی جھنکار سنی پائل کی آواز سن کر میں چونک گیا میرے ذہن میں بچپن کی سنی بھوتوں اور چڑیلوں کی ساری کہانیاں یاد آنے لگی تھیں۔

”آج۔۔ کالج مت جاؤ۔۔ کاشف۔۔“ ایک نسوانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”کیوں۔۔“ میرے منہ سے از خود نکلا۔

”میں نے کہا ناں مت جاؤ۔۔“ آواز میں التجا تھی۔

”جانا ضروری ہے۔۔۔ اگر نہیں جاؤں گا تو پڑھائی کا ہرج ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر بس سے مت جاؤ۔۔۔“ آواز آئی۔

”بس سے نہیں تو کیا اُڑ کر جاؤں۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”اگر اُڑ کر جا سکتے ہو۔ تو شوق سے مگر تم اس سے نہیں جاؤ گے۔۔۔“

”میں تو جاؤں گا میں تمہاری بات کیوں مانوں۔“ میں نے جھلا کر جواب دیا۔

میری بات پر چند لمحے تک خاموشی رہی پھر ایک مسحور کن خوشبو مجھے محسوس ہوئی اس خوشبو کا احساس نہایت شدید تھا مجھے چکر آنے لگے تھے پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی رات کا گھپ اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا چاروں طرف سناٹا فضا میں جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں سناٹے میں ارتعاش

پیدا کر رہی تھیں میں اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا تو وہاں مجھے اندھیرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا ٹھنڈ کا احساس میرے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ میں سارا دن بے ہوش پڑا رہا تھا اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا تھا میں جانتا تھا کہ مجھے کالج جانے سے روکنے کے لئے اس پُر اسرار قوت نے میرے ساتھ یہ کیا تھا مگر وہ پُر اسرار قوت کون تھی اور مجھ سے کیا چاہتی تھی اور مجھے کالج جانے سے کیوں روکنا چاہتی تھی یہ سوال میرے لئے سربستہ تھے۔

بہرحال کالج کا وقت نکل چکا تھا اور مجھے کافی دیر ہو چکی تھی اور انکل پریشان ہو رہے ہوں گے رات کے اندھیرے میں خوف کا ایک احساس میرے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔

اچانک میں چونک پڑا برگد کے تنے پر مجھے کوئی چمکدار چیز نظر آئی جو کہ تنے سے چمٹی ہوئی ہولے ہولے رینگ رہی تھی میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو چونک گیا وہ ایک چمکدار سانپ تھا جو بالکل ریڈیم کی طرح چمک رہا تھا ایسا سانپ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا اس سانپ کا قطر کسی بھی طرح سے پانچ فٹ سے کم نہ تھا حیرت و خوف سے میرا برا حال تھا۔

اچانک میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا میری آنکھوں کے سامنے اس سانپ کا قطر چھوٹا ہونے لگا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا میرے لئے یہ منظر نہایت ہی حیرت انگیز تھا اور یہ کہ کسی پُر اسرار قوت نے مجھے بے ہوش کیا اور پھر ناقابل یقین حد تک چمکدار سانپ میرے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا تھا۔

کالج کا وقت تو نکل چکا تھا چنانچہ میں کراہتا ہوا اُٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا اور جیسے ہی میں گھر کے نزدیک پہنچا گھر کے باہر لوگوں کی بھیڑ نظر آئی گھر کے اندر سے کسی کے رونے کی آوازیں سنائی دیں، وہ آوازیں یقیناً انکل کی تھیں جو کہ رو رہے تھے ان کی آوازیں سن کر میں پریشان ہو گیا اور تیز تیز چلتا ہوا گھر میں اندر داخل ہو گیا گھر کا منظر بھی عجیب تھا انکل پچھاڑیں کھا رہے تھے اور تین سے چار لوگ ان کے سامنے کھڑے تھے جن میں ایک دو پولیس والے بھی تھے جو کہ ان کو تسلیاں دے رہے تھے مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے انکل کیوں رو رہے ہیں۔

انکل۔۔۔ میں چلایا۔

میری آواز سن کر انکل سمیت دوسرے لوگوں نے چونک کر میری طرف دیکھا دوسرے ہی پل انکل کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔

”میرا بچہ۔ میرا بچہ۔“ وہ چلاتے ہوئے میرے گلے لگ رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کہ وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہوں چند لمحوں تک وہ میرے گلے سے لگ کر روتے رہے پھر آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے الگ ہو گئے۔

”میرا بچہ۔۔ اللہ کا شکر ہے تو بچ گیا ورنہ میں تو امید کھو بیٹھا تھا۔“

”یہ کیا ہو رہا ہے۔۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔۔۔“ میں بولا۔

”مسٹر کاشف اتنی دیر تک آپ کہاں تھے اور آپ بچے کیسے۔“ ایک پولیس والے نے میرے نزدیک آکر حیرت سے مجھے مخاطب کیا۔

”کیا مطلب۔“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”آپ جس بس میں روزانہ کالج جاتے ہیں وہ گہرے کھڈ میں گر گئی سارے لوگ جان بحق ہو گئے ہم کافی دیر سے تمہاری لاش تلاش کر رہے تھے جب تم نہ ملے تو ہمارا خیال یہی تھا کہ کوئی جنگلی جانور تم کو کھا گیا۔“ انسپکٹر نے ایک ہی سانس میں جواب دیا۔

اس کی بات سن کر میں چونک گیا۔

تو کیا وہ پُر اسرار آواز مجھے موت سے بچانا چاہتی تھی۔

مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ میں نے اس سے ضد کی تھی کہ میں ضرور جاؤں گا مگر وہ بضد تھی کہ میں نہ جاؤں کیا وہ جان گئی تھی کہ بس کو حادثہ پیش آنے والا ہے ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ بس پہاڑی چڑھائی چڑھتے

ہوئے کھڈ میں جا گرے۔

آج مجھے اندازہ ہوا تھا کہ انکل مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں ایک بات تو تھی کہ اس پراسرار قوت نے میری جان بچائی تھی۔

اس کے بعد اگلے دو دن تک احمد نگر میں زندگی رکی رہی ان مرنے والوں کی یاد میں اس کے بعد کاروبار زندگی معمول پر آنے لگا تھا اگلے کچھ دن تک سب کچھ ٹھیک چلتا رہا تھا انکل باقاعدہ کام پر جا رہے تھے۔

انکل احمد نگر ریلوے میں ملازم تھے ان کا کام مسافروں کی ٹکٹ چیک کرنا ہوتا تھا چنانچہ وہ کبھی ایک اسٹیشن کبھی دوسرے چنانچہ اسی طرح زندگی کا کام کاج چل رہا تھا میں نے کالج آنا جانا شروع کر دیا تھا لیکن بس کے بجائے پیدل سفر کو ہی ترجیح دینا شروع کر دیا تھا میرے ذہن سے آہستہ آہستہ ہر طرح کے خیالات محو ہونے لگے تھے پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔

یہ اس روز کی بات ہے موسم نہایت خوشگوار تھا صبح سے ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوائیں دل و دماغ میں نہایت اچھا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

میں حسب معمول ناشتہ کر کے کالج کے لئے نکل گیا تھا بس کے اس حادثے کی یادیں دل سے نکلتی جا رہی تھیں میں آرام سے چلتا ہوا آگنگناتا ہوا چلا جا رہا تھا، پھر میں اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں اس پراسرار آواز نے میری جان بچائی تھی میں آرام سے چلتا ہوا برگد کا درخت عبور کر کے کھیتوں کے درمیان بنے راستے کا انتخاب کیا، میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے ہلکی سی کراہ کی آواز سنائی دی آواز کسی لڑکی کی تھی میں نے ادھر اُدھر دیکھا مگر مجھے کوئی نظر نہ آیا میں نے محسوس کیا کہ وہ آواز کھیتوں کے اندر سے آ رہی ہے میں بے دھڑک اندر گھس گیا میں تھوڑا ہی چلا ہوں گا کہ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کہ سفید ساڑھی میں ملبوس تھی جس پر سیاہ رنگ کی دھاریاں موجود تھیں اس طرح کا لباس اس علاقے میں، میں نے پہلی بار دیکھا تھا حیرت کی بات تھی کہ ایک لڑکی اس قدر بھاری زیورات میں کیا کر رہی ہے کیا اس کو ڈر نہیں لگ رہا۔۔۔۔ وہ لڑکی اپنا پیر اُٹھائے کچھ کر رہی تھی لڑکی کو دیکھتے ہی میں ایک لمحے کے مبہوت ہو کر رہ گیا اتنی حسین اور خوبصورت لڑکی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی تھی اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے ہندو دیومالائی کہانیاں یاد آنے لگی تھیں ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اپسراز مین پر نیچے اتر آئی ہو اس کے معصوم چہرے پر درد و کرب کے تاثرات عیاں تھے میں اس کے نزدیک پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے پیر سے کانٹا نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں کچھ مدد کروں۔ میں نے قریب پہنچ کر کہا۔

میری بات سن کر وہ چونکی اور سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اس کو دیکھ کر میں چونک گیا اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔

''کیا گھور رہے ہو تم۔ دیکھتے نہیں ہمارے پیر پر کچھ لگ گیا ہے۔'' اس کی آواز میں درد نمایاں تھا۔

''ایں۔۔۔ ہاں۔۔'' میں چونک پڑا۔

''کیا۔ لڑکی دیکھی نہیں۔ چلو ہماری مدد کرو۔ ہمارے پیر میں کانٹا لگ گیا ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

اس کی آواز سن کر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ میں یہ آواز اس سے پہلے بھی سن چکا ہوں لیکن کہاں یاد نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں۔ ہاں۔'' میں گھبرا کر فوراً اس کے پیر پر جھک گیا واقعی ایک بڑا سا کانٹا پیر میں موجود تھا جو اس سے نکل نہیں رہا تھا میں نے آگے سے اس کے پیر کو چھوا پیر کو چھوتے ہی ایک سنسنی سی مجھے اپنے اندر ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی تھی کانٹا تو میں نے اس کے پیر سے نکال دیا مگر پیر چھوڑنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''اب۔ چھوڑو۔ بھی پیر کو۔'' وہ تنک کر بولی تھی اور میں نے گھبرا کر پیر چھوڑ دیا تھا مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ میں نے یہ کیا حرکت کی۔

''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں تمہارا شکریہ۔'' وہ جیسے چہرہ پڑھتی ہوئی بولی۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس سے زیادہ اور کوئی جملہ مجھے سوجھ نہ سکا۔

میری بدحواسی پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اس کی ہنسی سن کر مجھے ایسا لگا کہ میرے کانوں میں شہد گھل گیا ہو جیسے اس ہنسی میں بہت سے ساز ایک ساتھ بج اُٹھے ہوں۔

''تم اس قدر گھبرا کیوں رہے ہو۔ میں تم کو کھا تو نہیں جاؤں گی۔'' وہ ہنسی۔

میں نے دل میں کہا کہ کون تم سے گھبرا رہا ہے ہم تو تمہارے حسن سے مرعوب ہو چکے ہیں۔

''نہیں تو۔'' میں نے جواب دیا۔

''شکریہ۔ تم نے مدد کی۔'' اتنا کہہ کر وہ جانے لگی۔

تمہارا نام کیا ہے۔ وہ جانے لگی تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک دم رکی اور پیچھے مڑ کر دیکھا اور اٹھلا کر بولی۔

''پارو ہے ہمارا نام پر تم نے ہم پر احسان کیا ہے اس لئے تم کو ایک بات بتا دیتے ہیں۔'' وہ بولتے بولتے رکی۔

''کیا بات بتاؤ گی۔'' میرا اعتماد اب بحال ہو گیا تھا۔

تمہارے فاتحے کی بات ہے۔ جو انسان کے نصیب میں ہو وہ اس کو مل کر رہتا ہے وہ خوشی ہو یا غم۔'' اتنا کہہ کر وہ چم چم کرتی اور لہلہاتے کھیتوں میں گم ہو گئی۔

اس کی بات میرے پلے نہیں پڑی چنانچہ میں اس سے مطلب پوچھنے کھیتوں میں داخل ہو گیا مگر مجھے وہاں کوئی نظر نہ آیا اتنی جلدی کسی کا غائب ہو جانا سمجھ سے باہر تھا میں تھوڑی دور آگے تک گیا مگر وہ مجھے نظر نہ آئی۔

اچانک میں اچھل پڑا۔ میرے اچھلنے کی وجہ ایک سفید رنگ کا لمبا سانپ تھا جس کی جلد پر سیاہ رنگ کی دھاریاں موجود تھیں جس سے سانپ بہت خوبصورت لگ رہا تھا ایسا سانپ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، سانپ رینگتا ہوا آگے نکل گیا سانپ کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔

کھیتوں میں سانپوں کا پایا جانا معمولی بات تھی مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ لڑکی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اس لڑکی کا پراسرار طریقے سے اتنی جلدی غائب ہو جانا میری سمجھ سے باہر تھا اور اس کی بات بھی پلے نہیں پڑی تھی کہ وہ نصیب کے متعلق کیا بتانا چاہ رہی تھی لیکن بہت جلد یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

لڑکی کے جانے کے میں کچھ دیر تک کھڑا رہا اور اس کے بعد میں وہاں سے چل دیا گھڑی میں وقت تو آٹھ بج رہے تھے میری پہلی کلاس آٹھ بجے لگ جاتی تھی چنانچہ میں جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے گھر کی راہ لی تھی گھر پہنچا تو انکل جا چکے تھے چنانچہ میں نے چائے تیار کی اور ٹی وی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ مجھے گھر کے باہر کچھ آوازیں سنائی دی تھیں وہ آوازیں لوگوں کی اور کسی گاڑی کی تھیں کوئی گاڑی ہمارے دروازے پر آ کر رکی تھی میں نے فوراً ٹی وی بند کیا اور دروازہ کھول دیا گھر کے دروازے پر ایک ایمبولینس موجود تھی ایمبولینس سے اترنے والے لوگ انکل کے آفس کے لوگ تھے ان میں ایک میرے قریب آیا جو کہ احمد نگر کا اسٹیشن ماسٹر تھا ان سب کے چہروں پر حزن و ملال کی کیفیات نمایاں تھیں۔

''غفار اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔'' اسٹیشن ماسٹر نے مجھے نہایت دکھ سے مجھ پر بم پھوڑتے ہوئے کہا۔

یہ جملے نہیں تھے ایک پہاڑ تھا جو مجھ پر ٹوٹا تھا میں سکتہ کی سی کیفیت میں آ چکا تھا۔

''دل کا دورہ پڑا تھا غفار بھائی کو۔ اسپتال لے جاتے ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔'' اسٹیشن ماسٹر کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک بار پھر یتیم ہو گیا ہوں۔ اس لڑکی کی بات اب میرے پلے پڑی تھی کہ اس نے مجھ سے کیوں نصیب، خوشی اور غم کی بات کی تھی کیا وہ جانتی تھی کہ انکل مر جانے والے ہیں کہیں وہ لڑکی اور وہ پراسرار آواز ایک تو نہیں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے انکل کی میت دفن کر دی گئی لیکن میں آنسوؤں کے سوا ان کو کچھ نہ دے سکا۔

انکل کے جانے کے ایک ماہ کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ زندگی گزارنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے

ہی ہونگے ورنہ یہ دنیا جینا مشکل کردیتی ہے اس مشکل موقع پر اسٹیشن ماسٹر صاحب کام آئے اور انہوں نے وعدہ کرلیا کہ وہ میرے لئے ریلوے میں ملازمت کی کوشش ضرور کریں گے ایک ہفتے کے بعد ہی انہوں نے مجھے پندرہ ہزار ماہوار پر ملازم رکھوا دیا ملازمت کے بعد پہلی بار میں پرسکون ہوکر سویا تھا لیکن وہ لڑکی اور آواز کو میں کبھی نہیں بھلا پایا تھا۔

ڈھائی ماہ میں نے احمد نگر ریلوے اسٹیشن پر گزارے ہونگے اس کے بعد ایک روز اسٹیشن ماسٹر نے مجھے بلایا اور کہا۔

''بیٹا تمہارا ٹرانسفر روپ نگر میں کردیا گیا ہے اب تم کل ہی روانہ ہوجاؤ اور وہاں جاکر کشن کمار سے مل لو کشن کمار وہاں کا اسٹیشن ماسٹر ہے۔'' میں نے ان کو انکار نہ کیا اور روپ نگر جانے کے لئے تیار ہوگیا روپ نگر احمد نگر سے بھی زیادہ خوبصورت اور حسین علاقہ تھا لیکن اس علاقے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی اور وہ ہندو زیادہ تر سرمایہ دار تھے جن میں سے بہت سے غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے یہ ساری باتیں مجھے روپ نگر جاکر معلوم ہوئی تھیں۔

کشن کمار نے مجھے اسٹیشن پر رہنے کے لئے ایک چھوٹی سی کوٹھری دے دی جو کہ خالی تھی کشن کمار بھی میری ہی طرح اکیلا آدمی تھا اس لئے وہ میرے برابر والی کوٹھری میں تھا مجھے یہاں آئے ہوئے چند دن ہی گزرے تھے، میں اپنی ڈیوٹی پوری کرکے اپنی کوٹھری میں آکر لیٹ گیا، رات کے گیارہ بج چکے تھے اور میں بہت تھک چکا تھا چنانچہ لیٹتے ہی مجھے نیند نے آگھیرا۔

اچانک کسی قسم کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی نہ جانے میں کتنی دیر سویا ہوں گا مجھے اندازہ نہ تھا یوں بے وقت اُٹھنے سے مجھے سر میں درد ہونے لگا تھا وہ آواز نہ جانے کیسی تھی جس نے مجھے بیدار کردیا تھا چند لمحے تک میں ویسے ہی لیٹا رہا۔

اچانک وہی آواز میرے کانوں سے پھر ٹکرائی جس نے میری نیند خراب کردی تھی میں نے کھڑکی میں وقت دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے تو گویا میں تین گھنٹے سویا ہوں گا میں آہستہ سے اٹھا اور قمیض پہن کر کوٹھری سے باہر نکل آیا پلیٹ فارم کا منظر دیکھ کر میں چونک گیا پلیٹ فارم پر ایک مال گاڑی موجود تھی مال گاڑی کو دیکھ کر میں چونک گیا کیونکہ میری اطلاع کے مطابق مال گاڑی روپ نگر سے ہفتے میں صرف تین دن لوڈ ہوتی تھی لوڈنگ بھی دن کی روشنی میں ہوتی تھی رات میں اس طرح کی کارروائی میرے سامنے پہلی بار تھی۔

روپ نگر چونکہ چھوٹا سا علاقہ تھا اس لئے پلیٹ فارم پر رات کے بارہ کے بعد ہی سنسان ہوجاتا تھا اس کی وجہ اس کی آخری ٹرین تھی جو کہ رات بارہ بجے رکتی تھی وہ بھی دس منٹ کے لئے اس کے بعد پلیٹ فارم خالی ہوجاتا تھا میں نے دیکھا کہ کشن کمار اسٹیشن ماسٹر بھی اس کے سامنے کھڑا تھا دو تین لوگ پلیٹ فارم کے باہر سے بڑے سائز کے لکڑی کے کاٹن کندھوں پر اُٹھائے مال گاڑی میں لوڈ کررہے ہیں مجھے تو کچھ گڑبڑ محسوس ہورہی تھی کہ اتنی رازداری سے کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اچانک ایک آدمی چلتے چلتے لڑکھڑایا اور گرپڑا اس کے گرتے ہی کاٹن کھل گیا اس کاٹن سے جو چیز باہر آئی اس کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ ایسا تو صرف فلموں میں ہی ہوتا تھا ان کاٹن سے باہر آنے والی چیز بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ گویا کشن کمار سرکاری ملازم ہوتے ہوئے اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث تھا۔

اس آدمی کے گرتے ہی کشن کمار ڈھارتا ہوا اس پر برس پڑا۔

''سور کے بچے۔ تیرے باپ پرشوتم کو پتہ چل گیا کہ تو نے کاٹن گرادیا ہے تو تیری میری لاش کو اگنی بھی نہیں ملے گی کاٹ کر کتوں کے آگے ڈال دے گا وہ۔۔۔۔''

''غلطی ہوگئی۔'' وہ آدمی معذرت کرتے ہوئے بولا۔

''چل اب سمیٹ اس کو دوبارا ایسا مت کرنا۔'' کشن کمار غصے سے بولا۔

پرشوتم کا نام سن کر میں چونک پڑا تھا پرشوتم روپ نگر کا جانا مانا امیر آدمی تھا مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنا بڑا آدمی وطن فروش ہوگا۔

اس بندے نے اسلحہ سمیٹ کر واپس کاٹن میں ڈال دیا اچانک کشن کمار پلٹا اور دوسرے ہی پل وہ چونک پڑا کیونکہ اس کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی جیسے ہی اس کی نظر پڑی میں گھبرا گیا اور میں نے رکنا گوارا نہ کیا اور واپس اپنی کوٹھری میں آکر لیٹ گیا ساری رات مجھے نیند نہ آئی بس ہر لمحے یہی خیال ستاتا رہا کہ ابھی کشن کمار اور اس کے ساتھی مجھے آکر پکڑ نہ لیں ساری رات اسی ڈر کے مارے میں سو نہ سکا۔

دوسری صبح کشن کمار نے مجھے اپنے آفس میں بلایا وہ چند لمحے تک مجھے گھورتا رہا اور کہنے لگا۔ ''تم بندے کام کے نظر آتے ہو۔ سوچ رہا ہوں تم کو مستقل کردوں۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''جی سر۔۔۔۔'' اس سے زیادہ اور کچھ نہ بول سکا میرے ذہن میں مستقل رات والا واقعہ گھوم رہا تھا۔

''ابھی تمہاری تنخواہ کیا ہے۔''

''سر جی۔ دس ہزار روپیہ ماہانہ۔''

ہوں۔ کشن کمار میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا اور پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ اتنی تنخواہ میں کیا ہوتا ہے اور اس دیش میں ریلوے ملازموں کو ملتا کیا ہے۔

شکر ہے کہ میں بہت سکون میں ہوں اور میں اکیلا ہوں اور میری ضروریات بھی کم ہیں۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ٹھاکر پرشوتم کا نام سنا ہے تم نے۔'' کشن کمار نے کہا۔

پرشوتم کا نام سن کر میں چونک گیا میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے رات والے واقعے کا تذکرہ کرے گا مگر خلاف توقع وہ کہنے لگا کہ ''پرشوتم کے پاس ایک جگہ خالی ہے بیس ہزار تنخواہ ملے گی اور کھانا پینا اور رہائش الگ۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اس لئے پرشوتم کے پاس بھیج رہا ہے تاکہ میں کہیں پولیس کو نہ بتادوں اور بیس ہزار واقعی ایک بڑی رقم تھی۔

جو میرے اکیلے بندے کے لئے کافی تھی میں سوچ میں پڑ گیا۔

''زیادہ سوچو مت تم پرشوتم کے راز سے واقف ہوچکے ہو جو اس کا راز جان لیتے ہیں تو پرشوتم یا تو انہیں مار دیتا ہے یا اپنے پاس رکھ لیتا ہے اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے۔'' کشن کمار کا لہجہ سرد تھا۔

اس کی بات سن کر میرا دل دھڑکنے لگا کیونکہ جان سب کو پیاری ہوتی ہے میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ میں کیا کروں۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کشن کمار غرایا۔

''کیا سوچ میں ڈوبے ہو۔ جلدی بتاؤ کیا کرنا ہے۔'' اس کے انداز میں سفاکی تھی۔

ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں جان ہے جہان ہے۔ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

میرے منہ سے رضامندی سن کر اس کے ہونٹوں پر نہایت معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی وہ مسکراہٹ بالکل ایسی تھی کہ بکرے کو دیکھ کر قصائی کے لبوں پر دوڑ جاتی ہے یہ ہوئی نا بات۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ کچھ دن تو پرشوتم کے یہاں رہ کر وقت گزاروں گا اور پھر موقع دیکھ کر فرار ہوجاؤں گا اور یہ شہر ہی چھوڑ دوں گا چنانچہ کشن کمار نے مجھے اسی وقت جانے کو کہا تھا چنانچہ میں اپنا سامان لے کر وہاں سے نکل آیا پرشوتم کی کوٹھی اسٹیشن سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا میں اپنے خیالوں میں مستغرق چلا جارہا تھا دن کے دس بجے کا وقت تھا لوگ اپنے اپنے کاموں پر جارہے تھے میں آہستہ پر چلتا جارہا تھا سڑک کے دونوں اطراف کھیتوں کا سلسلہ تھا چونکہ روپ نگر زرعی حیثیت سے زیادہ مشہور تھا۔

اچانک مجھے ایک عجیب قسم کی آواز سنائی دی وہ آواز کیسی تھی میں آج تک نہیں سمجھ پایا میں آواز کو اگنور کرکے آگے بڑھنے ہی لگا کہ مجھے پائل کی آواز سنائی دی جیسے کوئی عورت چھم چھم کرتی جارہی ہو۔

اچانک میرے دل میں اس پائل کی آواز سن کر

اس لڑکی کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہونے لگا تھا یہ ازخود ہوا تھا ورنہ میں لڑکیوں کے معاملے میں بہت پاک دامن ہوں نہ ہی آج تک کسی کی طرف بری نظر سے دیکھا نہ ہی ایسا کوئی ارادہ تھا، میں کھڑا سوچتا رہا کہ میں کیا کروں۔

اچانک میں نے دیکھا کہ کھیتوں سے کوئی باہر آرہا ہے ساتھ ہی پائل کی آواز بھی آرہی ہے آنے والی ایک لڑکی تھی جیسے ہی وہ میرے قریب آئی تو یہ دیکھ کر میں اچھل پڑا یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے کھیتوں میں ملی تھی جس کے پیر سے میں نے کانٹا نکالا تھا اس بار بھی وہ سفید رنگ کے لباس میں زیب تن تھی جس پر سفید دھاریاں تھیں۔

''سنو۔'' میری طرف دیکھ کر بولی۔

''جی۔'' اس کو دیکھ کر نہ جانے میں کیوں بوکھلا گیا شاید یہ رعب حسن تھا۔

''تمہارا نام کاشف ہے ناں۔''

''جج۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ آپ کو کیسے پتہ۔۔۔

''میں نے چونک کر پوچھا۔

''میں یہ کہنے آئی ہوں کہ پرشوتم کی حویلی میں جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں۔۔۔۔ وہاں کوئی خطرہ ہے۔۔۔''

میں گھبرا گیا۔

''ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو۔'' وہ تنگ کر بولی۔

''ہاں۔ آج وہاں چھاپہ پڑنے والا ہے تمہیں اس چھاپے میں پکڑوانے کا منصوبہ ہے پرشوتم کا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''مگر کیوں؟''

''اس لئے کہ تم اس کے کالے دھندے دیکھ چکے تھے اور وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑتا جو اس کا راز جان لے۔''

''مگر تم کون ہو اور میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں اور میرے بارے میں اتنا کیسے جانتی ہو۔''

''تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھ لو۔'' وہ دائیں بائیں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''ابھی مجھے جلدی ہے اگر مجھ سے ملنا چاہو تو آج رات بارہ بجے نرنجن لال کی حویلی میں آکر مل سکتے ہو۔ اتنا جان لو کہ پہلی بار بھی تمہیں بس میں چڑھنے سے میں نے ہی روکا تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ جا ہی لگی تھی کہ میں نے اس کو روک لیا ایک بات اور میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کہو وہ میری طرف مڑ کر بولی۔

''میں اگر ادھر نہیں گیا تو کشن کمار ناراض ہوگا۔''

میری بات پر وہ مسکرائی اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''کشن کمار کچھ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کرنے کے قابل رہے گا۔''

اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی جہاں سے آئی تھی اسی طرف مڑ گئی اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا یہ لڑکی ضرور پراسرار قوتوں کی حامل ہے جبھی اس کو سب پتہ چل جاتا ہے اسی نے دبے لفظوں میں انکل کی موت کی خبر دی تھی تو گویا یہ وہی تھی جس کی پہلی بار آواز سن کر مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے کہاں سنی ہے مگر اس کو مجھ سے کیا غرض تھی جو وہ میری مدد کر رہی تھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا میرے لئے یہ زیادہ اہم تھا کہ میں پرشوتم کے گھر نہ جاؤں مگر میں نے سوچا کہ میں دیکھوں تو صحیح کہ پولیس آئے گی یا نہیں میں پرشوتم کے گھر کی طرف چل پڑا۔

میں اس کے گھر سے تین میل کے فاصلے پر تھا کہ پولیس سائرنوں کی آواز سن کر میں چونک گیا پھر میں نے دیکھا کہ پولیس کی بہت سی گاڑیاں پرشوتم کے گھر کی جانب بڑھ رہی ہیں پھر مجھ سے وہاں رکا نہ گیا میں تیزی سے اسٹیشن کی جانب چلنے لگا۔

جیسے ہی میں اسٹیشن کے پاس پہنچا میں نے دیکھا کہ پولیس کی وہی گاڑیاں اسٹیشن کے باہر کھڑی تھیں کچھ ہی لمحوں کے بعد پولیس والے کشن کمار کو ہتھکڑیاں ڈال کر باہر لا رہے ہیں ان میں ایک بندہ اور بھی تھا لازمی پرشوتم کے سوا کوئی اور نہ تھا جاتے ہوئے کشن کمار نے مجھے جلتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر پولیس جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیسے ہی وہ جیپ میں سوار ہوئے میرا دل و دماغ چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ کشن کمار کی گرفتاری میں ضرور اس لڑکی کا ہاتھ شامل ہے ان دونوں کی گرفتاری کے بعد میرے لئے اب کوئی بھی خطرہ باقی نہ رہ گیا تھا۔

چنانچہ میں کوٹھری میں آکر سو گیا رات کے بارہ بجے ازخود میری آنکھ کھل گئی دل عجیب سی بے چینی سے گھرا ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے مجھے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہو میرے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے تھے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ مجھے نرنجن لال کی حویلی کی طرف جانا چاہیے مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نرنجن لال کی حویلی ہے کس طرف۔

اچانک مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی مجھے کہہ رہا ہو کہ تم فکر نہ کرو باہر نکلو تم خود بخود حویلی پہنچ جاؤ گے۔

میں کپڑے بدل کر باہر نکل آیا سڑک پر گھرا سناٹا طاری تھا باہر آتے ہی مجھے سردی کا احساس ستانے لگا تھا حالانکہ میں نے شرٹ کے اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی لیکن پھر بھی سردی محسوس ہو رہی تھی باہر آتے ہی مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ قبرستان والا راستہ پکڑ لوں قبرستان والا راستہ پکڑتے ہی مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی میری رہنمائی کر رہا ہو جیسے ہی میں نے قبرستان کو عبور کیا سامنے ایک کچی سڑک تھی میں اس سڑک پر چلتا چلا گیا جیسے ہی میں نے سڑک عبور کی سامنے ایک طویل سا میدان تھا اور حویلی اس میدان کے اندر موجود تھی میں میدان کے اندر چلا گیا۔

وہ حویلی خاصی پرانی تھی اس کا رنگ و روغن جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اس کی طرز و تعمیر بہت ہی پرانی تھی جیسے مغلوں کے دور کی حویلی ہو زمانے کے سارے موسموں کا اثر اس حویلی کے بیرونی حصے پر ہوا تھا اس حویلی کے سامنے کا پھاٹک ٹوٹ کر آدھا زمین کے اندر تھا اور آدھا باہر جھول رہا تھا میں پھاٹک کے باہر کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اندر جاؤں یا نہیں۔ اچانک ایک خوبصورت سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی یہ آواز اسی لڑکی کی تھی آواز سن کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے ویرانے میں دل سوز ساز چھیڑ دیا ہو۔

''کاشف اندر چلے آؤ۔'' وہ آواز مجھے ویرانے میں گونجتی محسوس ہوئی تھی۔

میں نے بغیر سوچے سمجھے پھاٹک کے اندر قدم رکھ دیا اور جیسے ہی میں نے پھاٹک سے گزر کر اندرونی ہال میں قدم رکھا اندر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اندر کا منظر بیرونی منظر سے بے حد مختلف تھا اندرونی ہال کی سجاوٹ بہت زیادہ شاہانہ طریقے سے گی گئی تھی پیسے کا بے دریغ استعمال مجھے یہاں نظر آیا تھا ہال کی ہر چیز نہایت قیمتی اور پر تعیش تھی میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا مگر وہ مجھے نظر نہ آئی۔

کاشف مجھے اپنے عقب سے آواز سنائی دی تھی میں چونک کر پلٹا تو میرے سامنے کھڑی تھی اس کو دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی اور میری نظریں ازخود جھک گئیں اس نے سرخ رنگ کی ریشمی ساڑھی باندھ رکھی تھی جس کا بلاؤز بہت تنگ تھا اس کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ کوندتی بجلیاں بلاؤز سے باہر آنے کے لئے بے تاب ہوں واقعی وہ قدرت کے بنائے سانچے میں ڈھلی تھی۔

میں ایک بار پھر اس کے سحر میں ڈوب گیا تھا حسن تو بہت دیکھا تھا کہ جس کے لئے بندہ اپنی جان دے سکتا تھا لیکن پارو کا سلگتا حسن ایسا تھا کہ جس کے لئے بندہ جان دے بھی سکتا تھا اور لے بھی سکتا تھا وہ میری طرف پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔'' اس کے یاقوتی لبوں کو جنبش ہوئی۔

''میں اس وقت آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں آپ نے مجھے ایک بڑے خطرے سے بچا لیا۔'' میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر وہ مسکرائی اس کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ سارے جہان کا حسن اس کے چہرے پر سمٹ آیا میں تو بس اس کے سحر میں ہی کھویا رہا۔ جیسے ہر چیز سے بیگانہ ہو کر میں اس کو دیکھتا رہا۔

اچانک اس کی آواز پر میں ہوش و حواس میں واپس آگیا وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کا درد ہمارا درد ہے پرشوتم اور کشن کمار کی کیا مجال اگر انہوں نے تم کو دوبارہ تنگ کیا تو مارے جائیں گے۔" وہ غضبناک ہو کر بولی۔

"کیا۔۔۔ مطلب۔۔۔" میں چونک پڑا۔

"اتنی بھی جلدی کیا ہے ہر بات کا مطلب جان لوگے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تم کون ہو۔" اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔

"وقت کا انتظار کرو وقت آنے پر سب جان جاؤ گے۔" اس کے خوبصورت لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔" میں نے اس سے پوچھا۔

میری بات سن کر وہ چند لمحے تک خاموش رہی پھر اس کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں اس حویلی میں بالکل اکیلی رہتی ہوں۔ اب تم آگئے ہو ناں میری تنہائی اور اکیلا پن سب دور ہو جائے گا۔

اس کی بات سن کر میرے دل میں مٹھائی کی ایک پوری دوکان کھل گئی میرے دل میں خوشی کے شادیانے بج اُٹھے ایک نہایت خوبصورت لڑکی میرے ساتھ وقت گزار کر اپنا اکیلا پن ختم کرنا چاہتی ہے۔

میں نے اپنی خوشی کا اظہار اس لئے نہیں کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا میرے پورے جسم میں ایک خمار سا دوڑ گیا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے صوفے پر بٹھا دیا اور خود میرے برابر میں بیٹھ گئی اتنی پاس کہ اس کے جسم سے نکلنے والی خوشبو بھی مجھے محسوس ہونے لگی تھی۔

"کچھ کھاؤ گے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

نہیں۔ اس کو اتنا پاس دیکھ کر میرا لہجہ اٹکنے لگا تھا۔

"کچھ پیو گے۔"

"نہیں بس تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بدستور اسی لہجے میں جواب دیا۔

"تو۔ اپنی باتیں کرو ناں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

میں بہت جلد ہی اس سے بے تکلف ہو گیا اس کو اپنے بارے سب کچھ بتا دیا میری روداد سن کر اس کے چہرے پر میرے لئے ہمدردی نظر آنے لگی رات گزرتی گئی پل پل گزرتی رات اور حسین ہوتی چلی گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کہ چڑھے ہوئے سمندر میں تیراکی کر رہا ہوں، سمندر اور غضبناک ہوتا جا رہا ہو۔ رات تین چوتھائی گزر گئی تو میں مجبوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے دروازے تک رخصت کرنے آئی۔

"کل آؤ گے ناں۔" اس کی آواز میں خمار موجود تھا۔

"ضرور۔ اب تو زندگی محال ہے تمہارے بغیر۔" میں نے اس کی جانب وارفتگی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں انتظار کروں گی۔ لیکن بارہ سے پہلے مت آنا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

بقیہ رات میں نے اپنی کوٹھری میں آکر آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی تھی دوسری صبح میرا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا بس رہ رہ کر اس کی یاد آرہی تھی ہر جگہ بس مجھے وہی دکھائی دے رہی تھی شاید مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔

جیسے ہی رات ہوئی میری بے قراری بڑھ گئی اور میں پھر حویلی جا پہنچا آج کی رات وہ مجھ پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان تھی وہ مجھے کھانے کی میز پر لے گئی جہاں انواع واقسام کی نعمتیں موجود تھیں۔ اور میں نے پیٹ بھر کر کھایا، لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

"میں صرف دودھ پیتی ہوں۔" بس۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیوں۔ دودھ ہی کیوں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

میرے سوال پر وہ ایک لمحے کے لئے گھبرا گئی دوسرے ہی پل وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ سب کھاؤں گی تو موٹی نہ ہو جاؤں گی۔" اس کا لہجہ شوخ تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ اس کی آواز اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی چہرے پر گھبراہٹ صاف

ظاہر تھی اس کی بات پر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

"میں کچھ نہیں کھا رہی اس لئے تم خاموش ہو گئے۔" وہ لگاوٹ سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"نہیں۔ نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" میں گھبرا کر بولا۔

پھر۔ وہ اٹھلا کر بولی۔

اور میرے نزدیک آگئی وہ اس قدر پاس آگئی کہ اس کے جسم سے اُٹھنے والی پرفیوم کی مہک مجھے محسوس ہونے لگی تھی اچانک اس نے اپنی مرمریں بانہیں میری گردن میں ڈال دیں اور مسکرا کر بولی۔

"جانو۔ کیا تم مجھے اپنے ہاتھوں سے دودھ نہیں پلاؤ گے۔" وہ مجھے نہایت ہی خمار آلود نگاہوں سے گھورتی ہوئی بولی۔

میں بھی اس کے حسن کی گرمی سے بے بس ہو گیا تھا اور جھٹ سے دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اس نے ایک ہی سانس میں سارا دودھ پی لیا، اور دودھ پینے کے بعد بولی۔

"کاشف میں تم سے بے حد پیار کرنے لگی ہوں۔ کاش ہم دونوں کبھی ایک ہو سکتے۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سا درد تھا۔

اس کی آواز میں چھپا درد محسوس کر کے میں بے چین ہو گیا میری اس سے ملاقات زیادہ پرانی نہ تھی مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں برسوں سے اس کو جانتا ہوں میری اس سے شناسائی صدیوں کی ہے اس کی گداز بانہیں بدستور میری گردن میں تھیں اور آنکھیں مجھ پر تھیں۔

"ہاں مجھے پانے کے لئے تم کو امیر بننا ہوگا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

اس کی بات سن کر میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی مجھے مایوس دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی۔

"مایوس مت ہو۔ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ ایک طریقہ ہے جس سے تم بہت امیر بن سکتے ہو۔ پھر ہم ایک ہو سکتے ہیں۔" وہ میرے بالوں کو سہلاتی ہوئی بولی۔

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کی دستیابی

محمدی نیوز ایجنسی
لاری اڈہ میانوالی
0304-6248291

معصوم نیوز ایجنسی
اسٹیشن روڈ جھنگ صدر
PH:0300-9528023

مشتاق نیوز ایجنسی
مریم روڈ پرانا نواب شاہ
PH:0301-2306571

عوامی نیوز ایجنسی
کنگن پور ضلع قصور
0300-6119870

آصف میگزین سینٹر
منڈی بہاؤالدین

سلطان ندیم کتاب گھر
ریلوے روڈ دنیاپور ضلع لودھراں

خوشبو ڈائجسٹ سینٹر
نواب آباد واہ کینٹ

بک کارنر شوروم
بمقابل اسٹریٹ جہلم

''کون سا ایسا طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے میں دولت کما سکتا ہوں۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''نہیں۔ چھوڑو اس میں جان کا خطرہ ہے۔'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تم کو پانے کی خاطر میں کوئی بھی خطرہ اُٹھا سکتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

سچ۔ اس کی آنکھوں میں دیپ جل اُٹھے تھے۔

ہاں۔ میں بھی مسکرایا۔

''اوہ۔ تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

''بتاؤ۔ کیا طریقہ ہے۔'' میں نے اس کو خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آج نہیں کل۔ مگر تم ایک وعدہ کرو۔ تم یہ راز کسی سے نہیں کہو گے۔'' وہ مسکرائی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن ابھی بتا دو ناں۔''

''نہیں ابھی۔ نہیں کل۔ کل پورن ماشی کی رات ہے اور ناگ دیوتا اپنے چاہنے والوں کو درشن دیتے ہیں۔''

''کیا تم ناگ کی پجارن ہو۔''

میری بات سن کر وہ اسے بالکل ہی نظر انداز کرتی ہوئی بولی۔

''کیا تم ان باتوں میں وقت ضائع کرتے رہو گے۔ دیکھو رات گزرتی جا رہی ہے۔'' اس کا لہجہ مخمور ہو چلا تھا۔

اس کا مفہوم سمجھ کر پھر میں نے کوئی بات نہیں کی اور اس کا مرمریں ہاتھ تھام کر اُٹھ کھڑا ہوا رات کے تیسرے پہر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کو الوداع کہا اور حویلی سے باہر نکل آیا میں نہیں جانتا تھا کہ کوٹھری میں ایک اور آفت میری منتظر ہے۔

جیسے ہی میں اپنی کوٹھری میں پہنچا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ کوٹھری میں کشن کمار اور پرشوتم دونوں موجود ہیں اور اس کے ساتھ تین لوگ اور بھی تھے جو کہ لازمی طور پر اس کے گرگے ہی تھے۔

''ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں کہ تم اب آؤ گے۔ تب آؤ گے۔ ہوا۔'' پرشوتم مسکرا کر بولا۔

پرشوتم اور کشن کمار کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے تو میں گھبرا گیا پھر میرے چہرے پر حیرت در آئی تھی۔

میرے لئے یہ نہایت تعجب کی بات تھی کہ یہ دونوں چھوٹے کیسے، میرے چہرے پر حیرت دیکھ کر پرشوتم بولا۔

''پریشان مت ہو ہوا پولیس تو ہماری یار ہے بس کچھ پیسے خرچ کرنے پڑے تھے اور پھر ہم باہر۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''پرشوتم جی۔ اس کو مار کر اسی جگہ گاڑ دیتے ہیں تاکہ پھر کوئی ہمارے خلاف سر نہ اُٹھا سکے۔'' کشن کمار نے کہا۔

''بات تو ٹھیک ہے۔ ویسے بھی یہ ہمارا راز جان چکا ہے اور اسی سے پولیس میں مخبری کی ہے۔'' پرشوتم نے مسکرا کر کہا۔

''میں نے کوئی مخبری نہیں کی پرشوتم جی۔''

''جھوٹ بولتا ہے یہ پرشوتم جی۔'' کشن کمار غصے میں غرایا۔

''اچھا تو ایسا کرتے ہیں اس کو جان سے مار دیتے ہیں۔'' پرشوتم نے کہا۔

''نہیں۔ نہیں۔'' میں گھبرا گیا۔

''تو فکر مت کر ہوا جان بہت پیار سے نکلتی ہے جو میرے ساتھی ہیں بندے کو ایسے مارتے ہیں کہ اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔'' پرشوتم کے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ تھی۔

پرشوتم کی بات سن کر میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ تینوں گرگے میری طرف بڑھنے لگے تھے میں پیچھے ہٹنے لگا ہٹتے ہٹتے میں دیوار سے جا لگا مجھے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دعا شروع کر دی۔

اچانک مجھے ایک تیز چیخ کی آواز سنائی دی میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں میری آنکھوں کے سامنے نہایت ہی خوفناک قسم کا منظر تھا ایک سفید رنگ کا

سانپ جس کی جلد پر سیاہ دھاریاں موجود تھیں پرشوتم کے ایک گرگے کی گردن سے لپٹا ہوا تھا یہ وہی سانپ تھا جو اس دن میں نے کھیتوں میں دیکھا تھا جب میری اس لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی وہ گرگا جس کی گردن سے سانپ لپٹا تھا بری طرح سے چلا رہا تھا اس کے دوسرے ساتھی بھی سانپ کو دیکھ کر چلا رہے تھے میں دہشت بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

اچانک اس سانپ نے اس گرگے کی گردن پر ڈس لیا اس کے حلق سے دلخراش چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی سانپ نے دوسرے بندے پر حملہ کیا تھا اس کا بھی یہی حال ہوا تھا اب پرشوتم کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہونے لگا تھا جبکہ کشن کمار نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا بھی وہی انجام ہوا تھا سب سے زیادہ دل خراش چیخ پرشوتم کی تھی۔

ان پانچوں کی موت کے بعد اب مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی تھی مجھے یقین تھا کہ وہ سانپ اب میری جانب بھی بڑھے گا مگر ایسا نہیں ہوا ان کو انجام تک پہنچانے کے بعد وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

صبح کا اجالا ہونے لگا تھا میرے سامنے وہ پانچوں لاشیں عبرت کا نشان بنی فرش پر پڑی تھیں اور ان کے جسم نیلے پڑ کر سوج گئے تھے جیسے کہ ان میں پانی بھر چکا ہو۔

اچانک میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا وہ لاشیں اب پگھلنا شروع ہو چکی تھیں۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ لاشیں اب پانی ہو چکی تھیں اب فرش پر صرف بدبودار پانی کے سوا اور کچھ نہ تھا سانپ کا زہر اس قدر خطرناک ہو سکتا ہے یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کوٹھری میں نہایت بدبو پھیل چکی تھی۔

چنانچہ میں باہر نکل آیا کافی دیر تک میں باہر گھومتا رہا صبح کا اجالا سر پر چڑھ آیا تھا آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں چنانچہ میں ہر قسم کے ڈر سے آزاد اپنی کوٹھری میں آ کر سو گیا جب میں سو کر اُٹھا تو شام کے چار بج چکے تھے دوسرا اسٹیشن ماسٹر جو کشن کمار کی جگہ آیا تھا اس نے مجھے بلا لیا بڑا ہی اچھا آدمی تھا اور سب سے بڑی بات مسلمان تھا رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھے دوبارہ ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا کہا تھا میں نے اس سے ایک دو دن کی مہلت مانگی جو اس نے بخوشی دے دی تھی۔ مجھے تو نہ نوکری سے کوئی انٹرسٹ سا تھا، نہ ہی اس جگہ سے میرے دل میں تو وہی سمائی تھی جو مجھے امیر ہونے کا طریقہ بتانے والی تھی۔

رات ہوتے ہی میں اس کے پاس پہنچ گیا تھا حسب معمول وہ غضب ڈھا رہی تھی سفید رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس میں وہ خوبصورت لگ رہی تھی سفید رنگ دیکھ کر مجھے اس سانپ کا خیال آ گیا جس نے پرشوتم اور کشن کمار کو مارا تھا میں اس کی جانب بڑے ہی غور سے دیکھنے لگا تھا۔ اس سانپ کی جلد اور اس کا لباس بالکل ایک ہی تھا میرا دل چاہا کہ میں اس سے پرشوتم کی موت کا ذکر کروں۔

''کیا دیکھ رہے ہو۔'' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''دیکھ رہا ہوں تم کہ اس لباس کتنی حسین لگ رہی ہو۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ میرے اس جملے پر اس کے گال گلابی ہو گئے تھے۔

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔'' وہ مجھ سے بے تابانہ انداز میں لپٹ کر بولی تھی۔

''ایک بات بتاؤں۔'' میں نے اس کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں تم پرشوتم اور کشن کمار کی موت کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ہاں۔ لیکن تم کو کیسے پتہ۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''خیر چھوڑو ان کی موت کو وہ تم کو مارنا چاہتے تھے وہ خود مر گئے جو تم کو نقصان پہنچائے گا مارا جائے گا۔'' اس کے لہجے میں غصہ در آیا تھا نہ جانے مجھے ایسا لگا کہ ان کی موت کی ذمہ دار وہی ہے لیکن کیسے اس بات کا

جواب میرے پاس نہیں تھا۔

''زیادہ سوچو مت۔ زیادہ سوچ انسان کے لئے تباہی لاتی ہے۔'' وہ جیسے میری سوچوں کو پڑھتی ہوئی بولی۔

''نہیں میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے امیر بن جانے کا طریقہ بتاؤ تاکہ ہم مل سکیں۔''

''ضرور۔ ملن کا انتظار تو مجھے بھی ہے۔'' اس نے پرسرار لہجے میں جواب دیا۔

''پھر بتاؤ ناں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

بتاتی ہوں۔ کل پورے چاند کی رات ہے اس رات سال میں ایک بار شیش ناگ اپنے بل سے باہر آتا ہے کہا جاتا ہے سانپ کی عمر جب ہزار سال ہو جاتی ہے تو اس کو دو قوتیں حاصل ہوتی ہیں ایک اس کے منہ میں ناگ منی پیدا ہو جاتی ہے وہ ناگ منی سانپ کی زندگی ہوتی ہے دوسری قوت اس کو روپ بدلنے کی حاصل ہوتی ہے تم وہ ناگ منی حاصل کر لو تو بہت امیر ہو سکتے ہو تم وہ ناگ منی لا کر مجھے دینا پھر ہم لوگ اس کو فروخت کر کے امیر ہو سکتے ہیں۔'' اس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

پارو نے ناگ منی کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ اکثر میں اپنے بزرگوں سے سن چکا تھا کہ ناگ منی بہت قیمتی ہوتی ہے جس کے پاس ہو دنیا بھر کے خزانے اس کی ملکیت میں آجاتے ہیں ناگ منی سے بہت سی مہلک بیماریاں دور کی جاسکتی ہیں میں جانتا تھا کہ ناگ منی لانا کسی جوئے شیر لانے سے کم نہیں میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں محسوس کر رہا تھا کہ میں اس قدر خطرہ اُٹھا سکوں چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

''پارو اس میں بہت خطرہ ہے میں تمہارے ساتھ غربت میں بھی جی لوں گا مگر ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس میں جان جانے کا ڈر ہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

جواباً وہ مسکرائی اور میرے نزدیک آئی اس نے اپنی کٹورا جیسی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی تھی مجھ پر اس کی نشیلی آنکھوں کا سحر طاری ہونے لگا تھا مجھے ایسا لگا کہ جیسے ان آنکھوں سے ننھی ننھی کرنیں نکل کر مجھے سحر زدہ کر رہی ہوں۔

''تم۔ جاؤ گے۔ تم جاؤ گے۔'' اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے کہ میں کچھ کرنے کے ہی قابل نہیں رہا مجھے اتنا احساس تھا کہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوں۔

''اس کی آواز پھر مجھے سنائی دی۔'' یہاں تین فرلانگ کے فاصلے پر ناگ دیوتا کا مندر ہے اور جیسے ہی ناگ دیوتا حاضر ہو گا شیش ناگ بھی اس کی ارتھی کے لئے آئے گا جس وقت وہ ارتھی اتارے گا تو وہ ناگ منی نکال کر ناگ دیوتا کی مورتی کے سامنے رکھ دے گا بس اُسی وقت تم ایک کالے کپڑے کو ناگ منی پر ڈال دو گے جس سے پھوٹتی روشنی بند ہو جائے گی اور شیش ناگ اندھا ہو جائے گا اس کے اندھا ہوتے ہی وہ ناگ منی تم کپڑے سمیت ہی اُٹھا لینا اس کے بعد دنیا کی بے اندازہ دولت ہمارے قدموں میں ہو گی۔''

دوسرے دن چاند اپنے پورے شباب پر تھا رات کے نو بج چکے تھے میں اور پارو ناگ مندر کے سامنے موجود تھے دور دور تک وہاں کوئی نہ تھا چاروں طرف چٹیل میدان تھا، ناگ مندر سے بائیں طرف ایک پرانا اور وسیع برگد کا پیڑ موجود تھا میں اور پارو اس پیڑ کے پیچھے موجود تھے پارو پوری طرح سے سج دھج کر آئی تھی سفید رنگ کی ساڑھی اور نہایت ہی بھاری قسم کے زیوارت اس کے جسم پر موجود تھے اس سفید ساڑھی پر بڑی بڑی دھاریاں موجود تھیں جو اس کپڑے کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اس سیاہ اور سفید کپڑے کو دیکھ کر میں چونک گیا، نہ جانے کیوں مجھے وہ سانپ یاد آگیا، پارو کی ساڑھی کا رنگ اس سانپ کی جلد سے مشابہہ تھا یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا مگر نہ جانے میرا دل نہیں مان رہا تھا چنانچہ میں نے پارو سے پوچھ ہی لیا۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی پارو۔ میں نے

اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا۔ سمجھ نہیں آیا۔'' اس نے بڑے ہی پیار سے پوچھا۔

''اس سانپ کی جلد اور تمہاری ساڑھی بالکل ہی ایک رنگ کی ہے۔''

میرے سوال پر میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

''نہیں ایسی بات نہیں یہ محض اتفاق ہے۔ وہ مسکرا کر بولی اس کے لہجے کا کھوکھلا پن صاف ظاہر تھا۔

میں بھی مسکرا کر رہ گیا مجھے یہ یقین تو ہو چلا تھا کہ اس سانپ اور پارو میں ضرور کوئی تعلق ہے پارو جھوٹ بول رہی ہے بات کو اتفاق کا رنگ دے رہی ہے۔

ایک بات اور پارو۔

پوچھو۔

''یہ مندر اتنا ویران کیوں ہے۔ آج چاند کی پوری رات ہے جہاں تک میری معلومات کے مطابق ناگ دیوتا کی عبادت پورے چاند کی رات میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے لوگ بھی نہیں ہیں۔''

''بات یہ ہے کہ مندر اتنا دور ہے لوگوں نے اپنی سہولت کے حساب سے اپنے علاقے میں دوسرا بنا لیا ہے اب یہاں پوجا نہیں ہوتی۔'' پارو کا لہجہ پھر کھوکھلا تھا صاف لگ رہا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا خاموش رہا نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ اس جگہ کچھ بہت ہی غلط ہونے والا ہے ہم دونوں برگد کے پیچھے دبکے بیٹھے تھے کہ پارو نے میرا ہاتھ دبایا تو میں چونک پڑا اس نے دبی آواز مجھے مخاطب کیا۔

''کاشف شیش ناگ آرہا ہے۔''

اس کی بات سن کر میں چونک پڑا چاند کی روشنی میں مجھے کوئی سانپ دکھائی نہ دیا۔

اچانک میں نے ایک تیز قسم کی روشنی پھوٹتی ہوئی دیکھی وہ روشنی ایسی تھی جیسے کہ بہت سے سورج ایک ساتھ چمک رہے ہوں وہ روشنی اندھیرے سے نقطی محسوس ہو رہی تھی اچانک میں نے اس روشنی میں ایک سیاہ رنگ کے بڑے سے سانپ کو دیکھا وہ روشنی اس کے منہ سے پھوٹ رہی تھی۔

اچانک میں نے سیاہ رنگ کے بڑے سے سانپ کے منہ سے ایک تینس کی گیند سے تھوڑا چھوٹا گولا نمودار ہوتا دیکھا وہ گولا ہی ناگ منی تھا جس سے پھوٹتی کرنیں بہت زیادہ تیز تھیں پارو کے چہرے پر میں نے ایک عجیب سے تاثرات دیکھے تھے جن کو میں کوئی نام نہیں دے سک رہا تھا وہ چھوٹا سا چمکدار گولا جس سے وہ سانپ کھیل رہا تھا بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔

اچانک میں نے بہت سی پھنکاروں کی آوازیں سنی وہ آوازیں تعداد میں بہت زیادہ تھیں دوسرے ہی پل میری آنکھیں پھیل گئیں پورا میدان سانپوں سے پٹا پڑا تھا ہر جگہ سانپ ہی سانپ تھے لاتعداد اتنے سانپ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔

اچانک میں اچھل پڑا بہت سے مجھے اپنے پیروں کے پاس رینگتے ہوئے محسوس ہوئے تھے ناگ منی کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ سارے سانپ اس ناگ منی کے سامنے سجدہ ریز تھے۔

پارو۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

لیکن کوئی جواب نہ آیا میں چونک پڑا کیونکہ وہاں پارو نہ تھی سارا میدان برگد کا درخت سانپوں سے پٹا ہوا تھا خوف سے میری حالت بری تھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اب یہ سارے سانپ مجھے ڈس لیں گے۔

''ڈرو مت یہ سانپ کچھ نہیں کریں گے۔'' پارو کی سرگوشی مجھے سنائی دی۔

''تم کہاں ہو پارو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''میں تمہارے قریب ہوں لیکن مجبوری ہے سامنے نہیں آسکتی۔'' پارو کی آواز پھر مجھے سنائی دی۔

کیا۔ مجبوری ہے۔

''بس بتا نہیں سکتی لیکن اتنا ضرور بتا دوں کہ اس مندر میں کوئی عام انسان پوجا نہیں کر سکتا ہے یہ سانپوں کے لئے مخصوص ہے اس لئے تم کو یہاں کوئی نہیں دکھائی

دیا تھا۔ اب آگے بڑھو تمہاری جیب میں ناگ مہرہ ہے اس کو منہ میں رکھ لو کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔'' پارو نے کہا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں واقعی ناگ مہرہ موجود تھا ناگ مہرہ کو نکال کر میں نے منہ میں رکھ لیا، منہ میں رکھتے ہی مجھے اپنا وزن ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا آگے بڑھنے میں مجھے ڈر لگ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ میں آگے بڑھوں گا اور وہ سانپ مجھے کاٹ لیں گے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ ناگ منی سے کھیلنے والے سانپ نے انسانی روپ اختیار کر لیا ہے وہ ایک گندمی رنگ کا نوجوان تھا جو انسانی روپ میں ظاہر ہوا تھا قریباً چھ فٹ کا یہ نوجوان دھوتی اور کرتے میں ملبوس تھا بازو پر اس نے تعویذ باندھ رکھا تھا اور سر پر ایک پگڑی تھی سب سے بڑی بات اس کی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی اس نے ناگ منی اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا ناگ منی جیب میں رکھنے کے بعد وہ نوجوان آہستہ آہستہ چلتا ہوا مندر کے اندر داخل ہو گیا میں اسی جگہ کھڑا تھا اچانک میرے کانوں میں پارو کی سرگوشی کی آواز پھر سنائی دی۔

''کھڑے کیا ہو کا شف وقت نکل گیا تو یہ وقت دوبارہ پچاس سال بعد آئے گا۔ جلدی کرو۔'' پارو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

چنانچہ پارو کے حوصلہ دلانے پر میں ڈرتا ہوا ناگ مندر کے اندر داخل ہو گیا کالا کپڑا میرے ہاتھ ہاتھ میں تھا میں تیز تیز چلتا ہوا ناگ مندر کے اندر داخل ہو گیا۔

''جب شیش ناگ اندھا ہو جائے۔ تو تمہاری جیب میں ایک خنجر ہے جو عظیم منتروں سے سدھ کیا گیا ہے اس خنجر سے اندھے ناگ کی گردن کاٹ دینا۔'' پارو کی آواز دوبارہ مجھے سنائی دی۔

اس کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ میں نے تشویش زدہ لہجے میں۔ ''تم نے تو یہ نہیں کہا تھا پارو۔ مجھ سے یہ نہیں ہو گا۔''

''تم کو کرنا ہو گا۔ ورنہ ہم ایک کیسے ہو نگے۔'' پارو کی آواز آئی۔

مگر.....

اگر مگر نہیں کرنا ہو گا۔ تم کو۔ پارو کی آواز میں تحکم در آیا۔

مرتا کیا نہ کرتا میں مندر کے اندر داخل ہو گیا۔

مندر کا اندرونی ماحول جہاں بارہ سروں والی ناگ مورتی موجود تھی بڑا ہی پراسرار تھا چاروں طرف بخور دانوں میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں جن کے دھوئیں سے نکلتی خوشبو ماحول کو اور پراسرار کر رہی تھی سارے سانپ مندر کے باہر موجود تھے جبکہ ناگ مندر میں مورتی کے سامنے شیش ناگ اکیلا موجود تھا دوسرے سارے پجاری ناگ مندر کے باہر موجود تھے۔

مورتی کے سامنے شیش ناگ چند لمحے تک کھڑا رہا اور پھر سجدے میں گر گیا اور نہایت عقیدت سے بولا۔

ناگ دیوتا۔ تیرا یہ پجاری تیرے سامنے حاضر ہے۔ اپنے پجاری کی مدد کر تا کہ میں صدا ناگوں پر حکومت کر سکوں۔ یہ عظیم منکہ تیری مجھ پر مہربانیوں کی دلیل ہے تا کہ میں حکومت کر سکوں۔ وہ بت کے عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔

اس کی اس عقیدت کو دیکھ کر میں اندر ہی اندر سے کانپ گیا کیونکہ عبادت اور عقیدت کا حقدار صرف اور صرف اللہ کے سوا اور کوئی نہیں۔

اچانک اس نے ناگ منی کو اپنے کرتے کی جیب سے نکالا اور بت کے سامنے ڈال دیا بت کے سامنے ناگ منی آب و تاب سے چمکنے لگا تھا میں اسی لمحے آگے بڑھ کر اس سیاہ کپڑے کو اس ناگ منی پر ڈال دیا اس کی ساری روشنی اس کپڑے کے اندر ہی ڈھک گئی تھی کپڑا ڈلتے ہی اس نوجوان ناگ کے منہ سے چیخ نکلی اور دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگا اور چلاتے چلاتے وہ اس کا سر بت کے گھنٹے سے ٹکرایا، اس کے سر سے خون جاری ہو گیا ہے۔

اچانک میرے کانوں نے پارو کی سرگوشی سنی جلدی کرو۔ وقت کم ہے یہ زیادہ دیر اندھا نہیں رہ سکتا۔

مگر.....

''جلدی کرو۔ میں نے کہا ناں تم کو۔ پارو کی

غراہٹ سے مشابہ آواز کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے جیب سے خنجر نکال کر آگے بڑھ کر اس ناگ کی گردن پر پھیر دیا۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا اس کی گردن سے۔

اس کی چیخ کسی اژدھے کی پھنکار سے مشابہ تھی۔ وہ چیخ اس قدر خوفناک تھی کہ میں ہل گیا میری کپکپی چھوٹ گئی وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا اسی پل پارو نہ جانے کہاں سے ظاہر ہوئی اور فوراً ہی ناگ منی کو اُٹھایا اور منہ میں ڈال لیا اور ناگ دیوتا کے بت کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔

میں حیرت اور خوف سے اس منظر دیکھ رہا تھا۔

اسی پل وہ سجدے سے اُٹھی اور بولی۔

''اے ناگ دیوتا اس ناگ کی موت کے بعد اب میں ملکہ ہوں ناگ ملکہ شیش ناگن۔ یہ ناگ منی میرا ہے مجھے آشیرواد دے۔'' اسی لمحے وہ عورت سے ناگن کے روپ میں بدل گئی اب میرے سامنے وہ سفید دھاری دار سانپ تھا جس نے میری جان بچائی تھی وہ سفید سانپ اس مردہ ناگ کی جانب بڑھنے لگا تھا جو کہ اب ناگ کے روپ میں مردہ پڑا تھا۔ میرے حلق سے چیخ نکلی بے ہوش ہونے سے قبل میں نے صرف اتنا دیکھا کہ سفید سانپ نے اس مردہ ناگ کو کھانا شروع کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہوش آیا تو پہلا احساس میرے زندہ ہونے کا تھا میں نے اپنے آپ کو اپنی کوٹھری میں پایا اور میرا پورا جسم درد سے دکھ رہا تھا میں یہاں کیسے آیا مجھے نہیں پتہ تھا پارو نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا تھا کہ اپنے فائدے کے لئے اس نے مجھے استعمال کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ناگن ہے اگر معلوم ہوتا تو میں اس کے اتنے قریب نہ جاتا۔

اچانک میں چونک پڑا میں نے اپنے سرہانے کے پاس ایک چمکدار منقش ڈبے کو پایا جس کا سائز چھوٹے جیولری کے ڈبے کے جتنا تھا میں نے آگے بڑھ کر اس ڈبے کو کھول دیا۔

ڈبا کھلتے ہی میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اس ڈبے میں مرغی کے انڈے کے برابر ایک ہیرا موجود تھا جو کہ بہت چمکدار تھا اور ایک لفافہ موجود تھا میں نے آگے بڑھ کر اس لفافہ کو کھول لیا اس لفافہ سے نکلتی خوشبو جانی پہچانی تھی وہ پارو کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی اس میں سے ایک خط برآمد ہوا تھا میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔

میں جانتی ہوں۔ میں نے تم کو دھوکہ دیا لیکن میری نیت ایسی نہیں تھی شیش ناگ میرا دشمن تھا میرے باپ کو اسی طرح مار کر ناگوں کا راجا بنا تھا بالکل اسی طرح جس طرح تم نے اس کو مارا ہے اس لئے میں اس سے بدلہ لینا چاہتی تھی لیکن یہ کسی انسان کے بغیر ممکن نہ تھا اس لئے میری نظر تم پر پڑی جب تم کھیتوں سے ہوتے ہوئے کالج جا رہے تھے میں نے تمہاری جان بچائی اور کشن کمار اور پرشوتم کو میں نے ہی مارا تا کہ وہ تم کو کچھ نہ کر سکیں اگر وہ تم کو مار دیتے تو میرا مقصد ادھورا رہ جاتا۔ یقین جانو میں نے اگر زندگی میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ تم ہو۔ صرف تم تمہارے ساتھ گزارا وقت میں کبھی نہیں بھولوں گی پیار کے لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں مگر میں تم کو اپنا نہیں سکتی۔ کیونکہ میں تم کو مرتا دیکھ نہیں سکتی کیونکہ میرا زہر تمہاری رگوں میں داخل ہو جائے گا، یہ ہیرا تمہاری زندگی بدل دے گا یہ دھوکے کی قیمت نہیں ایک تحفہ ہے میری طرف سے، تم جب کسی مصیبت میں ہو گے تو پارو ضرور آئے گی۔ الوداع۔

خط ختم ہو چکا تھا اور پارو جا چکی تھی مجھے یادوں کی آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ کر اس کی محبت میں مجھے موت بھی قبول تھی لیکن جدائی نہیں اس واقعے کے چند دن بعد میں اس کی تلاش میں نرنجن لال کی حویلی تک گیا لیکن وہاں دھول مٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا اس شہر سے اس کی یادیں وابستہ تھیں اس لئے میں نے شہر چھوڑ دیا اور ہیرا فروخت کر دیا اس سے جو رقم حاصل ہوئی وہ رقم میری سوچوں سے بھی زیادہ تھی، آج میں ملک کا امیر ترین آدمی ہوں لیکن میں اپنے آپ کو غریب مانتا ہوں کیونکہ پارو میرے ساتھ نہیں۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

شمع بجھتی ہے تو محفل میں دھواں ہوتا ہے
دل بجھا یوں کہ زمانے کو خبر تک نہ ہوئی
(ایس حبیب خان......کراچی)

کہاں تو ہے کہ تیرے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

عکس تیرے تیری خوشبو تیرے رنگ
بس یہی کچھ ہے میرے سامان میں
تو نہیں خوش مزاجی کی وجہ خاص تو
کون ہے یہ پھر میرے جسم و جاں میں
(عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

بجھتا ہوا چراغ جلتا نہیں کبھی
بچھڑے جو اک بار ملتا نہیں کبھی
گلشن میں کوئی پھل کھل نہ سکا
دل کسی کیار میں دھڑکتا نہیں کبھی
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

ذرا قریب تو آؤ بہار کے دن ہیں
مرے نصیب جگاؤ، بہار کے دن ہیں
حیات بخش لبوں کی ذرا سی جنبش سے
شگوفے دل کے کھلاؤ، بہار کے دن ہیں
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

اپنی کیا چاہتوں میں ملاوٹ تھی اس قدر
تنگ آکر دشمنوں کو منانے چلا گیا
(سنبل ماہین طٰہٰ......سرگودھا)

تو میرا حوصلہ دیکھو، داد دے کر اب مجھے
شوق کمال بھی نہیں، اور خوفِ زوال بھی نہیں
(انتخاب: سمرین بلال......کراچی)

نکل آیا میں اپنے اندر سے
اب کوئی ڈر نہیں باہر سے
(انتخاب: جاوید مائیکل......کراچی)

شوق کی راہ پر اگر چلے
چار جانب سے بے خبر چلے
(عروج ماہین طٰہٰ......سرگودھا)

شام گہری ہو رہی تھی، دن بھی ڈھل گیا تھا یاروں!
اک دیدار کی تمنا میں، دل مر گیا تھا یاروں!
نہ ہی وہ جل رہا تھا نہ ہی روشنی تھی اس میں
وہ چراغ بجھ گیا تھا، اسی رات میرے یاروں!
(عامر حیات......لالیاں)

ہمیں تم سا نہ تمہیں ہم سا کوئی ملے گا
تم انمول ٹھہرے اور ہم نایاب
(شیخ معین اختر......چنیوٹ)

وہ پتھر بھی ماریں تو اٹھا کر جھولیاں بھر لو
کبھی محبوب کے تحفوں کو ٹھکرایا نہیں کرتے
(انتخاب: ارمان ملک......ٹنڈو آدم)

خشک پتوں کی طرح بکھرا ہوں گلی کوچوں میں
ہوا سے دوستی کا کوئی تو انجام ہونا تھا
(سنبل وسیم سیالوی......پنڈ دادن خان)

محبت میں کبھی ایسا زمانہ بھی گزرتا ہے
زباں خاموش ہوتی ہے مگر دل روتا رہتا ہے
اب ان تمناؤں پر سلگتے ہی رہتے ہیں
بس 'اسحار' اب دن بیتے جا رہے ہیں
(اسحار بن ناصر......کراچی)

لبوں پر پھول کھلتے ہیں کسی کے نام سے پہلے
دلوں کے دیپ جلتے ہیں چراغ شام سے پہلے
نجانے کیوں ہمیں اس دم تمہاری یاد آتی ہے
جب آنکھوں میں چمکتے ہیں ستارے شام سے پہلے
(قربان عمر دراز......نواب شاہ)

کس لئے اتنی سزا دیتے ہو
کبھی کرتے ہو یاد تو کبھی بھلا دیتے ہو
عجیب تیری محبت کا صلہ دیکھا دوست
کبھی خوش اور کبھی دل ہی جلا دیتے ہو
(نادیہ یاسین......کھڈرو سندھ)

کبھی پھول سے ابھر کر کبھی چاندنی میں ڈھل کر
تیرا حسن چھیڑتا ہے مجھے رخ بدل بدل کر
(شان ملک......ٹنڈو آدم)

خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل، جسے اندیشہ زوال نہ ہو!
یہاں جو پھول کھلیں، وہ کھلیں رہیں صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو!
خدا کرے کہ کم ہو سر وقار وطن
اور اس کے حسن وہ تشویش مال و سال نہ ہو!
ہر فرد ہو تہذیب و فن کا اوج کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو!
خدا کرے کہ میرے ایک بھی ہم وطن کیلئے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو!
اور خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو!
(ایس حبیب خان......کراچی)

میں اجنبی ہوں، شہر کے رستے عجیب سے
چپ سادھے سب گزرتے ہیں میرے قریب سے
کیا ڈھونڈتی ہے مجھ میں یہ بیتاب سی نظر!
کس شے کی آپ کو ہے توقع غریب سے
پتھر جنہوں نے پھینکے ہیں ان سے گلہ نہیں!
گھر ہی ملے تھے کانچ کے ہم کو نصیب سے
وہ ساتھ تھے تو ہم بھی تھے منزل سے آشنا
اب وہ نہیں تو لگتے ہیں رستے عجیب سے
امتیاز ہے ایک عمر سے دل میں اسی کی یاد!
منہ پھیر کے جو گزرا تھا میرے قریب سے
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

وہاں جو گزرے اسے خاک زندگی کہیے
جہاں ہو حکم اندھیرے کو روشنی کہیے
سیاہ کار ہیں جن کا وجود ظلمت ہے
مگر ہے حکم انہیں آفتاب ہی کہیے
کہاں نیابت حقانیت کی شمع جلی
ردائے عصمت انساں کہاں ملی کیسے؟
رہے یہ یاد کہ یہ منصب الٰہی ہے
یہ آپ پر ہے جسے چاہے ولی کہیے
نہ رکھئے نام کوئی اور مصلحت کے تحت
ملے نہ منزل مقصد تو گمراہی کہیے
زباں سے اف نہ کریں اور خون جلتا رہے
تو ایسے ضبط کو آداب آشتی کہیے
جو ذاتی تجربہ ایسا نہ ہو تو کیوں واجد
زبان خلق جو کہتی ہے آپ بھی کہیے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

کبھی حال دل نہ سنا سکا اسے اپنا میں نہ بنا سکا
وہ چلا گیا مرے شہر سے اسے زخم دل نہ دکھا سکا
مری خواہشوں سے نا آشنا وہ جو شخص تھا اک حسین سا
وہ تو عکس تھا میں ہوں آئینہ وہی عکس میں نہ بھلا سکا
میرے دل میں رہنے کی کوششیں سو حسین کرتے رہے مگر
میرے دل سے آج تلک کوئی تیرا نام تک نہ مٹا سکا
وہ جوان کے گھر کا ہے راستہ اسی راستے پہ کھڑا ہوں میں
وہ بچھڑ کے مجھ سے کہاں گیا مجھے کوئی یہ نہ بتا سکا
وہ جو حسرتوں کے گلاب تھے سبھی راستوں میں بکھر گئے
میں کیا کہوں وہ کدھر گیا میرا ساتھ کیوں نہ نبھا سکا
جو ملا تھا وہ نصیب تھا جو نہیں ملا وہ ہے آرزو
وہ قریب سے بھی گزر گیا، اسے پاس میں نہ بلا سکا
میں سلگتے دل کا ہوں بادشاہ مجھے زاہد اس پر غرور ہے
جو چراغ دل نے جلا دیئے انہیں کوئی بھی نہ بجھا سکا
(زاہد حسن زاہد......مظفر گڑھ)

مت لو میرا نام مجھے رسوا نہ کرو
میری محبت کا سر عام تماشا نہ کرو
میرے حق دار تو تم ہو لیکن حد ہے ابھی
مٹادو مجھے شوق سے مگر ایسا نہ کرو
دل ہمارا تھا ہم ہی تھے اس کے منانے والے
کیوں "رو" کے کہا اس نے ہمیں تنہا نہ کرو

ہم تیرے خریدار تیرے در پہ پڑے ہیں
تم حسن کو یوں بازار میں بیچا نہ کرو
دل کے دھڑکنے کا سبب جو پوچھا ان سے
مسکرا کے وہ بولے کہ ہمیں دیکھا نہ کرو
دل کی بے قراری کا سبب جو سوچنے بیٹھے
تیری یادوں نے کہا ہمیں سوچا نہ کرو
لوگ آبشار سمجھتے ہیں میرے اشکوں کے دریا کو
آج پتھروں نے کہا "رو" کے شہزاد رویا نہ کرو
(عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

میرے دل کی زخموں کی دوا ہوا کرتا تھا
ایک شخص محبت کی انتہا ہوا کرتا تھا
میں بھول جاتا تھا دنیا کی سب عداوتیں
چہرہ اس کا جب آغوش میں ہوا کرتا تھا
میرے چہرے پہ کھلتے تھے ہزاروں رنگ
وہ اپنی سانسوں کے بھنور سے جب چھوا کرتا تھا
اب جو بچھڑا تو اک جمود سا طاری ہے مجھ پر
کڑی دھوپ میں بے آسرا چھوڑ گیا مجھ کو
میں تو اس کی سانسوں سے جیا کرتا تھا
کبھی جو چھاؤں میں بھی سائبان ہوا کرتا تھا
دل توڑا، زخم دیئے، الزام بھی دے گا مجھ کو
وہ شخص دیکھنے میں تو سادہ سا ہوا کرتا تھا
میں تو آج تک ان ہی آنکھوں کا طلب گار ہوں شاہد
وہ نہ مانے میں تو اس کی امانت ہوا کرتا تھا
اب تو اسے اک لمحہ بھی گوارا نہیں میرے سنگ شاہد بھائی
وہ تو ساتھ میرے جینے مرنے کی دعائیں کیا کرتا تھا
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

جہاں میں جس سے تھی زندگانی میری
بھولے سے اس نے قدر نہ جانی میری
یوں جل کے راکھ ہوگئے آخر ہم
آکے گزر گئی پھر شام سہانی میری
کسی نے توڑ دیئے پیار کے بندھن سارے
واپس کردی تو نے پھر نشانی میری
گزرے دنوں کی بات نہ کر میرے ہمسفر
اداس دل کی تھی پھر یہ کہانی میری
جا کے کوئی پلٹ کے آتا نہیں کبھی
اندھیروں میں لٹ گئی جیسے جوانی میری
بیت گیا جیون تو احساس ہوا جاوید
دل سے میرے اب جاتی ہیں پریشانی میری
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

تیرے ہونٹوں کی پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیرے زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی
جب کھلی تیری راہوں میں شام ستم
ہم چلے آئے لائے، جہاں تک قدم
لب پہ حرف غزل، دل میں قندیل غم
اپنا غم تھا گواہی تیرے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے
(انتخاب:......اسحار بن ناصر)

خلق سراسر ہے اک
خلق سے سب ہوں دشمن
خلق زبان میں تازگی لائے
خلق لبوں سے گل برسائے
شر کے چنگل سے نکالے
زیست کو بخشے خوب حوالے
خلق کرے انسان
خلق سے دل ہو دانش
خلق ہے شیوہ سب نبیوں
اصفیا، ارتقیا اور ولیوں
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

"وفا" کی راہوں میں "انا" نہ رکھنا
لڑ جاؤ ایسا قدم نہ رکھنا
دل برسے اور رونے کو جی چاہے
کبھی اپنا خیال نہ رکھنا
کسی سے گناہ ہوجائے تو اسے معاف کردینا
اگر سکو معاف تو اسے دل میں نہ رکھنا
وعدہ کرتے ہو تو نبھانا سیکھو تم!
جو وعدہ فروش ہو اس سے عہد وفا نہ رکھنا
دوستوں کو بھولنا اتنا آسان نہیں ہوتا
کوئی تجھ کو بھول جائے ایسا دوست نہ رکھنا
اس راستے میں تجھ کو دشمن نہ ملے
کسی غزل کی تم بنیاد نہ رکھنا
ہم تو ہر کسی سے ملتے ہیں اے دوست!
کوئی غم تجھے مارے، ایسا غم نہ رکھنا
خوشی اپنوں میں بانٹ لو ناز
نہ کوئی خوشی اپنے پاس نہ رکھنا......!
(عامر حیات......لالیاں)

ہم ایسے لوگ ہیں جاناں
جو آنکھوں ہی آنکھوں میں کمال کرتے ہیں
کمال بھی کیا خوب کمال کرتے ہیں
آنکھوں ہی آنکھوں میں
دل لوٹ لیتے ہیں
(مشاء شاہ......کراچی)

اک بار مل جاؤ دل یہ کہتا ہے
ہر وقت آنکھوں سے سمندر بہتا ہے
تمہاری پیار بھری باتیں یاد کرکے
تم کہاں، آپ کہاں یہی سوچتا ہے
میرے سامنے ہیں وہ تمہاری تصویریں
دل ہر پل تمہارا ہی رہتا ہے
وہ تمہارا ملنا اور مل کر بچھڑنا
غم جدائی کے میرا ہی دل سہتا ہے
مل جاؤ اک بار دل یہ کہتا ہے
آنکھوں میں ہر وقت سمندر بہتا ہے
(محمد اسحاق انجم......ننگن پور)

آج دل کا بوجھ ہم نے کم کرلیا
اپنے درد کو ہی اپنا صنم کرلیا
بہت روشن تھے اس کی محبت کے تارے
دل میں اس چمک کو مدہم کرلیا
عشق کی اک نئی داستاں لکھنے بیٹھے
ہر باب کو جلا کر آج ختم کرلیا
محبت کے زخم اس نے دیئے ایسے
ہنس کر نمک کو ہم نے مرہم کرلیا
نہیں ہوں کافر پھر بھی تیرے لئے
بھلا کر دنیا اک نیا جنم کرلیا
بہت سوچا اک تو ہو فقط اپنا
یہ کیسا اپنی جاں پہ ستم کرلیا
مانا کہ بہت مشکل ہے نینا کے لئے
تجھے بھلانے کا دل میں عزم کرلیا!!!
(ایڈووکیٹ نینا خان......کراچی)

اپنے سر پہ چلا ہوں کفن باندھ کے آج مقتل میں مجھ کو پکارا گیا
دیکھو قاتل کی ذرہ نوازی میرے لئے کتنی محنت سے خنجر سنوارا گیا
ایک مدت سے دل مضطرب تھا میرا میں امیروں کے دامن سے لپٹا رہا
آئیں گے روبرو ایک دن وہ میرے جو وہ آئے تو ملنے کا یارا گیا
میری قسمت میں تھیں چند نا کامیاں کچھ تمہاری طرف سے تغافل ہوا
اس میں دونوں کے نقصان کا امکان تھا کچھ تمہارا ہوا کچھ ہمارا گیا
نت نئی ایک الجھن میں ڈالا مجھے میں نے پھر بھی کہا شکریہ شکریہ
تو نے مجھ کو غموں کا جو تحفہ دیا میں اسی پر ہی کرتا گزارہ گیا
روتے روتے کبھی ہنس پڑتے تھے وہ، ہنستے ہنستے کبھی آہیں بھرتے تھے وہ
بعد مرنے کے دن مجھے اب تلک یاد ہے کس ادا سے لحد میں اتارا گیا
تھا سکون جب تک مجھے، مجھ سے وہ دور تھے جب وہ آئے تو آرام چلتا بنا
جب نظارہ رہا تو یہ آنکھیں نہ تھیں، اب ملی ہیں جو آنکھیں تو نظارہ گیا
مجھ کو شاکر کسی سے شکایت نہیں اپنے اپنے مقدر کی ہے بات یہ
مجھ کو موجوں نے جس وقت گھیرا ادھر ان کے نزدیک ہوتا کنارا گیا
(محمد حنیف شاکر...... بھا گووالی ننکانہ صاحب)

☆☆

ام الیقین

ضرغام محمود۔کراچی

حیرت کو آشکار کرتی ایسی داستان حیرت جو کہ عقل میں نہ آنے والی اپنی نوعیت کی بالکل حقیقی داستان جو کہ پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دے گی۔

حقیقت......سے چشم پوشی انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی......ایک......حقیقی......کہانی

مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے اور سب لوگ سر جھکائے ان کی بات سن رہے تھے میں بھی مسجد میں بیٹھا ہوا سر کو جھکائے ادب سے مولوی صاحب کا ایمان افروز تقریر سن رہا تھا، آج رجب کی چھبیس تاریخ تھی اور مغرب کے بعد ستائیسویں شب شروع ہونے والی تھی اور مسجد میں اسی سلسلے میں عصر کی نماز کے بعد مولوی صاحب تقریر فرما رہے تھے۔

مولوی صاحب کا بیان جاری تھا اور تمام حاضرین کے ساتھ میں بھی خاموشی سے بغور مولوی صاحب کا بیان سن رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے ''رجب کی ستائیسویں شب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی سعادت حاصل ہوئی، آپ مکہ معظمہ سے مسجدِ اقصیٰ بیت المقدس تشریف لے گئے اور وہاں تمام انبیاء اکرام کی نماز کی امامت فرمائی اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں پر تشریف لے کر گئے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کئی انبیاء اکرام سے ہوئی اور پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، اس سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کا بھی نظارہ کیا اور انبیاء کرام سے ملاقات بھی کی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں سے واپس اپنے گھر آئے اور جب آپ اپنے گھر آئے تو وہی وقت ہو رہا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر پر تشریف لے کر گئے تھے اس عرصہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے وقت کو روک دیا تھا''۔

مولوی صاحب نے تقریر تمام کی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے، میں نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے مگر میرا ذہن مولوی صاحب کی آخری بات میں الجھا ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے وقت روک دیا۔۔۔

''بھلا وقت بھی رک سکتا ہے۔'' میرے ذہن میں شیطان نے وسوسہ ڈالا۔

''لاحول ولاقوۃ'' میں نے فوراً ذہن کو جھٹکا اور شیطانی وسوسے کو دور کرنا چاہا مگر بھلا شیطان اتنی جلدی کسی کا پیچھا کہاں چھوڑتا ہے میں دعا کے بعد مسجد سے باہر نکلا اور اپنی چپل پہن کر گھر کی جانب چلا مگر میرے ذہن میں بار بار یہ خیال شیطان داخل کر رہا تھا کہ ''وقت کیسے رک سکتا ہے۔''

''کاشان۔۔کاشان۔۔کاشی'' میں سوچوں میں گم جا رہا تھا کہ مجھے میرے دوست ذوالفقار کی آواز سنائی دی میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو سامنے ذوالفقار مجھے آوازیں دیتا چلا آ رہا تھا۔

''کن سوچوں میں گم ہو؟ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں؟'' میرے قریب پہنچنے کے بعد ذوالفقار بولا۔

''نن نہیں بس یونہی۔۔'' میں نے بات گھمائی میرے ذہن میں ابھی تک مولوی صاحب کے الفاظ گونج رہے تھے اور دل میں وسوسے آ رہے تھے جنہیں میں بار بار لاحول پڑھ کر بھگا رہا تھا۔

''سن کل اتوار کو سن شائن کلب والوں سے میچ رکھا ہے صبح وقت پر آ جانا'' ذوالفقار بولا۔

''ہاں۔۔ہاں آ جاؤں گا۔۔وقت پر'' میں نے جواب دیا اور سوچتے ہوئے گھر کی جانب چل دیا ذوالفقار میرے اس طرح چل دینے کی وجہ سے اچنبھے سے مجھے دیکھنے لگا پھر خود بھی کندھے اچکا کر اپنی راہ چل دیا۔

میں مولوی صاحب کے خطبے کے آخری جملوں پر غور کرتا چلا جا رہا تھا جتنا میں سوچتا اتنا میں اس بات پر الجھ رہا تھا کہ آخر وقت کیسے رک گیا اور دنیا میں کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا۔۔میں جتنا اس بات کو سوچ رہا تھا اتنا الجھتا جا رہا تھا۔

''السلام علیکم امی جان'' میں نے گھر میں داخل ہو کر امی جان کو سلام کیا امی جان شاید ابھی قرآن پڑھ کر اٹھی تھیں کیونکہ ان کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا جسے وہ اٹھا کر اوپر رکھ رہی تھیں۔

''وعلیکم السلام بیٹا'' امی نے میرے سلام کا جواب دیا۔

''امی جان بہت تھکن ہو رہی ہے جلدی سے اچھی سی چائے پلا دیجئے'' میں نے امی جان سے کہا۔

''ٹھیک ہے میں چائے بناتی ہوں۔۔تم ذرا دوڑ کر سموسے لے آؤ۔۔۔سلمٰی کب سے بھوک بھوک کر رہی ہے'' امی جان نے میری چھوٹی بہن کا نام لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''امی جان اتنی گرمی ہو رہی ہے۔۔اور باہر دھوپ بھی بڑی سخت ہے'' میں باہر جانے کا سن کر بلبلانے لگا۔

''اچھے بھائی جان۔۔ضد نہ کریں جلدی سے قیمے والے سموسے لے آئیں نا'' سلمٰی بھی میری اور امی کی بات سن کر کمرے سے نکل آئی اور میری منت کرنے لگی۔

''اچھا۔۔اچھا بابا۔۔جاتا ہوں'' میں نے ہتھیار ڈالے امی نے مجھے پیسے دیئے جو میں نے اپنے کرتے کی جیب میں رکھے اور گھر سے باہر کی جانب چل دیا میرے باہر جاتے ہی امی جان بھی کچن کی جانب قدم بڑھانے لگیں۔

باہر دھوپ بہت تیز تھی گرمی بلا کی تھی میں سر کو جھکائے آگے ہی آگے جا رہا تھا۔آج سورج انکل بھی شاید غصے میں تھے اسی لئے ہر چیز کو اپنی تیز شعاعوں سے جلانے پر تلے بیٹھے تھے میں اپنے ہاتھ کی چھجا بنا کر دھوپ کو چہرے پر آنے سے روک رہا تھا اور دوکان کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ چلتے چلتے میں نہر کے کنارے پہنچا تو نہر کا پانی دیکھ کر دل یک دم مچلنے لگا۔

''ایک آدھ ڈبکی لگا لوں۔پھر سموسے لینے جاتا ہوں۔۔امی کو بھی چائے بنانے میں دیر تو لگے گی'' میرے دل سے آواز ابھری تو میں نے دل کی آواز پر لبیک کہا اور اپنا کرتا اتار کر ایک درخت کی شاخ سے لٹکایا اور شلوار کے پائنچے اونچے کر کے نہر میں اتر گیا۔

نہر کا پانی ٹھنڈا تھا لہٰذا مجھے خوب مزا آ رہا تھا آج کل گرمی اپنے شباب پر تھی مگر اس کے باوجود نہر کا پانی کافی ٹھنڈا اور فرحت بخش تھا لہٰذا میں کافی دیر تک نہاتا رہا نہانے کے ساتھ ہی میری نظریں اس درخت پر بھی تھیں جہاں کی ایک شاخ کے ساتھ میں نے کرتا لٹکایا ہوا تھا میں مزے سے نہا رہا تھا نہاتے نہاتے میں نے پانی میں ایک گہری ڈبکی لگائی اور سانس روک کر نہر کے پانی میں نیچے کی جانب بیٹھ گیا میں سانس روکے پانی کے اندر بیٹھا تھا لیکن جب میری سانس رکنے لگی تو میں پانی میں تیرتا ہوا اوپر آیا اور میں نے پانی سے اپنا سر باہر نکالا اور گہری گہری سانسیں لیں اور تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھرا

اپنی سانس بحال کر کے میں نے اپنے چہرے پر آیا ہوا پانی صاف کیا اور اپنے بالوں کو بھی اپنے چہرے سے ہٹا کر پیچھے کی جانب کیا اور آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا، مجھے ماحول میں اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا میں نے آسمان کی جانب دیکھا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا نہر کا پانی بھی رواں دواں تھا، میں نے ایک بار پھر اپنے چہرے کو صاف کیا کیونکہ بالوں سے بہہ کر آنے والے پانی کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں میں نے چہرے کو صاف کیا پھر آنکھوں پر آئے پانی کو صاف کر کے نہر کے کنارے پر دیکھا۔۔۔۔۔

تو میں حیران رہ گیا سامنے نہر کے پار خشکی کا منظر میرے لئے قطعی اجنبی تھا مجھے وہ درخت کہیں نظر نہیں آیا جہاں میں نے اپنا کرتا لٹکایا ہوا تھا میں نے فوراً گھوم کر نہر کی دوسری جانب دیکھا مگر دوسری جانب کا منظر بھی میرے لئے اجنبی تھا۔

''یا اللہ یہ میں کہاں آگیا''؟ میں نے نہر کے دونوں کناروں کو دیکھنے کے بعد سوچا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں نہر میں تیرتے تیرتے کہاں آگیا میں نے تو صرف ایک گہری ڈبکی ہی نہر کے پانی میں لگائی تھی اور پانی کے اوپر آکر دیکھا تو منظر ہی تبدیل ہو چکا تھا میں بہت حیران تھا میرے گھر کے پاس جو نہر بہتی تھی یہ نہر لگ تو ویسی ہی رہی تھی مگر نہر کے پار کنارہ مجھے اجنبی محسوس ہو رہا تھا میں نہر کے کنارے کافی دور تک کا علاقہ جانتا تھا مگر جو منظر مجھے نہر کنارے نظر آرہا تھا یہ جگہ تو مجھے کبھی نہر کے کنارے دور دور تک نظر نہیں آئی تھی۔

میں جلدی سے تیر کر نہر کے کنارے پہنچا اور نہر سے باہر نکلا پھر میں نہر کے کنارے کنارے کافی دور تک پیدل چلا۔۔۔مگر مجھے اپنا گھر یا کوئی علاقہ بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے میں نے پہلے کبھی دیکھا ہو اور کوئی انسان بھی نظر نہیں آیا کہ جس سے پوچھ سکو کہ میں کہاں پر ہوں میں حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو رہا تھا سورج اپنی آخری کرنیں بکھیر کر غروب ہوا جاتا تھا میں نے ایک بار پھر اپنے چاروں جانب نظر دوڑائی دور دور تک کوئی انسان تو کیا کوئی جانور بھی نظر نہیں آرہا تھا بس اجاڑ جگہ تھی پتھریلی زمین پر جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور کوئی درخت یا پودا بھی نظر نہیں آرہا تھا میں نے نہر کی جانب دیکھا نہر حسب سابق اپنی آب و تاب کے ساتھ بہہ رہی تھی نہر کا پانی صاف و شفاف تھا میں کچھ دیر نہر کو دیکھتا رہا پھر میں نے آسمان کی جانب دیکھا جہاں چند پرندے بہت اونچائی پر اڑ رہے تھے۔

میں بہت زیادہ حیران تھا اور ساتھ ہی پریشان بھی ہو رہا تھا کہ آخر میں نہر میں تیرتے تیرتے کہاں آگیا میں نے تو صرف ایک ڈبکی لگائی تھی اور جب سر نہر کے پانی سے باہر نکالا۔۔۔تو میں اپنے علاقے کے بجائے اس انجان اور اجاڑ جگہ پر آگیا میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا میں نے مدد طلب نظروں سے آسمان کی جانب دیکھا پھر سر جھکا کو کچھ سوچنے لگا۔

''رات سر پر آنے والی ہے۔۔۔اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے مجھے کسی نہ کسی آبادی میں پہنچنا ہوگا'' کچھ دیر بعد میں نے سورج کی جانب دیکھا جو اپنی آخری کرنیں سمیٹ رہا تھا تو میرے ذہن میں ابھری۔ میں نے ایک بار پھر اپنے چاروں جانب دیکھا اور پھر اللہ کا نام لیکر ایک جانب قدم بڑھا دیئے تھوڑا چلنے کے بعد میں نے اپنے اطراف دیکھا میں ایک کھلے میدان میں تھا میرے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا اس کے علاوہ جگہ جگہ بڑے بڑے پتھروں کے ٹیلے سے تھے کہیں کہیں ایک آدھ درخت بھی کھڑا نظر آرہا تھا سورج کی آخری سنہری کرنوں میں پہاڑیاں سونے کی مانند چمک رہی تھیں کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہوتا مگر اس وقت میں اتنا پریشان تھا کہ میری توجہ کسی منظر پر نہ تھی میں بہت زیادہ پریشان تھا کہ آخر میں کہاں پر آگیا ہوں میرے علاقے کے آس پاس دور دور تک ایسا ویران اور اجاڑ کوئی علاقہ نہیں ہے۔

''آخر میں کہاں آگیا ہوں؟'' یہ سوچ مجھے

پریشان کئے دے رہی تھی ابھی تک مجھے کوئی انسان بھی نظر نہیں آیا تھا اور یہ بات مزید پریشان کن تھی میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز آنے لگی اور ساتھ ہی کچھ لوگوں کے چیخنے کی آوازیں بھی مجھے سنائی دے رہی تھیں۔

اچانک ایک پہاڑی کے عقب سے بہت سارے افراد گھوڑوں پر سوار نکلے اور انہوں نے لمحوں میں مجھے گھیر لیا وہ میرے چاروں جانب گھوڑوں پر سوار تھے ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں انہوں نے عجیب سا لباس پہن رکھا تھا ایسا لباس تو اکثر میں نے ہالی ووڈ کے ان فلموں میں دیکھا ہے جو پرانے زمانے پر بنائی جاتی ہیں، ایسا لگتا تھا جیسے ان لوگوں نے جانور کی کھال کو جسم پر لپیٹ رکھا ہو، وہ سب میرے چاروں طرف گھوڑوں پر بیٹھے تلواریں لہراتے ہوئے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔

میں پہلے ان لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوا تھا کہ چلو کسی انسان کی صورت تو نظر آئی مگر اب میں بہت زیادہ پریشان تھا کہ آخر یہ لوگ کون ہیں جو بیسویں صدی میں قبل مسیح کا لباس پہنے ہاتھ میں ننگی تلوار لئے میرے گرد چکر لگا رہے ہیں کچھ دیر وہ لوگ میرے گرد چکر لگاتے رہے پھر ان میں سے ایک شخص نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور میرے قریب آیا شاید وہ ان گھوڑ سواروں کا آفیسر تھا وہ شخص میرے قریب آکر اپنے گھوڑے سے اترا اور اس نے اپنی تلوار آگے بڑھا کر تلوار کی نوک میری گردن کے قریب کی، میں خوف سے لرزنے لگا میرا خون رگوں میں سوکھتا جا رہا تھا۔

''ت۔۔۔تم شیطان نانگا کے جاسوس ہو''؟ وہ شخص کسی انجان زبان میں بولا، حیرت انگیز طور پر مجھے اس شخص کے الفاظ سمجھ میں آرہے تھے اور یہ بات میرے لئے بہت حیران کن تھی کیونکہ وہ شخص جو زبان بول رہا تھا وہ زبان میں نے پہلی بار سنی تھی اور پہلی بار سنی ہوئی زبان پوری طرح میری سمجھ میں آرہی تھی۔

''نانگا کون نانگا۔۔۔۔میں کسی نانگا کو نہیں جانتا''؟ میں نے بوکھلا کر کہا یہ الفاظ ادا کر کے میں خود بھی حیران رہ گیا کیونکہ میں نے یہ الفاظ اسی زبان میں ادا کئے تھے جس زبان میں اس گھوڑ سوار نے مجھ سے بات کی تھی میں بہت زیادہ حیران ہو رہا تھا کیونکہ میں اپنی مادری زبان کے سوا کوئی اور زبان جانتا بھی نہیں تھا۔ پھر یہ انجان زبان میں، میں نے کس طرح اس شخص کو جواب دیا۔

''جھوٹ بولتے ہو۔۔۔تم ضرور اس شیطان نانگا کے جاسوس ہو اور ہمارے قبیلے کی جاسوسی کرنے آئے ہو؟'' وہ گھوڑ سوار چیخا پھر اس نے گھوم کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تو چار افراد اپنے گھوڑوں سے اترے اور میرے پاس آئے اور مجھے دبوچ لیا میں مزاحمت کرنا چاہتا تھا مگر ان لوگوں نے اچانک ہی مجھ پر ہلہ بول دیا اور مجھے دبوچ لیا اور میرے ہاتھ میرے جسم کے پیچھے کر کے رسی سے باندھ دیئے میں چیختا رہا مگر ان لوگوں نے میری بات نہ سنی میرے ہاتھ میرے جسم کے پیچھے باندھنے کے بعد ان افراد میں سے ایک نے مجھے دھکا دیا تو میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا جس پر وہ سب قہقہے لگانے لگے ساتھ میں مجھے کسی نانگا کے جاسوس ہونے کا الزام لگا رہے تھے پھر ان چاروں میں سے ایک شخص آگے بڑھا اس نے مجھے اٹھایا اور جیسے ہی میں کھڑا ہوا اس شخص نے زور سے مکہ میرے پیٹ میں مارا تو میری چیخ نکل گئی پھر وہ چاروں مجھ پر پل پڑے اور مجھے لاتوں اور مکوں سے مارنے لگے میں چیخ رہا تھا اور زور زور سے چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''میں کسی نانگا کا جاسوس نہیں ہوں۔۔۔میں تو نہر میں تیرتے تیرتے یہاں تک پہنچ گیا ہوں'' مگر وہ لوگ میری بات نہیں سن رہے تھے جب وہ مجھے کافی مار چکے تو ان میں سے ایک شخص نے میرا جھکا ہوا منہ میرے بالوں سے پکڑ کر اوپر کیا۔

''ت۔۔تم شیطان قبیلے کے سردار نانگا کے جاسوس ہو۔۔تمہارا لباس بھی عجیب ہے'' وہ شخص میرا منہ اوپر کر کے میرے اوپر چیخا۔

''ن۔۔نہیں۔۔میں کسی نانگا کو نہیں جانتا نہ ہی میرا تعلق شیطان قبیلے سے ہے۔۔۔میں پاکستان میں رہتا ہوں'' میں اس شخص کی بات سن کر بول اٹھا۔

'' پاکستان۔۔۔۔یہ کونسا قبیلہ ہے؟'' وہ سب میری بات سن کر حیران ہو گئے۔

''پاکستان قبیلہ نہیں۔۔۔ملک ہے'' میں پھر چیخا۔

''ملک۔۔یہ کیا ہوتا ہے''؟ وہ سب میری بات حیرانگی سے سن رہے تھے۔

''ملک جہاں ہم رہتے ہیں'' میں بولا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔۔۔ہم سب قبیلے میں رہتے ہیں۔۔تمہارا لباس تمہاری زبان ہم سے بہت الگ ہے تم ضرور نانگا شیطان کے جاسوس ہو'' اتنا کہہ کر اس شخص نے اپنی تلوار کی نوک میرے جسم میں چبھوئی اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا میں نے بدقت قدم آگے بڑھائے مجھے گرفتار کرنے والے سب لوگ گھوڑے پر سوار میرے پیچھے چل رہے تھے میرے ہاتھ ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے اور وہ رسی ایک گھوڑ سوار کے ہاتھ میں تھی وہ سب مجھے کسی جانور کی طرح ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے میرا ذہن ماؤف تھا اور کچھ بھی سوچنے سے عاری تھا میں نے اپنے آپ کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سب مجھے لیکر ایک بڑے سے قلعے کے اندر پہنچے جب ہم سب قلعے کے اندر داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی اور آسمان پر چاند چمک رہا تھا جس کی ملگجی روشنی میں قلعے کا منظر کسی ڈراؤنی فلم کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

وہ قلعہ پرانے زمانے کے طرز پر مٹی سے بنا ہوا تھا قلعے کے بڑے سے دروازے سے ہم سب اندر داخل ہوئے تو میں نے دیکھا قلعے کے دروازے کے ساتھ ایک بڑا سا میدان ہے اور اس میدان کے پار کافی تعداد میں مکانات بنے ہوئے ہیں سارے مکانات پرانے انداز کے تھے میں حیرانی سے سب چیزیں دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی سوچ رہا تھا کہ کیا میں کسی فلم کے سیٹ پر ہو، کیونکہ یہاں ہر چیز پرانے زمانے کی تھیں قلعے کی دیواریں قلعے کے اندر بنے مکانات گھوڑ سواروں کے ہتھیار اور ان کے لباس اور بول چال سب قبل مسیح کی یاد دلا رہا تھا میں سخت حیران ہو رہا تھا اور ساتھ ہی پریشان بھی کہ یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میں تو نہر میں نہا رہا تھا اور نہاتے نہاتے کہاں پہنچ گیا۔ اور پھر یہ لوگ کون ہیں جو مجھے کسی نانگا کا جاسوس سمجھ رہے ہیں میں ان لوگوں کی یہ غلط فہمی کس طرح دور کروں؟۔

''اس کو زندان میں بند کر دو۔۔۔صبح سردار اس کا فیصلہ کرینگے'' مجھے لانے والوں میں سے ایک شخص نے دوسرے سے کہا تو وہ شخص مجھے کھینچتا ہوا ایک جانب لے گیا اور مجھے ایک جھونپڑی نما کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے جھونپڑی کے اندر دھکا دیا اس دھکے کے زور سے میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ زمین پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی لہذا مجھے کوئی خاص چوٹ نہیں لگی۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی میں اندھیرا تھا لہٰذا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کچھ دیر بعد میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ یہ ایک چھوٹا سا جھونپڑی نما کمرہ ہے جہاں میں اکیلا قید ہوں جھونپڑی کے فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی ہے جھونپڑی مضبوط بانسوں سے بنی ہوئی ہے بانسوں کے درمیان بنے والی درزوں سے میں نے جھونپڑی کے باہر دیکھا باہر پہرے دار ہاتھ میں تلوار اور نیزے لئے پہرہ دے رہے تھے یہ سب دیکھ کر میں جھونپڑی کے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا کہ کس طرح میں نہاتے نہاتے اس علاقے میں آ نکلا اور یہ نا جانے کونسا علاقہ ہے اور اب تو رات ہو گئی ہے امی جان اور ابا جان کس قدر پریشان ہو رہے ہونگے مجھے اپنے ماں باپ بہن بھائی یاد آنے لگے، جانے میرے بغیر وہ کس حال میں ہونگے اور سب لوگ مجھے نہ جانے کس کس جگہ پر ڈھونڈ رہے ہونگے اور میں۔۔۔ میں یہاں ان جنگلیوں کے بیچ قید ہوں۔

''یا اللہ۔۔۔۔اے میرے پروردگار۔۔۔ مجھے اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اس مصیبت سے نجات دلا''۔ میں خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگنے لگا۔

اسی وقت جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک میری عمر کا لڑکا جھونپڑی میں داخل ہوا جس کے ایک ہاتھ میں کھانے کی پلیٹ تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک چراغ تھا چراغ کی روشنی سے جھونپڑی روشن ہو گئی وہ لڑکا جھونپڑی میں داخل ہوا اور چراغ جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھ کر کھانے کی پلیٹ لیکر میرے پاس آیا اور کھانے کی پلیٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے ہوئے بولا'' کھانا کھالو''۔

یہ کہہ کر وہ لڑکا جھونپڑی سے باہر جانے لگا تو میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بھائی۔۔۔میرے بھائی یہ کونسی جگہ ہے؟'' میں الجھانے لگا میری بات سن کر وہ لڑکا پہلے تو حیران ہوا پھر سخت لہجے میں بولا۔

''جگہ معلوم نہیں اور نانگا شیطان کی جاسوسی کرنے چلے آئے'' اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

''نہیں بھائی۔۔میں کسی نانگا کا جاسوس نہیں۔ میں تو نہر میں نہا رہا تھا کہ نہاتے نہاتے یہاں نکل آیا'' میں نے وضاحت کی۔

''کون سا قبیلہ ہے تمہارا'' میری بات سن کر وہ لڑکا سوچ میں پڑ گیا۔

''قبیلہ؟''۔

''ہاں۔۔کون سے قبیلے سے تمہارا تعلق ہے'' وہ لڑکا دوبارہ بولا۔

'' قبیلہ تو معلوم نہیں۔۔۔'' میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''قبیلہ معلوم نہیں۔۔۔'' اس لڑکے نے میری نقل اتاری پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا'' تم کہاں رہتے ہو؟''

'' میرے ملک کا نام پاکستان ہے'' میں نے جواب دیا۔

'' پاکستان۔۔یہ کونسا قبیلہ ہے''؟ وہ لڑکا حیران ہو کر بولا۔

''پاکستان قبیلہ نہیں ملک ہے'' میں نے جواب دیا۔

''ملک۔۔۔'' اس لڑکے کی حیرانی قابل دید تھی'' یہ ملک کیا ہوتا ہے؟''

''ملک۔۔۔۔پاکستان ایک ملک ہے جیسے ایران چین بھارت اور بنگلہ دیش۔۔۔'' میں مثال دے کر اس لڑکے کو سمجھانا چاہا۔

''تم مجھے کوئی دیوانے لگتے ہو۔۔یہ ملک کیا ہوتا ہے۔۔۔یہاں تو ہر شخص کا ایک قبیلہ ہوتا ہے'' وہ لڑکا حیران ہو کر بولا تو میں سوچ میں پڑ گیا کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے سر اوپر کیا اور اس شخص سے کہا۔

''آج تاریخ کیا ہے؟'' کچھ سوچ کر میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔

''آج پھاگن کی 17 تاریخ ہے'' وہ بولا۔

''پھاگن۔۔۔'' میں نے حیرت سے دہرایا پھر کچھ سوچ کر پوچھا'' سال کونسا ہے؟''

''سال 140''

''پھاگن تو بکرمی کلینڈر میں رائج ہے'' میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ہاں۔۔۔یہاں بکرمی کلینڈر ہی رائج ہے'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ مائی گاڈ۔۔بکرمی کلینڈر کا ایک سو چالیسواں سال۔۔۔۔یہ تو قبلِ مسیح کا وقت ہوا'' میں خوف سے لرز اٹھا۔

''قبلِ مسیح۔۔یہ کیا ہے؟'' وہ میری بات سن کر بول اٹھا مگر میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا میری خاموشی دیکھ کر وہ جھونپڑی سے نکل گیا۔ میں خاموشی سے سوکھی گھاس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اگر یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے۔۔۔تو کیا میں قبلِ مسیح میں آ گیا ہوں کیونکہ بکرمی کلینڈر تو قبلِ مسیح میں ہندوستان میں رائج تھا۔

''اوہ میرے خدا۔۔'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا ''کیا میں ٹائم زون کراس کر کے پچھلے دور میں آ گیا ہوں'' میں مسلسل سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا ''ان لوگوں کا لباس، زبان، رہن سہن، ہتھیار سب کے سب قدیم زمانے کے ہی تو لگ رہے ہیں تو واقعی میں اس وقت قدیم زمانے کے ہندوستان کی ایک ریاست میں قید ہوں'' سوچ سوچ کر میرا سر دکھنے لگا۔

''اے میرے مالک۔۔اے عظیم پروردگار۔۔ میرے حال پر رحم فرما۔۔'' میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ میرے ہی گناہوں کی سزا ہے جو اللہ نے مجھے اس طرح قدیم زمانے میں بھیج دیا میں دیر تک روتا رہا اور اللہ سے معافی مانگتا رہا جب میرا دل کچھ ہلکا ہوا تو میں نے آنسوؤں سے تر اپنا چہرہ صاف کیا اور جھونپڑی کی درزوں سے باہر جھانکنے لگا باہر چاند کی روشنی میں منظر کافی حد تک واضح تھا میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا میدان ہے جس کے پار مختلف سائز کے مکانات بنے ہوئے ہے میدان کے وسط میں ایک بڑا سا جنگلہ رکھا ہوا ہے اس جنگلے کے اندر ایک جانب چھوٹے جنگلے بنے ہوئے ہیں میں ان چھوٹے جنگلوں کی جانب غور سے دیکھا تو لرز اٹھا۔

کیونکہ ان چھوٹے جنگلوں میں جنگل کا راجہ شیر ببر بند تھا میں نے نظر گھما کر دوسری جانب دیکھا جہاں پہرے دار ہاتھ میں نیزے اور تلواریں پکڑے پہرہ دے رہے تھے۔ میں کچھ دیر باہر کا منظر دیکھتا رہا پھر واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

کھانا ابھی تک میرے سامنے رکھا تھا مجھے بھوک محسوس ہونے لگی میں نے بسمہ اللہ پڑھ کر کھانا کھانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے میں نے اپنے آپ کو کافی حد تک پرسکون کر لیا تھا جو بھی اور جیسا بھی ہے کی مصداق میں نے حالات سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ آگے جو بھی ہوگا اس کا مقابلہ مجھے مردانہ وار کرنا ہوگا یہی سوچ کر میں نے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا کہ جب جسم میں جان ہوگی تو آنے والی مشکلات کا مقابلہ کیا جا سکے گا۔ لہذا میں کھانا کھانے لگا۔۔۔

نہ جانے کیا چیز تھی مگر جو بھی چیز پکی ہوئی تھی وہ بہت لذیذ تھی میں نے پوری پلیٹ صاف کر دی اور پھر آرام کی غرض سے سوکھی گھاس پر لیٹ گیا۔ سیانے کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے لہذا میری بھی آنکھ لگ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔

شور شرابے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی، آنکھ کھلتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا، جھونپڑی کی درزوں سے دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور جھونپڑی کی درزوں سے باہر جھانکنے لگا باہر بہت سارے لوگ مجمع لگائے کھڑے تھے اور زور زور سے آوازیں نکال رہے تھے جیسے کوئی کھیل تماشہ ہونے والا ہو۔ میں باہر کا منظر دیکھنے میں مگن تھا کہ جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور تین چار موٹے تازے آدمی اندر داخل ہوئے۔

''لیکر چلو اسے'' ان آدمیوں میں سے ایک آدمی نے دوسرے آدمیوں کو حکم دیا تو دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور مجھے آگے کی جانب دھکیلنے لگے۔

''دھکا مت دو۔۔میں خود چلتا ہوں'' میں نے ان آدمیوں سے اپنا بازو چھڑایا اور جھونپڑی سے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے دو آدمی میرے آگے چل رہے تھے جبکہ دو میرے پیچھے مستعد تھے مجھے اس طرح نرغے میں جھونپڑی سے باہر نکالا گیا۔

جھونپڑی سے باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ میدان میں لوگوں کا ہجوم کھڑا ہے وہ چاروں آدمی اس ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے مجھے لیکر آگے بڑھے ہجوم میرے اوپر ہوٹنگ کر رہا تھا وہ مجھے ناگا کا جاسوس کہتے ہوئے مجھے زک پہنچانا چاہتے تھے مگر ہجوم کو کنٹرول کرنے کے لئے کئی پہرے دار ہاتھوں میں نیزے لئے ہجوم کو آگے بڑھنے اور مجھے کوئی زک پہنچانے سے روک رہے

تھے وہ چاروں آدمی مجھے ہجوم سے نکال کر میدان کے وسط میں لیکر آئے تو میں نے دیکھا کہ بڑے جنگلے کے پاس جس کے اندر چھوٹے جنگلے ہیں، میں نے رات ملگجی روشنی میں شیر دیکھا تھا میں اس جنگلے کے سامنے کھڑا ہوں وہاں ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا جس پر پہرے دار ہتھیار تانے کھڑے تھے شاید وہ بھی میری طرح کا قیدی تھا۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد مجھے لانے والے آدمیوں میں سے ایک نے جنگلے کے دائیں جانب دیکھا اور ادب سے جھک گیا میں نے اس آدمی کے جھکنے کے انداز سے ہی سمجھ لیا کہ دائیں جانب رکھی کرسیوں پر بیٹھا ہوا شخص یقیناً اس قبیلے کا سردار ہے۔

سردار کے دائیں جانب ایک بڑی عمر کی عورت بیٹھی تھی جو یقیناً اس سردار کی بیوی ہوگی جبکہ سردار کے بائیں جانب ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی جو شاید سردار کی بیٹی ہو سکتی تھی میں بغور ان سب کو دیکھ رہا تھا اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے لانے والے آدمیوں نے سردار سے کوئی بات کی تو سردار نے سر ہلا کر اس آدمی کو اجازت دے دی پھر اس آدمی نے پہرے داروں سے کچھ کہا تو پہرے دار دوسرے قیدی کی جانب بڑھے، جیسے ہی پہرے دار اس قیدی کے پاس پہنچے تو وہ قیدی زور زور سے چیخنے لگا پہرے داروں نے اس قیدی کو مضبوطی سے پکڑا اور جنگلے کے اندر دھکیل کر جنگلے کا دروازہ بند کر دیا۔

قیدی نے بہت کوشش کی کہ وہ جنگلے کے اندر نہ جائے مگر پہرے داروں کے آگے اس کی ایک نہیں چلی اور جیسے ہی پہرے داروں نے اس قیدی کو جنگلے میں دھکیلا جنگلے کے کونے میں بند بھوکا شیر اسے دیکھ کر غرانے لگا۔ دوسرے کونے میں بھی ایک اور بھوکا شیر بند تھا دونوں شیر زور زور سے دھاڑ رہے تھے ان کی دھاڑ سے میرا دل دہل رہا تھا مگر میں دل مضبوط کئے کھڑا تھا اور تماشہ دیکھ رہا تھا مجمع مسلسل شور مچا رہا تھا مجمع میں شور بڑھتا جا رہا تھا۔

اسی وقت جنگلے میں موجود ایک شیر کو کھول دیا گیا اور جیسے ہی شیر کو کھولا گیا وہ دھاڑتا ہوا قیدی کی جانب بڑھنے لگا، قیدی شیر کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر زور زور سے چیخ رہا تھا اور رو رہا تھا اور قیدی کے اس طرح چیخنے اور رونے سے مجمع خوش ہو رہا تھا شیر قیدی کی جانب بڑھا تو قیدی بھاگ کر جنگلے کے دروازے کے پاس آیا تاکہ جنگلے پر بندھی زنجیر کو کھول کر باہر نکل سکے مگر وہاں کھڑے پہرے داروں نے اپنے نیزے کی انیاں اس قیدی کو چبھوئی اور اسے دروازے سے دور رہنے پر مجبور کیا شیر نے قیدی کو لاچار پایا تو ایک زوردار دھاڑ ماری، شیر کی دھاڑ اتنی بھیانک تھی کہ ایک لمحے کو پورے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا قیدی شیر کی خوفناک دھاڑ سن کر دہل کر رہ گیا شیر نے ایک جست لگائی اور قیدی کو اپنے مضبوط پنجوں اور جبڑوں میں دبوچ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں قیدی کی گردن توڑ دی اور اس کی گردن میں اپنے مضبوط دانت گاڑ دیئے قیدی کی گردن سے خون کا فوارا بہہ نکلا اور جنگلے کی زمین کو سرخ کرنے لگا۔

قیدی کے مرتے ہی سارا مجمع خوشی سے شور کرنے لگا مجمع میں موجود کئی لوگ میری جانب اشارہ کر کر کے خوشی کا اظہار کر رہے تھے میں سمجھ گیا کہ اب اگلی باری میری ہے میں حالات کا بغور جائزہ لے رہا تھا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے رونا گڑگڑانا بیکار ہے مجھے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا سارا مجمع اور مجھے لانے والے پہرے دار شیر اور قیدی کی جانب متوجہ تھے شیر قیدی کو مارنے کے بعد اس کے گوشت کی ضیافت اڑا رہا تھا میں آہستہ سے اپنی جگہ سے تھوڑا سا آگے بڑھا اور سنبھلنے کے انداز میں، میں نے ایک پہریدار کا سہارا لیا پہرے دار نے ایک لمحے کو میری جانب دیکھا میں نے اپنے چہرے پر بے چارگی کے آثار پیدا کئے پہرے دار نے میری جانب دیکھا پھر مسکرا کر شیر کی جانب دیکھنے لگا میرے لئے یہ اچھا موقع تھا میں نے نہایت صفائی کے ساتھ اس پہرے

دار کی کمر میں اڑسا ہوا خنجر نکالا اور اپنے لباس میں چھپالیا اور پھر پیچھے ہٹ کر جنگلے کی جانب دیکھنے لگا جہاں شیر قیدی کے گوشت کو کھانے کے بعد اب ٹہلتے ہوئے اپنی کچھار کی جانب جارہا تھا۔

جیسے ہی شیر اپنی کچھار میں داخل ہوا ایک آدمی نے اس کی کچھار کا دروازہ بند کردیا پھر جنگلے کے باہر کھڑے پہرے دار نے جنگلے کا دروازہ کھول دیا تو تین چار آدمی جنگلے میں داخل ہوگئے اور جنگلے کی صفائی کرنے لگے قیدی کے باقیات کو ایک کپڑے میں باندھ کر اس کے خون کو زمین سے صاف کیا اور پھر جنگلے سے باہر نکل آئے۔

جنگلہ صاف ہونے کے بعد ایک پہرے دار نے مجھے زور سے جنگلے کے دروازے کی جانب دھکا دیا اس دھکے کی وجہ سے میں لڑکھڑاتے ہوئے کئی قدم آگے بڑھ گیا مگر زمین پر گرنے سے محفوظ رہا۔

''دھکا کیوں دے رہے ہو؟۔۔۔ میں خود ہی چلا جاتا ہوں'' میں نے اطمینان کے ساتھ دھکا دینے والے پہرے دار سے کہا اور نہایت اطمینان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے جنگلے کی جانب بڑھا میرے اس طرح خود سے جنگلے کے دروازے کی جانب بڑھنے کی وجہ سے پورے مجمع پر سکوت طاری ہوگیا ہر شخص حیران تھا کہ میں خود ہی موت کے منہ میں کیوں جارہا ہوں سب لوگ حیرت سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے پچھلے قیدی کی حالت سے سبق سیکھ لیا تھا کہ میں کتنا بھی گڑگڑاؤں یا روؤں یہ لوگ مجھ پر رحم نہیں کرینگے اور سب لوگ مجھے کسی نا نگا نام کے شیطان کا جاسوس سمجھ رہے ہیں لہذا میں اپنی توانائی رونے یا گڑگڑانے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا میں اپنی توانائیاں بچا کر رکھنا چاہتا تھا تاکہ بھوکے شیر کا مقابلہ کرسکوں۔

میں شیر سے مقابلے کے لئے تیار تھا اور اس سے مقابلے کے داؤ پیچ سوچ رہا تھا پہرے دار سے چرایا ہوا خنجر میں نے اپنے لباس میں چھپا رکھا تھا میں سست قدموں سے چلتا ہوا جنگلے کے دروازے تک پہنچا اور دروازے کی زنجیر ہٹا کر جنگلے کے اندر داخل ہوگیا میرے اندر داخل ہوتے ہی پہرے دار نے زنجیر لگا کر دروازہ بند کردیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی خاموش کھڑے تمام تماشائی زور زور سے چیخنے لگے اور خوشی کا اظہار کرنے لگے میرے جنگلے میں داخل ہونے کے بعد سامنے لگا دوسرے شیر کا چھوٹا دروازہ کھلا اور اس دروازے سے دوسرا بھوکا شیر کچھار سے نکل کر جنگلے میں داخل ہوا یہ شیر پہلے والے سے بھی زیادہ بڑا اور خونخوار لگ رہا تھا۔

شیر کچھار سے نکل کر جیسے ہی میری جانب بڑھا تو مجمع خوشی سے شور کرنے لگا سب لوگوں کو میری موت کا یقین تھا وہ سب چاہ بھی یہی رہے تھے کہ شیر میری بوٹی بوٹی کردے میں شیر سے کچھ دور کھڑا شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے شیر کے تیور دیکھ رہا تھا۔

شیر آہستہ آہستہ میری جانب بڑھا پھر مجھ سے کچھ دور رک کر میری جانب دیکھنے لگا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا منہ اوپر کرکے ایک زوردار دھاڑ ماری دھاڑ اتنی زور دار تھی کہ مجھے اپنا دل دہلتا ہوا محسوس ہوا میں نے مدد طلب نظروں سے آسمان کی جانب دیکھا اور دل ہی دل میں خدا سے مدد طلب کی ''کیا میں اپنے گھر سے دور صدیوں پہلے ایک شیر کے ہاتھوں موت سے ہمکنار ہوجاؤں گا''۔

میرے ذہن میں یہ خیالات گردش کررہے تھے میں نے شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر ایک زوردار آواز نکالی جیسے ٹارزن نکالتا ہے میرا مقصد اپنے خوف سے نجات پانا تھا سارا مجمع جہاں شیر کو دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور ان سب کی خواہش تھی کہ شیر میری تکا بوٹی کردے وہیں مجھے ایک چہرے پر اپنے لئے ہمدردی کے آثار بھی محسوس ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے وہ چہرہ مجھے شیر کے مقابلے میں فتح یاب دیکھنا چاہتا ہے اور وہ چہرہ سردار کے بائیں جانب بیٹھا اس جوان لڑکی کا تھا، وہ لڑکی مسلسل میری جانب دیکھ رہی تھی میں نے ایک

لمحے کو اس لڑکی کی جانب دیکھا اور پھر شیر کی جانب متوجہ ہوا شیر نے ایک بار پھر زور سے دھاڑ ماری یہ دھاڑ پہلی دھاڑ سے بھی زیادہ تیز اور خطرناک تھی اس دھاڑ کے ساتھ ہی شیر نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔

شیر کی چھلانگ کے ساتھ ہی سارا مجمع خوشی سے شور مچانے لگا سب لوگوں کو میری موت کا یقین تھا انہیں یقین تھا کہ اگلے لمحے میں شیر کے طاقتور پنجوں میں جکڑا زندگی کی بازی ہار رہا ہونگا۔

جیسے ہی شیر نے مجھ پر چھلانگ ماری میں تیزی کے ساتھ اپنی ایڑیوں پر گھوما اور اپنے بائیں جانب چھلانگ لگادی، شیر اپنے ہی زور میں جنگلے سے ٹکرایا شیر اتنی زور سے جنگلے سے ٹکرایا تھا کہ پورا جنگلہ ہل کر رہ گیا شیر کا وار اس طرح خالی جاتا دیکھ کر مجمع حیرت سے خاموش ہوگیا پھر مجھے تالی کی آواز سنائی دی تو میں نے اس آواز کی سمت دیکھا تالی سردار کے برابر بیٹھی خوبصورت سی لڑکی بجا رہی تھی وہ شیر کا وار خالی جانے پر خوش نظر آرہی تھی سردار نے نظر بھر کر اس کی جانب دیکھا تو اس لڑکی نے جھینپ کر ہاتھ نیچے کرلئے۔

شیر اپنا وار خالی جانے پر غصے میں آگیا اس نے پلٹ کر مجھے گھورا اور پھر کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر مجھ پر چھلانگ لگادی اس مرتبہ میں نے شیر کے حملے سے بچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ پھرتی کے ساتھ اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکالا اور جیسے ہی شیر میرے اوپر آیا میں نے تیز دھار خنجر اس کے گلے میں گھونپ دیا اور ساتھ ہی زمین پر لوٹ لگاتے ہوئے شیر سے دور ہوگیا شیر مجھ سے دور زمین پر گر پڑا تیز دھار خنجر نے شیر کی گردن کافی حد تک کاٹ دی تھی اور اس کے گلے سے خون کا فوارا نکل کر جنگلے کی زمین کو سرخ کررہا تھا شیر زمین پر گرنے کے بعد اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہوگیا اس نے مجھے دیکھ کر ایک دھاڑی ماری مگر اس مرتبہ اس کی دھاڑ میں پہلے والی بات نہ تھی بلکہ تکلیف نمایاں تھی شیر میری جانب بڑھا مگر اس مرتبہ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ تبدیل کی اور شیر کے پیچھے کی جانب آیا اور ایک چھلانگ مار کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور اس کی گردن میں گھسا ہوا خنجر نکالا اور خنجر کے پے در پے وار کرکے شیر کو زمین پر گرادیا شیر کے زمین پر گرتے ہی میں چھلانگ مار کر شیر سے دور ہٹ گیا اور ہاتھ میں خون آلود خنجر پکڑے شیر کو دیکھنے لگا جو نہایت تکلیف کے عالم میں زمین پر پڑا زندگی سے دور ہوتا جارہا تھا آخرکار شیر نے اپنے گردن زمین پر ڈال دی اس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں۔

شیر کے مرتے ہی میں نے خنجر لہراتے ہوئے ایک زوردار چیخ ماری جو خوشی کی چیخ تھی اور ساتھ ہی جنگلے کے دروازے کی جانب بڑھا جنگلے کے دروازے پر کھڑے پہرے دار نے گھبرا کر جنگلے کے دروازے میں پڑی زنجیر کھول دی اور میں دروازہ کھول کر باہر جنگلے سے باہر نکل آیا۔

سارے مجمع پر سکتہ سا چھایا ہوا تھا شاید ان لوگوں نے آج تک جنگلے سے کسی کو فتح یاب ہوکر باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا سردار کی آنکھوں میں بھی حیرت تھی بس خوشی کے آثار تھے تو اس لڑکی کی آنکھوں میں تھے جو سردار کے بائیں جانب بیٹھی تھی میں خون آلود خنجر لیکر آگے بڑھا تو پہرے دار بھی ڈر کر پیچھے ہوگئے۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں۔

اسی وقت مجھے مجمع میں شور اٹھا اور سارا مجمع تتر بتر ہوگیا اور لوگ سر پر پیر رکھ کر بھاگنے لگے اس کے ساتھ ہی آسمان سے ایک آگ کا گولہ زمین پر گرا اور کئی لوگ اس آگ کی لپیٹ میں آگئے میں نے جلدی سے اوپر دیکھا۔۔۔ تو میں حیران رہ گیا اوپر آسمان پر ایک ڈریگن اڑ رہا تھا اور آگ کے شعلے اس ڈریگن کے منہ سے نکل رہے تھے میں ڈریگن کو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔۔۔ آج تک اس طرح آگ اگلتا اور فضا میں اڑتا ڈریگن تو صرف فلموں میں دیکھا تھا۔۔۔ آج سچ مچ اپنی آنکھوں سے میں اس ڈریگن کو دیکھ رہا تھا ڈریگن آگ اگلتا ہوا فضا میں چکر لگا رہا تھا سب لوگ ڈریگن کے ڈر

سے بھاگ رہے تھے میں نے جلدی سے ایک بھاگتے ہوئے آدمی کو پکڑا۔

''یہ ۔۔۔یہ سب کیا ہے یہ ڈریگن کیسا ہے؟'' میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

''یہ ناگا شیطان کا ڈریگن ہے'' وہ آدمی مجھ سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولا اور پھر اپنا بازو میرے ہاتھ سے چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ڈریگن منہ سے آگ اگلتے ہوئے سیدھا اس جگہ حملہ آور ہوا جہاں سردار بیٹھا تھا اور پھر ڈریگن نے اڑتے اڑتے ایک غوطہ لگایا اور ٹھیک اس جگہ پر حملہ کیا جہاں سردار بیٹھا تھا مگر اس ڈریگن نے سردار کو کچھ نہیں کہا۔۔۔ بلکہ سردار کے بائیں جانب بیٹھی لڑکی کو اپنے پنجوں میں دبایا اور اوپر کی جانب اڑنے لگا لڑکی ڈریگن کے پنجوں میں دبی ہوئی خوف سے چیخ رہی تھی یہ وہی لڑکی تھی جس نے شیر کے خلاف میرے جیتنے پر تالیاں بجائی تھیں ڈریگن لڑکی کو پنجوں میں دبائے اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔

''شہزادی روبیسا۔۔۔۔ڈریگن شہزادی روبیسا کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے'' مجھے مختلف لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔

''اوہ۔۔تو وہ سردار کی بیٹی شہزادی روبیسا ہے'' میں نے سوچا۔

شہزادی روبیسا ڈریگن کے پنجوں میں قید چیخیں جا رہی تھیں۔ نیچے لوگ بھی چیخ رہے تھے مگر کوئی بھی اس ڈریگن سے لڑنے پر تیار نہیں تھا حالانکہ کئی لوگوں کے پاس مجھے تیر کمان نظر آ رہے تھے مگر وہ سب ڈریگن سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے میں نے ایک لمحے کو ڈریگن کے پنجوں میں قید شہزادی کو دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے میں اس جانب دوڑنے لگا جہاں ڈریگن اڑتا ہوا جا رہا تھا میرے اس طرح بھاگنے پر لوگوں پر مزید خوف طاری ہو گیا اور وہ سب مجھ سے دور ہونے لگے، میں خون آلود خنجر پکڑے تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر فصیل کی دیوار کے اوپر پہنچا اور پھر جیسے ہی ڈریگن فصیل کی دیوار کے قریب آیا میں نے اپنے پیر جوڑے اور ڈریگن کے اوپر چھلانگ لگا دی چھلانگ کے ساتھ ہی میرا دایاں ہاتھ تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا اور خنجر کے ایک ہی وار سے میں نے ڈریگن کی آدھی سے زیادہ گردن کاٹ دی پھر خنجر چھوڑا اور اپنے پیر جوڑے اور فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا زمین کی جانب گرتا چلا گیا زمین کے قریب پہنچ کر جیسے ہی میرے پیر زمین پر لگے میں زمین پر لوٹ لگا تا چلا گیا پھر جلدی سے زمین سے اٹھا اور ڈریگن کی جانب دیکھنے لگا ڈریگن شدید زخمی حالت میں تھا اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ چکی تھی اور خون اس کی گردن سے بہہ کر زمین پر پھیل رہا تھا۔

شہزادی روبیسا ابھی تک اس کے پنجوں میں دبی ہوئی چیخ رہی تھی ڈریگن زخمی ہونے کی وجہ سے صحیح طور پر اڑ نہیں پا رہا تھا اس کی گردن سے خون مسلسل بہہ رہا تھا آخر کار مسلسل نکلتے خون کی وجہ سے ڈریگن کی طاقت کم ہو گئی اور شہزادی روبیسا اس کے پنجوں سے نکل کر زمین کی جانب گرنے لگی زمین پر گرتے ہوئے شہزادی کے منہ سے بڑی بھیانک چیخیں نکل رہی تھیں میں تیزی کے ساتھ اس جانب لپکا جہاں شہزادی گر رہی تھی پھر میں نے نہایت مہارت کے ساتھ شہزادی کو فضا ہی میں کیچ کر لیا۔ شہزادی خوف سے لرز رہی تھی وہ ڈر کے مارے مجھ سے لپٹ گئی اس نے اپنی مرمریں بانہیں میرے گلے میں ڈالی ہوئی تھیں اور وہ میرے سینے سے لگے ہولے ہولے کانپ رہی تھی میں نے شہزادی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی اور اسے اطمینان دلایا کہ اب وہ خیریت سے ہے پھر شہزادی کو آرام سے زمین پر کھڑا کر دیا شہزادی اب بھی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔

سارا مجمع اب خوشی سے نعرے لگا رہا تھا سب لوگ میرے اور شہزادی کے گرد جمع ہو کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے مجھ پر لعن طعن کر رہے تھے اب میرے حق میں نعرے بازی کر رہے تھے، میں جو کچھ دیر پہلے ان سب کے لئے ولن تھا اور وہ سب میری موت کے خواہاں تھے اب میں ان کے لئے ہیرو بن چکا تھا ان سب کی آنکھوں میں میرے لئے ستائش تھی شہزادی میرے ساتھ لپٹی ہوئی ہولے ہولے کانپ رہی تھی اسی وقت زخمی ڈریگن ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر گرا زمین پر گرتے ہی ڈریگن کے جسم میں آگ لگ گئی۔

آگ کی حرارت سے بچنے کے لئے سب لوگ ڈریگن سے دور ہٹنے لگے میں نے بھی شہزادی کا ہاتھ پکڑا اور جلتے ہوئے ڈریگن سے دور ہٹ کر کھڑا ہوا گیا پھر میں نے ہولے سے شہزادی کے ہاتھ کی پشت کو سہلایا اور اسے تسلی دی۔

''شہزادی اب سب کچھ ٹھیک ہے وہ ڈریگن مر چکا ہے'' میں نے شہزادی کو تسلی دی تو شہزادی نے اپنے گھنیرے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا شہزادی کی جھیل جیسی آنکھیں دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا شہزادی اتنی حسین تھی کہ دل چاہ رہا تھا کہ میں کھڑے کھڑے وہ اسی طرح ساری زندگی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے رہیں۔

''روبیسا۔۔بیٹا تم ٹھیک ہو؟'' مجھے ایک کرخت آواز سنائی دی تو میں نے جلدی سے شہزادی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آواز کی سمت دیکھا۔ جہاں سردار اپنے مصاحبین کے ساتھ میری سمت چلا آ رہا تھا سردار کے آنے سے ہمارے گرد کھڑے لوگ ہم سے دور ہو کر کھڑے ہو گئے اور سردار ہمارے قریب آ گیا۔

''ابا۔۔ابا'' شہزادی روبیسا میرے پاس سے ہٹ کر سردار کے قریب پہنچی اور سردار کے گلے سے لگ گئی۔ شہزادی ابھی تک ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ شہزادی کی ماں بھی شہزادی سے لپٹ گئی خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنی بیٹی کے بچ جانے پر بہت خوش تھی۔

''بیٹی۔۔اب تم محفوظ ہو'' سردار نے شہزادی روبیسا کو تسلی دی پھر میری جانب متوجہ ہوا۔

''نوجوان تم کون ہو اور کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی میرا نام کاشان ہے'' میں نے جواب دیا۔

''تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو یہ تو ثابت ہو گیا کہ تم ناگا شیطان کے جاسوس نہیں ہو۔۔تم نے نہایت بہادری سے نہ صرف شہزادی کی جان بچائی بلکہ ناگا کے بھیجے ہوئے ڈریگن کو بھی مار گرایا'' سردار نے پھر مجھ سے پوچھا اب کی بار شہزادی بھی اشتیاق سے میرے جواب کی منتظر تھی۔

میں نے سردار کے سوال کے جواب میں اپنی پوری روداد سنا ڈالی کے کس طرح میں نہر میں نہا رہا تھا اور جب میں نے نہر میں ڈبکی لگائی تو نہ جانے کیسے اپنے شہر سے دور یہاں اس جگہ صدیوں قبل کے اس علاقے میں نائم کو کراس کرتے ہوئے پہنچ گیا میری روداد تمام لوگ حیرانگی سے سن رہے تھے۔

''اس کا مطلب ہے تم مستقبل سے آئے ہو؟'' کچھ دیر سردار سوچنے کے بعد بولا۔

''جی معلوم تو یہی ہوتا ہے'' میرے لہجے میں بیچارگی تھی۔

''اچھا تمہارا قبیلہ کونسا ہے؟''

''جی میں جس دور میں رہ رہا تھا وہاں قبیلے نہیں بلکہ ملک اور شہر ہوتے ہیں اور میں ملک پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں'' میں نے جواب دیا

''پاکستان''

''جی یہ میرے ملک کا نام ہے'' میں نے کہا۔

''تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔۔۔مگر تم نے شہزادی کی جان بچا کر ہمارے اوپر احسان کیا ہے لہذا تم ہمارے مہمان ہو'' سردار نے کہا تو سارا مجمع خوشی سے شور کرنے لگا۔

''مہمان کے رہنے کا بندوبست کیا جائے'' سردار نے اپنے ساتھ کھڑے لوگوں سے کہا پھر میری جانب توجہ دی'' نوجوان تم جب تک چاہو ہمارے قبیلے میں رہ سکتے ہو'' سردار اتنا کہہ کر واپسی کے لئے مڑ گیا اس کے ساتھ شہزادی روبیسا اور سردار کے مصاحبین بھی واپس جانے لگے سردار کے

جاتے ہی قبیلے کے لوگ میرے قریب آگئے اور مجھ سے ہاتھ ملانے اور بات کرنے کی کوشش کرنے لگے اب میں قبیلے والوں کی نظروں میں ہیرو تھا جس نے ان کی شہزادی کی جان بچائی تھی کچھ دیر قبل ہی وہ سب مجھے نفرت کا نشانہ بنا رہے تھے اور اب ہر شخص میری محبت کا دم بھر رہا تھا میں سب لوگوں سے بچتے ہوئے سردار کے پیچھے چل دیا سردار آگے کی جانب چل رہا تھا اور اس کے ساتھ شہزادی روبیسا چل رہی تھی مگر ہر قدم پر شہزادی مڑ کر میری جانب دیکھتی جارہی تھی اس کی آنکھوں میں محبت کا واضح پیغام تھا وہ مجھے پسند کرنے لگی تھی۔

ویسے سچی بات ہے میں بھی دل ہی دل شہزادی کو چاہنے لگا تھا اور حیرت انگیز طور پر اب میرے ذہن سے میرا گھر میرا شہر نکلتا جارہا تھا۔ اسی وقت ایک جوان لڑکا میرے قریب آیا یہ وہی لڑکا تھا جو قید خانے میں رات کو میرے لئے کھانا لے کر آیا تھا۔

''دوست تم تو ہیرو ہو تم نے نانگا کے سب سے بڑے ہتھیار ڈریگن کو مار گرایا۔۔۔تم بہت بہادر ہو'' وہ لڑکا بولا تو میں اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

''دوست میرا نام ایرن ہے اور تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا۔۔کاشش ششں'' ایرن کو میرا نام لینے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

'' کاشان'' میں نے مسکرا کر ایرن کو جواب دیا۔

''کا۔۔۔شا۔۔ن'' ایرن نے میرا نام کافی لمبا کردیا۔

''تم مجھے کاشی کہہ سکتے ہو'' میں نے ایرن کی مشکل آسان کی۔

''کاشی۔۔ہاں یہ آسان نام ہے'' ایرن خوش ہو کر بولا اور میرے کندھے پر نہایت بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا میں نے بھی اس کے کندھے پر بے تکلف دوست کی طرح ہاتھ رکھ دیا مجھے یہاں کوئی دوست چاہیے تھا تاکہ میں یہاں کے حالات سمجھ سکوں اور یہ بے تکلف دوست ایرن تھا۔

''آؤ۔۔۔سردار کے پاس چلتے ہیں میں ان سے اجازت لے کر تمہیں اپنے گھر لے جاتا ہوں'' اتنا کہہ کر ایرن نے میرے ہاتھ پکڑا اور اس جانب چل دیا جہاں سردار اپنے مصاحبین کے ساتھ گیا تھا۔

''سردار۔۔اگر اجازت ہو تو مہمان کو اپنے گھر لے جاؤں'' سردار کے سامنے پہنچ کر ایرن نے ادب سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں لے جاؤ۔۔مگر مہمان کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے'' سردار نے ایرن کو اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ سردار۔۔۔مہمان کا بہترین خیال رکھا جائے گا'' ایرن نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا میں سردار کے ساتھ کھڑی شہزادی روبیسا کو دیکھ رہا تھا جو سردار کا خیال بھی نہ کرتے ہوئے مسلسل مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''چلو کا۔۔شا۔۔ن'' سردار سے اجازت ملنے کے بعد ایرن نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ لئے اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک بڑے سے مکان کے سامنے پہنچ گئے۔

''یہ میرا مکان ہے'' ایرن مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

''مکان تو شاندار ہے'' میں نے مکان دیکھتے ہوئے کہا یہاں بنے ہوئے تمام مکانوں میں ایرن کا مکان کافی شاندار اور بڑا تھا۔

''میرے والد سردار کے خاص آدمی تھے'' ایرن بولا۔

''تھے۔۔مطلب'' میں ایرن کے الفاظ تھے میں کھو گیا۔

''ان کی موت ہو چکی ہے''۔

''اوہ۔۔۔'' میرے منہ سے نکلا ''کب اور کیسے ہوا تمہارے والد کا انتقال''۔

''پچھلے سال نانگا کے ایک حملے میں قبیلے کے کافی لوگ مارے گئے تھے اسی میں میرے والد بھی شامل تھے'' ایرن نے بتایا۔

''نانگا کو تمہارے قبیلے سے کیا دشمنی ہے'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''نانگا شہزادی روبیسا سے شادی کرنا چاہتا ہے'' ایرن بولا۔

''اوہ'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں۔۔نانگا شہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے سردار کے انکار کے بعد اس کی کوشش ہے کہ وہ شہزادی کو اغوا کرلے'' ایرن نے پوری بات بتائی۔

''سردار نے نانگا کا رشتہ کیوں قبول نہیں کیا'' میں نے پھر پوچھا تو ایرن بے ساختہ ہنس پڑا۔

''کیا ہوا تم کیوں ہنسے'' میں نے پوچھا۔

''اگر تمہارا بھی نانگا سے سامنا ہوا تو تم خود سمجھ جاؤ گے'' ایرن ہنسنے کے بعد بولا میں ایرن سے مزید کچھ سوال کرنا چاہتا تھا مگر اسی وقت دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا دروازہ کھولنے والی ایک بڑھیا عورت تھی۔

''اماں۔۔۔سردار نے مہمان کو ہمارے گھر رکنے کی اجازت دے دی ہے'' ایرن اس عورت کو دیکھتے ہی بولا ایرن کے بولنے پر میں سمجھ گیا کہ وہ بڑھیا ایرن کی ماں ہے۔

''آؤ۔۔آؤ اندر آؤ'' بڑھیا نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا تو ایرن اور میں گھر کے اندر داخل ہوگئے۔

''ایرن بیٹا یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ مہمان کو یہاں لے آئے۔۔۔اب اس گھر پر برکتیں نازل ہونگی'' ہم دونوں کے گھر میں داخل ہونے کے بعد بڑھیا نے ایرن سے کہا۔

''اماں بڑی زور کی بھوک لگی ہے اور کاشی نے تو صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔۔ذرا جلدی سے کھانا تو لگوا دو'' ایرن پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا تو ایرن کی اماں باورچی خانے کی جانب چل دی۔

تھوڑی دیر بعد میں اور ایرن کھانا کھا کر آرام کے غرض سے ایک کمرے میں آگئے۔

''یہ میرا کمرہ ہے اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو تمہارا بستر بھی یہیں لگوا دیتا ہوں اور اگر تمہیں الگ کمرہ چاہیے تو اس کا بھی انتظام ہوجائے گا'' کمرے میں پہنچنے کے بعد ایرن نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔پہلے بھی میرا بھائی میرا کمرہ شریک تھا اور اب تم میرے کمرہ شریک ہو'' میں نے کہا۔

''تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو اور تمہارے گھر میں اور کون کون ہے'' کچھ دیر بعد میں اور ایرن اپنے اپنے بستر پر بیٹھے تو ایرن نے پوچھا ایرن کے پوچھنے پر مجھے میرا گھر اماں ابا بہن بھائی محلے دار رشتے دار دوست احباب سب یاد آنے لگے میری آنکھیں جھلملانے لگی یہ دیکھ کر ایرن اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب آیا اور مجھے گلے لگاتے ہوئے بولا ''معاف کردینا بھائی میں نے تمہیں رلا دیا''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے بس تمہارے یاد دلانے پر مجھے گھر والے یاد آگئے'' میں نے جواب دیا۔

''میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر اپنی بساط بھر کوشش کرونگا کہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا سکوں'' ایرن کے لہجے میں خلوص تھا میں نے مسکرا کر ایرن کو گلے سے لگا لیا تو ایرن نے مجھے زور سے بھینچ لیا اس دور میں مجھے ایرن کی صورت میں بھائی نما دوست ملا تھا۔

میں اور ایرن باتیں کرتے ہوئے سو گئے میں ایرن کو اپنے بارے میں بتاتا رہا اپنے گھر والے اور دوست احباب کی باتیں اپنے دور کی باتیں یہ سب باتیں سننے کے بعد ایرن حیرت سے منہ کھولے ہوئے تھا۔

''اس کا مطلب ہے مستقبل میں انسان بہت ترقی کرلے گا'' ایرن میری باتیں سننے کے بعد بولا۔

''ہاں۔۔انسان نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے وہ چاند تک پہنچ چکا ہے'' میں مسکرا کر بولا۔

'' چاند پر۔۔بھی انسان پہنچ گیا'' ایرن کی حیرت عروج پر تھی۔

''ابھی مجھے نیند آرہی ہے باقی باتیں بعد میں کریں گے'' میں جمائی لیتے ہوئے بولا تو ایرن نے سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے اوکے۔۔شب بخیر'' ایرن بھی اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے بولا تو میں بھی بستر پر لیٹ گیا میں بہت زیادہ تھکا ہوا تھا لہذا فوراً ہی خواب وخرگوش کے مزے لینے لگا۔

رات کو خواب میں بھی میں سپنے دیکھتا رہا اور حیرت انگیز طور پر میرے سپنے اسی قبیلے کے متعلق تھے ویسے آپ سے کیا چھپانا زیادہ تر وقت میں سپنے میں شہزادی روبیسا کو ہی دیکھتا رہا۔نہ جانے میں کتنا وقت سوتا رہا کمرے میں کھٹ پٹ کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایرن کمرے میں کچھ کررہا ہے مجھے اٹھتا دیکھ کر میری جانب متوجہ ہوا۔

''صبح بخیر دوست'' ایرن خوش دلی کے ساتھ کہنے لگا۔

''صبح بخیر کیا صبح ہوگئی'' میں نے پہلے ایرن کو جواب دیا اور پھر خود بھی سوال کردیا۔

''صبح تو کب کی ہوگئی آپ گھوڑے ہی نہیں بلکہ سارے گدھے بیچ کر سو رہے تھے'' ایرن ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''اوہ'' میرے منہ سے نکلا اور میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیجئے میں ناشتہ لاتا ہوں'' ایرن یہ کہہ کر جانے کے لئے مڑا۔

''ایرن میری بات سنو'' میں نے ایرن کو روکا۔

''ہاں کیا بات ہے؟'' ایرن جاتے جاتے پلٹ کے میرے قریب آیا۔

''ایرن ہم دونوں دوست ہے نا'' میں نے ایرن کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہم پکے دوست ہیں'' ایرن نے حیرت سے جواب دیا وہ میرے سوال پر حیرت زدہ تھا۔

'' اگر ہم دوست ہیں تو یہ آپ جناب کیوں۔۔۔تم مجھے تم کہہ کر کیوں نہیں پکارتے'' میں نے کہا تو ایرن بے ساختہ ہنسنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔۔تو جلدی سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھولے میں ناشتہ لاتا ہوں'' ایرن بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا کہنے لگا اور پھر واپسی کے لئے مڑ گیا اور کمرے کے دروازے تک پہنچ کر رکا اور میری جانب گھوما۔

'' اب تو ٹھیک ہے نا'' ایرن نے رک کر پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے'' میں نے ہنستے ہوئے انگوٹھے کا نشان دیکھاتے ہوئے جواب دیا تو ایرن نے بھی جواب میں اپنا انگوٹھا ہلایا اور ہنستے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایرن ناشتہ لیکر آیا اور ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا ناشتے کے بعد میں نے ایرن سے کہا'' ایرن تم مجھے نہر پر لے جاسکتے ہو''؟

''ہاں ضرور۔۔مگر بعد میں ابھی تم تیار ہو جاؤ سردار کے دربار میں چلنا ہے وہ تمہیں یاد کر چکے ہیں'' ایرن نے کہا تو میں جلدی سے اٹھ کر منہ دھونے چلا گیا۔

''ایرن کیا تمہارے پاس کپڑے ہونگے میرے ناپ کے، میرا یہ لباس تو بہت گندا ہو گیا ہے'' میں نے منہ دھونے کے بعد ایرن سے پوچھا تو ایرن نے سامنے میز پر رکھے ایک لکڑی کے بکس سے نیا سوٹ نکال کر مجھے دے دیا یہ سوٹ اس دور کے لحاظ سے تھا ایک لمبے گاؤن جیسا میں نے اس گاؤن کو دیکھا پھر کپڑے بدلنے کے لئے اوٹ میں چلا گیا۔

کپڑے بدل کر میں ایرن کے ساتھ باہر نکلا تو

اسماء الحسنی کامیابی کا راستہ

پریشانیوں سے چھٹکارہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہوجایا کرتی ہیں

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو | جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو

شوہر یا بیوی کی اصلاح | اولاد کا نہ ہونا یا ہو کر مرجانا

گھریلو ناچاقی | کاروباری بندش

جنات کا سایہ | دیگر مسائل

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہو اور ہر عامل ناکام ہوگیا ہو ہم سے مشورہ ایک مرتبہ ضرور لیں عامل وہ جس کا علم سات سمندر پار چلے کالے وسفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید عالم شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

سید عالم شاہ

کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں

وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

خواھش زندگی کی کوئی خواہش ہے یا کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام رازداری کے ساتھ کلام الہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزمالیجئے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے

نوٹ: جو خواتین وحضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو وہ آنکھیں ہی کیا جن میں شرم نہ ہو وہ علم ہی کیا جس میں عمل نہ ہو، وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو

سید عالم شاہ رام تلائی چوک جی ٹی روڈ گجرات

0300-6282386

باہر ایرن کی اماں نظر آئی انھوں نے ایک نظر ہم دونوں پر ڈالی۔

''ان کپڑوں میں کافی اچھے لگ رہے ہو'' ایرن کی اماں نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''شکریہ اماں'' میں نے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر کہا'' میں نے آپ کو اماں کہا آپ نے برا تو نہیں مانا''۔

''نہیں بیٹا۔۔ مجھے خوشی ہوئی اب میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ میرا ایک نہیں بلکہ میرے دو دو بیٹے ہیں'' اتنا کہہ کر انہوں نے پہلے میری پیشانی چومی اور پھر ایرن کی پیشانی چومی۔

''ابے آتے ہی تو نے اماں کی محبت بانٹ لی'' ایرن بے تکلفی سے بولا۔

''ماں کو جھولی میں پیار کا سمندر بہتا ہے جو اس کی ہر اولاد کے لئے بے بہا ہوتا ہے اس میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی'' میں بولا۔

''صحیح کہہ رہے ہو بیٹا۔۔ ماں کی کتنی بھی اولادیں ہوں اس کی محبت کا سمندر سب کو اپنے اندر سمو لیتا ہے'' اماں میری بات سن کر بولی ہم دونوں اماں کی محبت سے دامن بھر کر ان کی دعاؤں کے چھاؤں میں گھر سے باہر نکلے۔

باہر قبیلے کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے میں اور ایرن سردار کے مکان کی جانب بڑھنے لگے میں قبیلے والوں کو کام کرتے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اس طرح کے مناظر میں نے اکثر ہالی ووڈ کی فلموں میں دیکھے تھے جو قبل مسیح کے زمانے کی عکاسی کرتی تھی اور۔۔ آج میں اسی وقت میں سانس لے رہا تھا یہ سب باتیں سوچنے سے میرا دماغ سن ہو رہا تھا لہٰذا میں نے اپنے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا اور سب لوگوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا قبیلے کے کئی افراد بھی اپنا کام کاج چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگے بعض افراد تو میرے قریب آ کر مجھ سے ہاتھ ملا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے میں بھی ان سے ہاتھ ملا کر خوش تھا اسی وقت میں نے دیکھا کہ ایک جگہ کافی لوگ دائرہ بنائے کھڑے ہیں شاید دائرے کے بیچ میں کوئی کھیل تماشہ ہو رہا تھا۔

''وہاں کیا ہو رہا ہے''؟ میں نے ایرن کی توجہ دائرے میں کھڑے لوگوں کی جانب دلائی۔

''وہاں نشانچی نشانے بازی کی مہارت دیکھا رہا ہے'' ایرن بولا۔

''نشانے بازی کے کرتب۔۔ کس چیز سے نشانہ لگا رہا ہے وہ'' میں نے ایرن سے پھر پوچھا۔

''تیر کمان سے نشانے بازی کے کرتب دکھاتا ہے'' ایرن بولا۔

''چلو ہم بھی دیکھتے ہیں میں نے آج تک کسی کو تیر کمان چلاتے نہیں دیکھا'' میں نے تجسس سے کہا۔

''کیوں تمہارے دور میں لڑائیاں نہیں ہوتی'' ایرن حیرت سے بولا۔

''کیوں نہیں۔۔ لڑائی تو انسان کی جبلت میں ہے وہ لڑے بغیر کیسے رہ سکتا ہے'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر تم لوگ کس چیز سے لڑتے ہو''

''پستول ، بندوق۔ میزائل۔ بم'' میں نے جواب دیا۔

''یہ سب کیا چیزیں ہیں''۔

''چھوڑو ان سب باتوں کو۔۔ آؤ تماشہ دیکھیں'' میں نے ایرن کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کی جانب کھینچا تو ایرن میرے ساتھ اس طرف بڑھ گیا جہاں تماشہ ہو رہا تھا ایرن نے لوگوں کو ہٹا کر جگہ بنائی تو میں ہجوم کے اندر داخل ہوا جہاں ایک شخص کمان پر تیر چڑھا کر نشانیاں مار رہا تھا۔

''یہ ابھی سیدھا اس جانب جائے گا اور وہ جو درخت پر دائرہ لگا ہے یہ تیر سیدھا اس دائرہ میں جا کر لگے گا'' میں نے دیکھا کافی دور ایک درخت کے تنے پر رنگ سے گول دائرہ بنا ہوا ہے میں دلچسپی سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا اس شخص نے تیر کمان پر چڑھایا اور پھر اپنی ایک آنکھ بند کر کے تیر کو نشانے پر چھوڑ دیا تیر سیدھا دائرہ کی جانب بڑھا اور دائرے میں جا کر

درخت میں پیوست ہو گیا سارا مجمع تالیاں بجانے لگا۔

''ہے کوئی جوان جو اپنے نشانے کو آزمانہ چاہے'' اس شخص نے نشانہ لگانے کے بعد مجمع کی جانب منہ کر کے کہا۔

''ہاں۔۔ میرا دوست بہترین نشانچی ہے وہ نشانہ لگائے گا'' اچانک ایرن بول اٹھا اور میرا بازو پکڑ کر مجمع سے نکل کر اس شخص کے مقابل پہنچ گیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو ایرن۔۔ مم۔۔ مجھے تیر چلانا نہیں آتا'' میں نے بوکھلا کر ایرن سے کہا۔

''تم کوشش تو کرو۔۔ مجھے یقین ہے تم اچھے نشانے باز ہو'' ایرن اس شخص سے تیر کمان لیتے ہوئے بولا۔

''لیکن۔۔'' میں نے کہنا چاہا مگر ایرن نے مجھے کوئی موقع نہ دیا اور تیر کمان میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ آخر کار کوئی راستہ نہ پا کر میں نے تیر کمان پر چڑھانے کی کوشش کی سارا مجمع مجھے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور میرا دل اندر ہی اندر گھبرا رہا تھا کہ جو عزت کل بنی تھی وہ آج مٹی میں مل جائے گی۔ میں نے خدا کا نام لیکر تیر کمان پر چڑھایا اور پھر ایک آنکھ بند کر کے درخت پر بنے دائرہ کا نشانہ لیا جہاں پہلے ہی سے ایک تیر پیوست تھا۔

آخر کار میں نے اللہ کا نام لیا اور کمان کو کھینچ کر تیر چھوڑ دیا تیر شوں کی آواز کے ساتھ ہوا کے دوش پر سفر کرتا ہوا اپنے نارگٹ کی جانب چلا اور پھر درخت پر بنے دائرے میں اس طرح پیوست ہوا کہ پہلے سے لگا ہوا تیر درخت سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ تیر نشانے پر لگتے ہی سب لوگ زور زور سے تالیاں بجانے لگے کچھ لوگ سیٹیاں بھی بجا رہے تھے صدیوں پہلے سے کسی کو داد دینے کا انداز وہ ہی جو بیسویں صدی میں تھا میں نے مجمع کی جانب دیکھتے ہوئے کمان کو لہرایا تو تالیاں اور تیز ہو گئیں۔

''نوجوان۔۔ تم کافی اچھے نشانے باز ہو'' مجھ سے پہلے تیر چلانے والے شخص نے مجھ سے کمان لیتے ہوئے میرا کندھا تھپک کر مجھے شاباشی دی۔

''اوئے ۔۔۔ تو بہترین نشانچی ہے خوامخواہ نخرے کر رہا تھا'' ایرن نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''یار یقین کر۔۔ میں نے آج پہلی بار تیر چلایا ہے'' میں نے ایرن کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

''چل چل مذاق مت کر۔۔'' ایرن بولا۔

''واقعی ایرن میں نے آج پہلی بار تیر کمان کو ہاتھ لگایا ہے'' میں نے ایرن کو یقین دلانا چاہا۔

''مذاق نہ کرو۔۔ چلو جلدی سے سردار ہمارا انتظار کر رہے ہونگے'' ایرن بولا اور میرا ہاتھ پکڑ کر سردار کے مکان کی جانب بڑھا۔

میں شدید حیران ہو رہا تھا کہ آخر میں نے تیر کیسے چلا لیا اور نہ صرف تیر چلایا بلکہ نشانہ بھی ٹھیک لگایا۔ ایرن میرا ہاتھ پکڑ کر سردار کے مکان کی جانب چل رہا تھا اور میں اس کے ساتھ کافی حیرانگی سے چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک بڑا سا شاندار مکان نظر آیا قبیلے میں اس سے زیادہ شاندار مکان کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ایرن میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے مکان کے دروازے کے سامنے لے گیا جہاں دروازے کے پاس دو پہرے دار ہاتھ میں نیزے پکڑے کھڑے تھے مجھے اور ایرن کو دیکھ کر ان پہرے داروں نے اپنے نیزے نیچے کئے اور ادب سے جھک کر ہم دونوں کو سلام کیا ایرن میرا ہاتھ پکڑے مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

مکان میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا ہال ہے جہاں سامنے تخت پر سردار براجمان ہے اس کے ساتھ شہزادی روبیسا بیٹھی ہوئی ہے اور سردار کے سائیڈ میں رکھی کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایرن نے آگے بڑھ کر سردار کو ادب سے سلام کیا تو میں نے بھی سردار کو سلام کیا مگر میری نظریں مسلسل شہزادی روبیسا پر جمی ہوئی تھیں شہزادی بھی مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ عشق کی آگ دونوں جانب برابر

کی لگی ہوئی ہے۔

''کیسے ہو کاشان تم''؟ سردار نے مجھے براہ راست مخاطب کی۔

''ٹھیک ہوں سردار'' میں وہاں کے رسم ورواج کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ایرن کے گھر کوئی تکلیف تو نہیں ہے'' سردار نے پھر پوچھا۔

''نہیں سردار ایرن بہت مہمان نواز ہے مجھے وہاں کوتکلیف نہیں ہے'' میں نے جواب دیا۔

''اگر تم چاہو تو ہم مہمان خانے میں تمہاری رہائش کا بندوبست کر سکتے ہے''۔

''شکریہ سردار میں ایرن کے گھر زیادہ کمفرٹیبل محسوس کرر ہاہوں'' میں نے جواب دیا۔

''کیا کہا تم نے'' اچانک میرے منہ سے انگریزی کا لفظ نکلا تو سردار سمجھ نہ سکا۔

''میرا مطلب ہے میں ایرن کے گھر زیادہ راحت محسوس کرر ہاہوں اور ایرن تو میرا چھوٹا بھائی بن چکا ہے'' میں نے وضاحت کی تو سردار نے رضامندی سے گردن ہلادی۔

''یقیناً ایرن اور اس کی والدہ بہت مہمان نواز ہیں'' میں نے سردار کو ایک بار پھر جھک کر سلام کیا اور ان سے اجازت چاہی سردار نے جانے کی اجازت دیدی میں واپسی کے لئے مڑا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھ ایرن نہیں ہے میں نے مڑ کر دیکھا ایرن اپنی جگہ پر کھڑا شہزادی کے عقب میں کھڑی شہزادی کی کنیز خاص کو مسلسل دیکھے جارہا تھا شہزادی کی کنیز بھی ایرن کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایرن کا بازو پکڑا اور اسے اپنی جانب گھسیٹا۔

''کک ۔۔کیا ہوا۔ کیا ہوا؟'' ایرن بوکھلا کر بول اٹھا۔

''چل ۔۔جلدی چل سردار نے جانے کی اجازت دے دی ہے'' میں نے ایرن سے کہا اور ایک بار پھر سردار کو سلام کر کے ایرن کو گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب چل دیا ایرن کی نظریں مسلسل شہزادی کے عقب میں گڑی ہوئی تھیں میں ایرن کو کھینچتا ہوا دربار سے باہر لیکر آیا۔

''کیا مصیبت ہے یار۔۔ تھوڑی دیر تو دربار میں رکنے دیتے'' ایرن باہر آکر مجھ پر جھنجھلانے لگا۔

''یہ کیا حرکت تھی۔۔ شہزادی کی کنیز کو کیوں دیکھ رہا تھا''؟ میں نے ایرن کا چہرہ اپنے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ۔۔وہ'' ایرن اس طرح بوکھلا گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''کون ہے وہ اور یہ چکر کب سے چل رہا ہے'' میں نے ایرن سے پھر پوچھا۔

''کک۔۔کون سا چکر۔۔ کوئی چکر نہیں۔۔۔ کوئی چکر نہیں'' ایرن شدید بوکھلایا ہوا تھا۔

''ایرن میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے'' میں نے ایرن سے کہا۔

''وہ۔۔وہ شہزادی روبیسا کی کنیز ہے دلنواز نام ہے مجھے اچھی لگتی ہے۔۔ پچھلے چھ ماہ سے ہم دونوں رات کو باغ میں ملتے ہیں شہزادی کی شادی ہو جائے پھر میں بھی دلنواز سے شادی کرلوں گا'' ایرن شرماتے ہوئے کہنے لگا۔

''واہ میرے شیر۔۔'' میں نے ایرن کو گلے لگاتے ہوئے کہا'' اس کا مطلب ہے محبت کا چکر صدیوں پہلے بھی چلتا تھا''۔

''میرا خیال ہے جب سے انسان اس زمین پر آیا ہے یہ چکر چل ہی رہا ہے'' ایرن بولا۔

''چل اب اپنی دلنواز کا خیال چھوڑ اور مجھے نہر پر لیکر چل'' میں نے کہا۔

''کیوں۔۔۔ نہر پر کیوں جانا چاہتے ہو'' ایرن بول اٹھا۔

''تو چل رہا ہے یا میں کسی اور کے ساتھ چلا جاؤں'' میں نے ایرن کو دھمکی دی تو ایرن ناراض نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''ناراض نہ ہو۔۔ تیرے علاوہ میرا یہاں ہے ہی کون'' میں نے ایرن کے پیٹ میں گدگدی کی تو وہ ہنسنے لگا پھر ایرن مجھے لیکر اصطبل تک گیا اور اصطبل سے دو گھوڑے جن پر زین کسی ہوئی تھی لیکر باہر نکلا۔

''کیا ہم نہر تک گھوڑے پر جائیں گے'' میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

''تو پھر کیا پیدل جائیں گے'' ایرن نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں۔۔۔ پیدل چلتے ہے'' میں نے سچ مچ بوکھلا گیا تھا کیونکہ آج تک میں نے گھوڑے کی سواری نہیں کی تھی۔

''نہر بہت دور ہے اگر پیدل جائیں گے تو رات کو ہی وہاں پہنچیں گے اس لئے گھوڑے پر جانا ٹھیک رہے گا'' ایرن بولا۔

''مگر۔۔۔ مگر میں کبھی گھوڑے پر بیٹھا نہیں ہوں'' میری بوکھلاہٹ ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''ہاں۔۔ تم نے تو کبھی تیر بھی نہیں چلایا تھا ۔۔اور نشانہ ایسا بہترین لگایا'' ایرن بولا تو میں سوچ میں پڑ گیا واقعی میں نے کبھی تیر کمان کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا اور پہلی بار ہی تیر چلایا تو مجھے ایسا لگا جیسے تیر کمان سے میرا برسوں کا یارانہ ہو۔

''چل ٹھیک ہے گھوڑے پر چلتے ہیں'' میں نے ایک گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا تو ایرن نے دوسرے گھوڑے کی باگ پکڑی اور گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی ایرن کی نقل کی اور اچھل کر گھوڑے پر بیٹھا گھوڑے پر بیٹھ کر مجھے بالکل ایسا نہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں پہلی بار گھوڑے پر بیٹھا ہوں میں نے گھوڑے کی لگام تھامی اور مہمیز کو دبایا تو گھوڑا تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ ایرن نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میرے ساتھ گھوڑا دوڑانے لگا مجھے گھوڑا دوڑانے میں بڑا مزا آرہا تھا مجھے بالکل ایسا نہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں پہلی بار گھوڑا دوڑا رہا ہوں۔

میں اور ایرن گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے نہر تک پہنچے۔

نہر کے پاس پہنچ کر میں اور ایرن گھوڑوں سے اترے اور گھوڑوں کو ایک بڑے سے پتھر سے باندھ دیا اور نہر کے بالکل پاس چلے آئے میں نے نہر کے پانی کو غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسی نہر میں لگائی گئی میری ایک ڈبکی نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا دودن سے میں اپنے گھر سے دور ہوں میری غیر موجودگی میں امی جان کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا ہو گا اور ابا جان اور میرے بھائی بہن سب مجھے تلاش کر رہے ہوں گے میں نہر کے پانی کو دیکھ رہا تھا اور سوچوں میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا نہر کا شفاف پانی مسلسل بہہ رہا تھا۔

''یہ نہر صدیوں سے اسی طرح بہہ رہی ہے۔۔ آج بھی اور مستقبل میں بھی'' میں سوچ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو دوست۔۔ کیا نہانے کا ارادہ ہے'' ایرن بولا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں گرمی ہو رہی ہے نہا ہی لیتا ہوں'' میں نے اتنا کہہ کر اپنا اوپری لباس اتارا اور نہر میں چھلانگ لگا دی نہر کا پانی ٹھنڈا اور فرحت بخش تھا میں نہر میں تیرنے لگا۔

''آجاؤ ایرن تم بھی نہر میں ایک ڈبکی لگا لو'' میں نے نہر کا پانی اچھالتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم نہاؤ میں یہیں بیٹھا ہوں'' اتنا کہہ کر ایرن میرے کپڑے سنبھال کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور میں نہر میں نہانے لگا، نہاتے نہاتے میں نے نہر کی گہرائی تک ایک غوطہ لگایا میری سوچ یہی تھی کہ میں ایک گہرا غوطہ لگاؤں گا اور پھر جب پانی کے اوپر آؤں گا تو اپنے گھر کے پاس اپنے زمانے میں ہونگا۔ میں کافی دیر تک پانی کے اندر رہا جب میری سانس رکنے لگی تو میں نے پانی سے اپنا سر باہر نکالا اور آہستہ سے آنکھیں کھولیں مجھے پوری توقع تھی کہ اب میرے سامنے میرے گاؤں کا منظر ہو گا اور میں نہر سے نکل کر اپنے گھر چلا جاؤں گا۔

میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور نہر کے پار کا منظر دیکھا۔ تو مجھے منظر کچھ دوسرا ہی نظر آنے لگا نہ وہاں اب ایرن تھا نہ ہی گھوڑے تھے اور وہ نہ ہی میرے گاؤں کا منظر تھا یہ تو کوئی اور ہی جگہ تھی میں پریشان ہوکر کنارے کی جانب تیرنے لگا۔

''کاشان۔۔کاشان''، مجھے آواز سنائی دی تو میں نے نہر سے نکل کر آواز کی سمت دیکھا کافی دور ایرن میرے کپڑے سنبھالے دوڑتا ہوا آتا نظر آیا۔

''اوہ۔۔میں جہاں تھا وہیں ہوں'' میرے ذہن میں سوچ ابھری۔

''تم نہر میں غوطہ لگا کر اتنی دور نکل آئے'' ایرن میرے قریب آکر پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔

''مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ میں کہاں نکل آیا'' میں نے ایرن سے اپنے کپڑے لیتے ہوئے جواب دیا اور اپنا جسم پونچھ کر اپنا لباس پہنا اور ایرن کے ساتھ اس جانب چل دیا جہاں گھوڑے کھڑے تھے۔

''کاشان کیا تم واقعی مستقبل سے آئے ہو''؟ چلتے چلتے ایرن نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''تم۔۔تم بتاؤ مستقبل میں یہ دنیا کیسی ہے''؟ ایرن کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''ایرن۔۔مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی مستقبل کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کروگے'' میں نے سوچتے ہوئے ایرن سے کہا۔

''کیوں''

''بس۔۔میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا مستقبل میں انسان نے ترقی تو بہت کی۔۔۔مگر وہ انسانیت سے گرگیا ہے'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب''

''ہم اس بات کو یہیں ختم کردیں تو بہتر ہے'' میں نے جواب دیا تو ایرن میرا موڈ دیکھ کر خاموش ہوگیا اور ہم دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے گھوڑوں تک پہنچے اور گھوڑوں پر بیٹھ کر واپس قبیلے کی جانب چل دیئے۔

قبیلے واپس پہنچتے تک رات ہونے لگی تھی جیسے ہی میں اور ایرن قبیلے والوں کے پاس پہنچے سب لوگ ہمارے اردگرد جمع ہوگئے تھے ہر شخص ہماری خیریت دریافت کررہا تھا۔

''بیٹا کہاں چلے گئے تھے تم لوگ۔۔ہم سب یہاں پریشان ہورہے تھے؟'' ایک بزرگ شخص نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہم لوگ نہر تک گئے تھے'' ایرن نے جواب دیا۔

''نہر پر کیوں؟'' لوگوں کی تعجب بھری آوازیں ابھری۔

''کاشان کو نہر میں نہانا تھا'' ایرن بولا میں سب لوگوں کو دیکھ رہا تھا ہر شخص میرے لئے فکر مند تھا اور مجھے بھی ایسا لگنے لگا تھا جیسے میں اسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں اور یہیں کا رہنے والا ہوں غرض میں اور ایرن لوگوں کی باتوں کا جواب دے کر گھر کی جانب بڑھے۔

''ایرن بیٹا تم دونوں کہاں چلے گئے تھے دیکھو کتنی رات ہوگئی ہے'' گھر میں داخل ہوتے ہی ایرن کی ماں جی سے سامنا ہوگیا تھا۔

''اماں وہ میں ایرن کو نہر پر لے گیا تھا'' ایرن کے بجائے میں نے جواب دیا تو ماں جی مجھے دیکھنے لگیں۔

''مم۔۔میں نے آپ کو اماں کہا۔۔آپ نے برا تو نہیں مانا'' میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

''بالکل نہیں۔۔اب میں فخر سے کہوں گی کہ میرے دو دو جوان بیٹے ہیں'' ماں جی نے کہا اور بے ساختہ میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیکر میرا ماتھا چوم لیا مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میری ماں ہو۔

''اوئے تو نے تو میری ماں کے پیار پر قبضہ ہی

کرلیا'' ایرن مصنوعی خفگی کے ساتھ بولا۔

''ماں کا پیار بانٹنے سے کم نہیں ہوتا'' ماں جی نے ایرن کے ماتھے پر بھی پیار کیا تو ایرن ماں جی سے لپٹ گیا پھر ماں جی نے مجھے بھی اپنے ساتھ لپٹا لیا ہم تینوں پیار میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

''چلو جلدی سے ہاتھ منہ دھولو۔۔میں کھانا لگاتی ہوں'' ماں جی بولیں تو ہم دونوں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ دھونے کے لئے چل دیئے۔

کھانا وغیرہ کھا کر میں بستر پر لیٹ گیا دن میں بہت تھک گیا تھا لہٰذا نیند میری آنکھوں میں جھلملانے لگی میری آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں میں سوئی اور جاگی کیفیت میں تھا کہ ایرن نے میرا کندھا ہلا کر مجھے اٹھایا۔

''کیا ہوا ایرن۔۔کیا بات ہے؟'' میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے ایرن سے کہا۔

''کا۔۔کاشان جلدی سے اٹھو جاؤ'' ایرن کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' ایرن کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر میں جلدی سے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''چلو۔۔چلو جلدی چلو'' ایرن مجھے بازو سے کھینچتا ہوا بولا۔

''کہاں جانا ہے'' میں نے بستر سے نیچے اترتے ہوئے ایرن سے پوچھا ایرن کے اس طرح کے رویے کی وجہ سے میں پریشان ہورہا تھا کہ خدانخواستہ نہ جانے کیا بات ہے جو ایرن مجھے اس طرح کھینچتا ہوا لے جارہا ہے۔

''ایرن مجھے بتاؤ تو کیا بات ہے؟'' میں نے کمرے سے نکلنے کے بعد اپنے قدم مضبوطی سے فرش پر جمالئے ایرن کے کھینچنے کے باوجود میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔

''وہ۔۔وہ دلنواز آئی ہے'' ایرن بولا تو میں نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلا دیا۔

''دلنواز آئی ہے تو میں کیا کروں تو مل اس سے'' میں نے نہ سمجھی کے انداز میں کہا۔

''دلنواز کہہ رہی ہے کہ باغ میں شہزادی صاحبہ آپ کا انتظار کررہی ہیں'' ایرن نے پوری بات بتائی۔

''شہزادی باغ میں میرا انتظار کیوں کررہی ہے''؟ میں نے حیرانگی سے کہا۔

''ایک جوان لڑکی کسی لڑکے کا انتظار کیوں کرتی ہے'' سامنے سے آتی ہوئی دلنواز نے کہا تو دلنواز کو دیکھ کر ایرن کے چہرے پر رونق آگئی۔

''میں مطلب نہیں سمجھا'' میں نے سمجھتے ہوئے نہ سمجھی کا انداز اپنایا۔

''ایرن تمہارا دوست واقعی بے وقوف ہے یا بن رہا ہے'' دلنواز نے ایک ادا سے اپنے ماتھے کی لٹ کو جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''ابے شہزادی تیرے پیار میں پاگل ہورہی ہے اور تو یہاں بک بک کررہا ہے'' ایرن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''پاگل ہے تو'' میں نے ایرن کا ہاتھ جھٹکا۔

''چل۔۔جلدی چل'' ایرن نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتا ہوا باغ کی جانب چل دیا باغ کے دروازے سے اندر داخل ہوکر میں نے دیکھا کہ شہزادی روبیسا باغ میں ایک بڑے سے پتھر کے اوپر بیٹھی آسمان پر چاند کو گھور رہی ہے قدموں کی آواز سن کر شہزادی نے اپنا سر آواز کی سمت گھمایا اور ہمارے اوپر نظر پڑتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔اور پروقار انداز میں چلتی ہوئی ہمارے قریب آئی۔

''تم دونوں کچھ دیر کے لئے ہمیں تنہا چھوڑ سکتے ہو'' شہزادی روبیسا نے کہا تو دلنواز اور ایرن فوراً وہاں سے چلے گئے جاتے جاتے ایرن نے معنی خیز انداز میں میری جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرایا میں بھی مسکرا دیا۔

''ہم تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں'' شہزادی نے کہا۔

''یہ تو میرا فرض تھا شہزادی'' میں نے دل پر

قابو پاتے ہوئے کہا شہزادی روبیسا کے ساتھ تنہائی میں میرا دل مجھے پہلو سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا شہزادی کے بدن سے اٹھتی خوشبو میرے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

''تمہارا نام بہت مشکل ہے کا۔۔۔شان'' شہزادی نے میرا نام ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔

''جو مجھ سے پیار کرتے ہیں وہ مجھے کاشی کہتے ہیں'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''پھر تو ہم آپ کو کاشی ہی کہیں گے'' شہزادی کا اقرار کافی دلچسپ تھا میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

''کیوں کیا آپ ہمیں کاشی کہنے کا حق نہیں دیں گے'' شہزادی میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہم تو پہلی نظر میں ہی آپ کے ہو گئے تھے آپ کی مرضی جو جی چاہے پکاریں شہزادی'' میں نے بھی محبت کا اقرار کیا۔

''جو ہم سے پیار کرتے ہیں وہ ہمیں روب کہتے ہیں'' شہزادی روبیسا نے ایک ادا سے کہا۔

''روب۔۔واقعی خوبصورت نام ہے'' میں نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور شہزادی روبیسا کا ہاتھ پکڑ لیا روبیسا نے میری جرأت کا برا نہیں مانا تو میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں اور روبیسا رات گئے تک باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے جب صبح کی پو پھٹنے لگی تو شہزادی نے اجازت چاہی میں نے ایرین کو آواز دی تو ایرین کے ساتھ دلنواز بھی آئی پھر روبیسا دلنواز کے ساتھ باغ سے چلی گئی اور میں ایرین کے ساتھ گھر آ گیا راستے بھر ایرین مجھے چھیڑتا رہا اور میں مسکراتا رہا شہزادی کی محبت پا کر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں اپنے ذہن سے اپنا زمانہ نکال دونگا اور اسی ماحول اور زمانے کے حساب سے اپنے آپ کو ڈھال کر اپنی بقایا زندگی یہیں بسر کرلونگا۔

☆.....☆.....☆

مجھے یہاں رہتے ہوئے کئی دن گزر گئے تھے میں یہاں کے رسم و رواج اور رہن سہن میں رنگ گیا تھا ایرین میرا بھائی بن گیا تھا اور ایرین کی ماں کو میں ماں ہی کہتا تھا قبیلے میں ہر شخص مجھے ایرین کا بھائی ہی سمجھتا تھا میں نے سردار کا بھی قرب خاص حاصل کر لیا تھا اور اب میں سردار کا مشیر خاص بن چکا تھا دربار میں مجھے خاص حیثیت حاصل ہو گئی تھی دن میں، میں سردار کے ساتھ رہتا تھا اور رات میں باغ میں شہزادی روبیسا جو کہ اب میرے لئے روب تھی اس کی زلفوں کی چھاؤں میں میری راتیں کٹ رہی تھیں۔

ایک دن صبح کے وقت جب میں سردار کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا تو مجھے یک دم شور کی آواز سنائی دی میں جلدی سے باہر نکلنے لگا تو اسی وقت ایرین بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان سراسیمگی حالت میں بولنے لگا ''وہ۔۔وہ۔۔شہزادی کو ۔۔۔ وہ شہزادی کو لے۔۔۔لے گیا''۔

''کون۔۔۔لے گیا۔۔کس کو لے گیا'' میں نے حیران نظروں سے ایرین کو دیکھا اور اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

''وہ۔۔شہزادی روبیسا کو ناگا اغوا کر کے لے جا رہا ہے'' ایرین نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پوری بات بتائی ایرین کی بات سن کر میں پھرتی کے ساتھ باہر کی جانب بھاگا میرے پیچھے ایرین بھی باہر کی جانب لپکا میں گھر سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا باہر لوگوں کا ہجوم جمع ہے اور ہر شخص خوف کے عالم میں آسمان کی جانب دیکھ کر چیخ رہا ہے میں نے بھی لوگوں کی نظروں کے تعاقب میں آسمان کی جانب دیکھا تو۔۔۔میں حیران رہ گیا۔

اوپر فضا میں ایک رتھ اڑ رہی ہے اس رتھ میں چھ گھوڑے جوتے ہوئے ہیں اور وہ گھوڑے فضا میں اس طرح قدم اٹھا رہے ہیں جیسے وہ زمین پر چل رہے ہوں اس رتھ میں ایک بھیانک شکل کا آدمی

بیٹھا رتھ چلا رہا تھا اس نے ایک ہاتھ میں لگام پکڑ رکھی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے روب کو دبوچا ہوا تھا روب اس کے بڑے بڑے بھیانک ہاتھ میں کسی معصوم چڑیا کی طرح مچل رہی تھی روب کی چیخیں نیچے زمین تک آ رہی تھیں وہ مسلسل مدد کے لئے پکار رہی تھی میں نے رتھ کی جانب بغور دیکھا رتھ اڑتے ہوئے شمال کی جانب جا رہی تھی۔

''ایرین جلدی سے گھوڑے نکالو'' میں نے چیخ کر ایرین سے کہا اور بھاگتا ہوا لوگوں کے ہجوم میں جگہ بناتے ہوئے اصطبل کی جانب دوڑا میرے پیچھے ایرین بھی دوڑ رہا تھا اصطبل میں پہنچتے ہی میں نے گھوڑے پر بیٹھنے کے غرض سے لمبی چھلانگ لگائی اور جیسے ہی میں گھوڑے پر بیٹھا اور میں نے لگام تھامی ایرین بھی اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ اصطبل سے باہر کی جانب نکلے ہمارے گھوڑے دھول اڑاتے ہوئے بھاگ رہے تھے لوگوں نے حیرت سے ہمارے گھوڑوں کو دیکھا پھر ہجوم ہمارے لئے پرجوش نعرے لگانے لگا مگر اس وقت میرے پاس یہ موقع نہیں تھا کہ میں لوگوں کی جانب توجہ دیتا مجھے ہر حال میں روب کو بچانا تھا میں اور ایرین قبیلے سے باہر نکلے اور اس جانب اپنے گھوڑے دوڑا دیئے جس جانب ناگا شہزادی کو لے کر گیا تھا۔

میں اور ایرین کافی دیر تک اپنے گھوڑے اس سمت دوڑاتے رہے جس سمت ناگا شہزادی کو اغوا کر کے اپنے اڑن رتھ پر لیکر گیا تھا ہمیں گھوڑے دوڑاتے دوپہر ہو گئی ہم دونوں سویرے ناگا کے تعاقب میں نکلے تھے ہمارے ساتھ ہمارے گھوڑے بھی تھکن کا شکار ہو رہے تھے آخر ایک جگہ پانی دیکھ کر میں نے ایرین کو وہاں رکنے کا اشارہ کیا جنگل کے بیچ ایک چھوٹی سی ندی تھی جس میں صاف و شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ندی کے قریب میں اور ایرین گھوڑوں سے نیچے اترے اور ندی کے پانی پر جھک گئے پانی پی کر اور منہ ہاتھ دھو کر ہماری جان میں جان آئی ہم دونوں نے

دوست اور دوستی

انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک دوستی کی تلاش میں نکلتا ہے، مگر دوستی اس پھول کی مانند ہے، جو ذرا سی گرم لو سے کملا جاتی ہے، کوشش کیجیے گا، کہ آپ کے گرم مزاج کی گرمی آپ کے دوستوں تک نہ پہنچے، دوست کی نیکیوں کو یاد رکھتے ہوئے اس کی کمزوریوں کو نظر انداز کریں، تو دوستی کا یہ پھول سدا مہک کر سب کو معطر کر سکتا ہے۔

(عثمان غنی۔پشاور)

اپنے اپنے گھوڑوں کو بھی پانی پینے کے لئے ندی کے کنارے آزاد چھوڑ دیا گھوڑے بھی بہت پیاسے ہو گئے تھے وہ غٹا غٹ پانی پینے لگے۔

''ایرین تمہیں ناگا کے محل کے بارے میں کچھ معلوم ہے'' میں نے اپنے منہ سے پانی صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''صرف اتنا معلوم ہے کہ شمال کی سمت کسی پہاڑی پر اس کا محل ہے'' ایرین بھی اپنا منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''چل تو ہم لوگ شمال ہی کی سمت رہے ہیں۔۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ راستہ بھٹک جائیں اور ناگا کے محل کے بجائے کہیں اور ہی جا نکلیں'' میں نے خدشے کا اظہار کیا تو ایرین سوچ میں پڑ گیا میں بھی سوچنے لگا۔

''ارے یہ تو یاد ہی نہیں رہا ہم لوگ جٹائی سے مدد لے سکتے ہیں'' کچھ دیر بعد ایرین نے سر اٹھا کر کہا تو میں اس کے جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''جٹائی ۔۔یہ کون ہے''؟ میں نے پوچھا کیونکہ آج تک ایرین نے اس نام کے کسی آدمی کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

''یہ آدمی نہیں ہے بندر ہے'' ایرین بولا۔

''بندر'' میرے لہجے میں حیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''ہاں بندر۔۔۔اور میرا بہت اچھا دوست ہے'' ایرن بولا۔

''بندر اور تمہارا دوست'' میری حیرت ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

''ایک مرتبہ میں نے ایک بندر کی جان بچائی تھی اس دن سے وہ بندر میرا دوست بن گیا وہ اسی جنگل میں رہتا ہے جٹائی نام میں نے ہی اس کو دیا ہے'' ایرن نے مجھے تفصیل بتائی۔

''وہ ہمیں کس طرح نانگا کے محل کا پتا بتا سکتا ہے'' میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

''معلوم کرنے میں کیا حرج ہے'' ایرن بولا۔

''ٹھیک ہے تو بلاؤ اپنے دوست جٹائی کو'' میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا تو ایرن نے اپنا منہ اوپر کیا اور ایک عجیب سی آواز نکالی اس کی آواز سے جنگل گونج اٹھا پھر ایرن نے اپنا منہ دوسری جانب کیا اور پھر اسی طرح آواز نکالی۔ تھوڑی ہی دیر میں جنگل کے درختوں سے پتے گرنے لگے اور ان کی بلند شاخیں ہلنے لگیں میں نے اوپر درخت کی جانب دیکھا تو ایک بڑے سائز کا بندر مجھے درخت سے اترتا نظر آیا وہ بندر زمین پر آتے ہی ایرن سے چمٹ گیا اور پھر ایرن اور بندر جٹائی اس طرح گلے ملنے لگے جیسے انسان بہت دن بعد ملنے پر گلے ملتے ہیں۔ میں دلچسپی کے ساتھ ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''جٹائی یہ میرا دوست نما بھائی کاشان ہے'' جب ایرن اور جٹائی ایک دوسرے سے گلے مل چکے تو ایرن جٹائی کا ہاتھ پکڑ کر میرے قریب آیا اور میرا تعارف جٹائی سے کرایا۔ جٹائی نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا میں اس طرح ایک بندر کے گلے لگتے ہوئے ہچکچا رہا تھا مگر جٹائی کی گرمجوشی سے مجبور ہو کر میں جٹائی کے گلے لگ گیا۔

''جٹائی تمہیں نانگا کے محل کا پتا معلوم ہے؟'' تعارف کی رسم کے بعد ایرن نے جٹائی سے سوال کیا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''کہاں ہے نانگا کا محل'' جٹائی کا اقرار میں ہلتا سر دیکھ کر میں نے بے چینی سے پوچھا تو جٹائی مجھے حیرت سے دیکھنے لگا شاید اسے میری بے چینی پر حیرت ہو رہی تھی۔

''جٹائی نانگا نے شہزادی روبیسا کو اغوا کر لیا ہے ہم شہزادی کو نانگا کی قید سے چھڑانے کے لئے نانگا کے محل جا رہے ہیں'' ایرن نے جٹائی کی حیرت دور کی تو جٹائی سمجھنے کے انداز میں سر ہلانے لگا پھر غوں غوں کر کے ایرن کو کچھ بتانے لگا ایرن اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا جبکہ مجھے جٹائی کی کوئی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''جٹائی بتا رہا ہے کہ نانگا کا محل سمندر کے اندر بنے ایک جزیرے پر ہے'' ایرن نے بتایا۔

''سمندر کس جانب ہے'' میں نے ایرن سے پوچھا تو ایرن نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ شمال میں چند کوس دور سمندر ہے۔

''تو پھر ہمیں اس جانب سفر کرنا چاہیے تاکہ رات ہونے سے پہلے ہم سمندر پر پہنچ سکیں'' میں نے ایرن سے کہا تو ایرن نے جٹائی سے کوئی بات کی جٹائی اسے کچھ سمجھانے لگا کچھ دیر ایرن کا سر انکار میں ہلتا رہا پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔

''کاشان۔۔۔جٹائی بھی ہمارے ساتھ چلنے کی ضد کر رہا ہے'' ایرن جٹائی سے بات کر کے میرے جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ کیوں جانا چاہتا ہے ہمارے ساتھ خوامخواہ اس کی جان کو خطرہ ہوگا'' میں نے ایرن سے کہا تو ایرن جٹائی کی جانب گھوما۔

''یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہمارے بہت کام آسکتا ہے'' جٹائی سے بات کر کے ایرن نے مجھ سے کہا۔

''ٹھیک ہے اسے ساتھ لے چلتے ہیں مگر یہ گھوڑے پر بیٹھ سکتا ہے''؟ میں نے رضامندی کے بعد سوال کیا۔

''اسے گھوڑے پر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے'' ایرن نے حیرت کا اظہار کیا۔

''پھر یہ ہمارے ساتھ کیسے چلے گا'' میں نے معصومیت سے پوچھا میرا سوال سن کر ایرن اور جٹائی ہنسنے لگے۔

''ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہونگے اور یہ درخت کی شاخوں پر جھولتا ہوا ہمارے ساتھ چلے گا'' ہنسنے کے بعد ایرن نے جواب دیا تو میں اپنی ہی بے وقوفی پر ہنس پڑا۔

''چلو پھر جلدی سے نکلتے ہیں تاکہ سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر کنارے پہنچ سکے'' میں اپنے گھوڑے کی جانب چلتا ہوا بولا تو ایرن بھی اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔ جیسے میں اور ایرن گھوڑوں پر بیٹھ کر چلے جٹائی نے ایک درخت کے تنے پر چھلانگ لگائی اور درخت کی شاخوں کو پکڑ کر ان پر جھولا جھولتے ہوئے ہمارے سے آگے نکل گیا میں اور ایرن جٹائی کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے دوڑانے لگے۔

شام ہونے سے قبل ہم تینوں سمندر کنارے پہنچ گئے سمندر کنارے پہنچ کر ڈوبتے سورج کی کرنوں میں میں نے دیکھا کہ سمندر کے اندر چند کوس کے فاصلے پر ایک جزیرے کے آثار نظر آرہے ہیں اور اس جزیرے پر ایک عالیشان محل بنا ہوا ہے جس کے پرشکوہ مینار دور سے نظر آرہے تھے۔

''وہ رہا نانگا کا محل'' سمندر کنارے پہنچنے کے بعد ایرن نانگا کے محل کی جانب دیکھتے ہوئے بول اٹھا۔

''ہوں'' میں نے ہنکارہ بھرا۔

''ہم سمندر کیسے پار کریں گے۔۔۔پانی میں تو گھوڑے دوڑ نہیں سکتے اور ہمارے گھوڑے کوئی نانگا کے گھوڑے تو ہیں نہیں کہ ہوا میں اڑ سکیں'' ایرن نے پریشانی کے ساتھ جواب دیا۔

''ہمیں کشتی بنانی پڑے گی'' میں نے کہا۔

''کشتی اس میں تو کافی دن لگ جائیں گے'' ایرن نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

''ہمیں رات کے رات نہ صرف کشتی بنانی ہے بلکہ سمندر پار کر کے نانگا کے محل بھی پہنچنا ہے'' میں نے کہا۔

''یہ ناممکن ہے'' ایرن سر ہلانے لگا۔

''انسان اگر چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا'' میں نے کہا۔

''یہ ہم کس طرح کر سکتے ہیں'' ایرن نے مجھ سے پوچھا۔

''جنگل میں موجود کسی موٹے سے درخت کے تنے کو کاٹ کر اسے کھوکھلا کر لیں گے پھر اس تنے کے سہارے سمندر پار کریں گے'' میں نے جواب دیا تو ایرن میری بات سن کر سر ہلانے لگا۔

''یہ خطرناک کام ہوگا'' ایرن میری تجویز سن کر بولا۔

''خطرہ اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے'' میں نے جواب دیا۔

''پھر ہمیں کام شروع کر دینا چاہیے'' ایرن جنگل کی جانب بڑھتا ہوا بولا تو میں اور جٹائی بھی جنگل کی جانب بڑھ گئے۔

جنگل میں ہمیں جلد ہی ایک ایسا بڑا درخت مل گیا جس کا موٹا سا تنا اس سے جدا ہو رہا تھا یہ ہمارے لئے خدائی مدد تھی لہذا خنجر کی مدد سے اس تنے کو درخت سے جدا کر کے اسے کھوکھلا کرنے لگے چونکہ ہمارے پاس ایسے کوئی اوزار نہیں تھے جس سے تنے کو آسانی کے ساتھ کھوکھلا کیا جا سکتا تنے کو کھوکھلا کرنے کے لئے ہم لوگ خنجر کی مدد لے رہے تھے لہذا ہمیں وقت بھی زیادہ لگ رہا تھا اور محنت بھی زیادہ ہو رہی تھی آدھی رات کو ہم تنے کو کافی حد کر اوپر سے کھوکھلا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور کام سے فارغ ہوئے تو ہمیں بھوک ستانے لگی ایسے وقت میں جٹائی ہمارے کام آیا وہ نہ جانے کہاں سے تین چار ناریل لے آیا ناریل کے ذریعے نہ صرف ہماری بھوک ختم ہوئی بلکہ ہماری

پیاس بھی بجھ گئی۔ ناریل کھانے کے بعد ہماری آنکھیں بند ہونے لگیں مگر جنگل میں اس طرح بے سدھ سونا ٹھیک نہیں تھا لہذا میں، ایرن اور جٹائی باری باری جاگ کر پہرا دیتے رہے اور باقی دو آرام سے سوتے رہے اس طرح رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی اور سورج کی کرنوں سے ہر شئے روشن ہوگئی۔

صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی میں نے اٹھ کر دیکھا میرے قریب ہی ایرن سو رہا تھا جبکہ جٹائی کہیں نظر نہیں آرہا تھا میں نے چاروں اطراف نظریں گھما کر دیکھا مگر جٹائی کہیں نظر نہیں آیا پھر میں نے جٹائی کو ڈھونڈنا چھوڑ کر ایرن کی جانب متوجہ ہوا اور ایرن کو ہلا کر اٹھایا میرے ہلانے پر ایرن آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ایرن جٹائی کہیں نظر نہیں آرہا'' میں نے ایرن کو جٹائی کے بارے میں آگاہ کیا۔

''وہ ہمارے لئے کھانے کے لئے کچھ لانے گیا ہوگا'' ایرن جمائی لیتے ہوئے کہنے لگا پھر اس نے اٹھ کر سمندر کے پانی سے منہ دھویا اور میرے قریب آیا اسی وقت جٹائی آتا ہوا نظر آیا ایرن نے سچ کہا تھا وہ ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کرنے گیا تھا جب جٹائی قریب آیا تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں کچھ جنگلی پھل تھے اس نے وہ پھل ہمارے سامنے رکھ دیئے۔

''شکریہ جٹائی'' میں نے جٹائی کا شکریہ ادا کیا اور پھل اٹھا کر کھانے لگا ایرن نے بھی ایک پھل اٹھا لیا نہ جانے کونسا پھل تھا مگر تھا بہت لذیذ لہذا ایک کے بعد میں دوسرا پھل بھی کھا گیا۔ کیونکہ مجھے یہ خیال تھا کہ نانگا سے مقابلہ کرنے کے لئے مجھے طاقت کی ضرورت پڑے گی اور طاقت بحال رکھنے کے لئے بہرحال کھانا بہت ضروری ہے۔ یہ سوچ کر میں دوسرا پھل بھی کھا گیا۔

پھل کھانے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میری کھوئی ہوئی توانائی بحال ہوگئی ہو۔ ایرن بھی پھل کھانے کے بعد میرے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر ہم دونوں نے درخت کے تنے کو جسے رات بھر محنت کر کے ہم نے کشتی جیسا روپ دیا تھا اسے گھسیٹ کر سمندر میں ڈال دیا اور پھر دو بڑی بڑی لکڑیاں جسے ہم چپو کے طور پر استعمال کر سکیں وہ لکڑیاں لے کر درخت میں بنائے کھوکھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ میں سب سے آگے تھا، میرے پیچھے ایرن اور سب سے پیچھے جٹائی بیٹھا تھا۔ ہم تینوں اس تنے پر بیٹھے نانگا کے محل کی جانب جانے لگے۔ شکر ہے سمندر پرسکون تھا ورنہ ہمارا سفر نہایت دشوار ہو جاتا پھر بھی درخت کے تنے کا بیلنس سنبھالنے میں ہمیں بہت دقت کا سامنا تھا بہرحال دو تین گھنٹوں کی محنت کے بعد ہم اس جزیرے کے ایک سنسان ساحل پر اترنے میں کامیاب ہوگئے جس جزیرے پر نانگا کا عالیشان محل بنا ہوا تھا اور اس محل میں نانگا نے شہزادی روبیسا کو قیدی بنا رکھا تھا۔

ساحل پر اترے تو سورج پوری طرح ابھر چکا تھا ہر سو روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں، ایرن اور جٹائی چھپتے چھپاتے نانگا کے محل کی جانب بڑھے محل کی پرشکوہ عمارت سورج کی روشنی میں سر اٹھائے شان سے کھڑی تھی محل کے قریب پہنچ کے ہم نے محل کو چاروں طرف سے دیکھا محل کے باہر یا محل کے اوپر کوئی پہرے دار نظر نہیں آرہا تھا یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی شاید نانگا زیادہ ہی اوور کانفیڈنس تھا اس لئے اس نے محل کی حفاظت کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا ہوا تھا۔ محل کو چاروں اطراف سے دیکھنے کے بعد ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ ایک بلند درخت کی شاخیں محل کی بالکونی تک جا رہی ہیں ہم لوگوں نے وہیں سے محل میں گھسنے کا فیصلہ کیا۔

سب سے پہلے جٹائی درخت پر چڑھا اور محل کی بالکونی میں کود گیا پھر اس کا اشارہ پاتے ہی میں اور میرے بعد ایرن بھی محل میں اتر گیا۔ محل کے اندر پہنچ کر میں نے محل کا جائزہ لیا محل میں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا شاید محل کے مکین ابھی تک سو کر نہیں اٹھے تھے۔ میں اور

ایرن آہستہ آہستہ محل کی بالکونی میں آگے کی جانب بڑھے ہمارے پیچھے جٹائی بھی محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا ہم تینوں بالکونی میں آگے بڑھنے کے ساتھ محل کے اندر جانے کے لئے دروازوں کو دھکیل کر دیکھ رہے تھے کہ کوئی دروازہ کھلا ملے تو ہم اس دروازے سے محل کے اندرونی حصے میں جا سکے۔ ابھی ہم بالکونی میں آگے بڑھ رہے تھے۔

اچانک شور کی آوازیں سنائی دی اور بالکونی میں چار پانچ آدمی ننگی تلواریں لئے ہماری جانب دوڑتے ہوئے آتے نظر آئے یہ دیکھ کر میں نے اور ایرن نے بھی نیام سے اپنی تلواریں سونت لی اور پھر ہم مقابلے کے لئے تیار ہوگئے وہ پانچ آدمی جو ہماری جانب دوڑتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ انہوں نے ہمارے قریب آتے ہی ہم پر حملہ کر دیا میں نے اور ایرن نے ان کا حملہ اپنی تلواروں پر روکا اور پھر ہمارے درمیان گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔

میرے ہاتھ بجلی کی طرح چل رہے تھے بیک وقت میں تین تین تلوار بازو سے مقابلہ کر رہا تھا اس کے باوجود میرا پلہ بھاری تھا بالآخر مجھے موقع ملا تو میں نے ایک شخص پر اپنی تلوار کا بھرپور وار کیا اس شخص نے میرا وار اپنی تلوار پر روکنا چاہا مگر اسے دیر ہوگئی اور میری تلوار نے اس شخص کا ہاتھ کندھے کے پاس سے کاٹ کر الگ کر دیا وہ شخص چیختا ہوا بالکونی کے فرش پر گر پڑا اپنے ساتھی کو اس طرح زخمی ہوتا دیکھ کر باقی چاروں افراد گھبرا گئے یہ موقع میرے اور ایرن کے لئے کافی تھا ہم دونوں کی تلواریں بجلی کی طرح تڑپیں اور دو اور لوگ اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے بالکونی کے فرش پر گر کر تڑپنے لگے یہ دیکھ کر دیگر دونوں افراد اپنی تلواریں پھینک کر بھاگ نکلے میں اور ایرن ان کے تعاقب میں دوڑے ہمارے پیچھے جٹائی بھی بھاگا وہ دونوں بھاگتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوگئے میں ایرن اور جٹائی بھی بھاگتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوگئے شاید یہی ہماری غلطی تھی۔

وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جیسے ہی ہم تینوں دروازے سے کمرے میں داخل ہوئے ہمارے اوپر ایک بڑا سا جال آگرا ہم اس جال میں پھنس گئے ساتھ ہی جال اوپر کھینچ لیا گیا اور ہمارے پیر فرش سے اوپر ہوگئے اور ہم تینوں فضا میں لٹکنے لگے میں نے جلدی سے اپنی تلوار سے جال کی رسی کو کاٹنا چاہا۔۔۔

مگر نہ جانے جال نہ کس رسی کا بنا ہوا تھا میری تلوار سے جال کو کوئی نقصان نہیں پہنچا جب میں نے دیکھا کہ میں جال نہیں کاٹ پا رہا ہوں تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا کمرہ مکمل طور پر خالی تھا میں جال سے نجات پانے کی ترکیبیں سوچنے لگا اسی وقت کمرے کا بند دروازہ کھلا اور بہت سارے لوگ کمرے میں داخل ہوئے ان سب کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور سب ہم تینوں کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے ان سب نے ہمارے گرد پہرہ سا ڈال دیا اور تلوار اونچی کئے کینہ توز نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے اسی وقت دروازہ پھر کھلا اور ایک شخص کمرے میں داخل ہوا اس شخص کو دیکھ کر تمام تلوار سونتے لوگ الرٹ ہوگئے۔

''آخرکار تم لوگ ہمارے بچھائے ہوئے جال میں پھنس ہی گئے'' وہ شخص ہمارے قریب آتے ہوئے بولا تو میں اس شخص کو دیکھنے لگا میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

''اپنی تلواریں جال میں سے باہر پھینک دو، ورنہ نانگا کے سپاہی تمہیں جال سمیت خون میں نہلا دیں گے'' اس شخص نے دوبارہ کہا تو میں نے ایرن کی جانب دیکھا وہ بھی تلوار پھینکنے کے معاملے میں الجھن کا شکار تھا میں نے اپنے چاروں طرف کھڑے آدمیوں کو دیکھا پھر اپنی تلوار جال سے باہر کی جانب گرا دی میرا دیکھا دیکھی ایرن نے بھی اپنی تلوار پھینک دی۔

''بہت اچھے عقلمند ہو۔۔'' وہ شخص تلوار پھینکنے پر بول اٹھا ''تم لوگ کیا سمجھے تھے کہ نانگا کے محل میں اس طرح آرام سے گھس جاؤ گے اور کسی کو پتا نہیں چلے گا''

''یہ سب تمہارے لئے ہی کیا گیا تھا تاکہ تم

ہمارے جھانسے میں آجاؤ اور ہم تم پر قابو پا سکیں'' وہ شخص کچھ دیر ہنسنے کے بعد بولا پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا تو اس نے ہماری تلواریں اٹھالیں جب ہماری تلواریں اس شخص کے قبضے میں آگئیں تو جال دھیرے دھیرے نیچے آیا اور ہم لوگوں کے پیر فرش کو چھونے لگے فرش پر اترتے ہم تینوں اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے اور اپنے اوپر سے جال اتار پھینکا۔جال اتارنے کے بعد میں نے اس شخص کی جانب دیکھا جواب تک ہم لوگوں سے مخاطب تھا۔

''شہزادی روبیسا کہاں ہے'' میں نے اپنی آواز کو کرخت کردار بناتے ہوئے پوچھا۔

''آج شام شہزادی نانگا کی ملکہ بن جائے گی'' وہ شخص بولا۔

''ناممکن شہزادی کی مرضی کے بغیر یہ نہیں ہوسکتا'' میں چیخا۔

''یہاں صرف نانگا کی مرضی چلتی ہے اور کسی کی نہیں'' وہ شخص تمسخر میں چیخا۔

''مجھے نانگا کے پاس لے چلو'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''ضرور نانگا تم سے ضرور ملیں گے مگر ابھی نہیں۔۔۔شام میں'' اس شخص نے مجھ سے کہا پھر اپنے آدمیوں کی جانب مڑا اور ان سے کہنے لگا۔

''ان تینوں کے ہاتھ رسی سے باندھ کے اندھیرے کمرے میں بند کردو۔۔شام کو نانگا کے سامنے پیش کرینگے''۔

یہ سن کے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے ہم تینوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور پھر تلواروں کے زور پر ہمیں ایک کمرے میں لاکر بند کر دیا گیا کمرے میں مکمل طور پر اندھیرا تھا۔

''ہم تو نانگا کے قیدی بن گئے ہیں'' نانگا کے آدمیوں کے جانے کے بعد ایرین بولا۔

''ہاں''۔

''اگر ہم تلواریں نہیں پھینکتے تو اچھا ہوتا'' ایرین تلوار پھینکنے کے عمل کی وجہ سے آزردہ تھا۔

''اگر ہم تلواریں نہیں پھینکتے تو وہ لوگ ہمیں وہیں پر مار دیتے۔۔اب کم از کم ہم زندہ ہیں اور زندہ رہے تو نانگا کا مقابلہ کرسکتے ہیں'' میں نے جواب دیا تو ایرین میری بات سن کر سر ہلانے لگا۔

قید خانے میں ہمیں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا نہ جانے ہم تینوں کتنی دیر تک قید خانے میں بند رہے آخر کار قید خانے کا اکلوتا دروازہ کھلا اور کئی پہرے دار ہاتھوں میں نیزے سنبھالے اندر داخل ہوئے اور ہمیں نیزوں کی انی کے ذریعے قید خانے سے باہر نکلنے کا کہا قید خانے سے باہر نکل کر ہم نے دیکھا ایک لمبی راہداری ہے ہمیں اس راہداری میں چلنے کا حکم ہوا تو ہم تینوں فرش پر اپنے قدم آگے بڑھانے لگے۔

''ہمیں کہاں لے جارہے ہو''؟ بالآخر میں نے خاموشی توڑی۔

''نانگا کے حضور'' ایک پہرے دار نے جواب دیا اتنے میں ہم لوگ راہداری کے اختتام پر پہنچ گئے جہاں ایک بہت بڑا دروازہ لگا ہوا تھا دروازے کے پار سے لوگوں کے مسلسل شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ہمیں لانے والے پہرے داروں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازے کے پاس کھڑے شخص سے کچھ کہا تو اس شخص نے دروازے میں بنھی رسی کھینچی تو دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا پہرے داروں نے دروازہ کھلتے ہی پیچھے سے ہمیں دھکا دیا تو ہم تینوں لڑکھڑاتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے ہمارے باہر نکلتے ہی باہر بیٹھا مجمع زور زور سے شور مچانے لگا۔

باہر نکل کر میں نے دیکھا ایک بہت بڑا سا میدان ہے جس کے چاروں اطراف سیڑھیاں بنی ہوئی ہے اور ان سیڑھیوں پر ہزاروں لوگ بیٹھے ہیں ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ارینا ہو جہاں مقابلے ہوتے ہو میں نے چاروں طرف نظر گھمائی تو دیکھا کہ ایک جانب نہایت عمدہ عمارت بنی ہوئی ہے اور اس عمارت کے بالکونی میں کوئی شخص بیٹھا ہے میں نے اس شخص کو بغور

دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ وہ شخص انسان تو محسوس ہی نہیں ہورہا تھا بیٹھے ہونے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ اس شخص کا قد کافی لمبا تھا اور اس کا سیاہ چہرہ کسی بدروح کا چہرہ معلوم ہورہا تھا اوپر سے اس شخص کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں جسے بل دے کر اوپر کی جانب کیا گیا تھا پھر میں نے اس شخص کے برابر میں دیکھا تو۔۔تو اچھل پڑا کیونکہ اس شخص کے برابر میں شہزادی روبیسا بیٹھی تھی اور اس شخص نے شہزادی کا نازک ہاتھ اپنے بھدے اور بڑے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا شہزادی اس شخص سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی مگر اس شخص کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

''کاشی۔۔۔کاشی'' شہزادی روبیسا زور سے چیخی تو میرے ساتھ ایرین نے بھی اس جانب دیکھا۔

''شہزادی کے ساتھ کون بیٹھا ہے جس نے شہزادی کا ہاتھ اپنے گرفت میں لیا ہوا ہے''؟ میں نے ایرین سے پوچھا۔

''یہی تو نانگا ہے'' ایرین نے جواب دیا۔

''اوہ تو یہ نانگا ہے۔۔یہ تو کوئی بھوت لگ رہا ہے''۔

''ہاں۔۔یہ انسان تو معلوم ہی نہیں پڑتا'' ایرین نے میری تائید کی۔

''قیدیوں کے ہاتھ کھول دیئے جائے'' نانگا نے زور سے اپنے آدمیوں سے کہا تو ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ہمارے ہاتھوں میں بندھی رسی خنجر سے کاٹ دی۔

میں اپنے ہاتھ کو مسلتا ہوا نانگا کی جانب دیکھنے لگا۔

''تو تم وہ سورما ہو جو شہزادی کو چھڑانے آئے ہو'' نانگا براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

''نانگا'' میں دھاڑا ''نہ صرف میں شہزادی کو تم سے چھڑاؤں گا بلکہ تمہارا خاتمہ بھی میرے ہاتھو ں ہی ہوگا''

''ہاہاہاہا'' نانگا میری بات سن کر قہقہے لگانے لگا۔

''بہادر معلوم ہوتے ہو'' نانگا ہنسنے کے بعد بولا۔

''نانگا۔۔۔میری بہادری دیکھنی ہے تو تلوار لیکر میدان میں آجاؤ'' میں دھاڑا۔

''ضرور۔۔تمہاری بہادری ضرور دیکھیں گے'' نانگا نے کہا پھر وہ میدان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی جانب متوجہ ہوا۔

''میرے ساتھیوں۔۔تم لوگ بہت دن سے ایک پر لطف مقابلے سے محروم رہے ہو۔۔مگر اب نہیں۔۔آج تمہیں مکمل لطف آئے گا''۔

نانگا نے میدان میں بیٹھے لوگوں سے کہا تو تمام پورا میدان تالیوں اور سیٹیوں سے گونجنے لگا۔

''سورما۔۔اگر میرے آدمیوں کو تم نے شکست دے دی تو میں وعدہ کرتا ہوں شہزادی کو تمہارے ساتھ جانے دونگا'' نانگا مجھ سے مخاطب ہوا اور ساتھ ہی اس نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر ہوا میں بلند کیا۔

''نانگا'' میں غصے سے دھاڑا ''شہزادی کا ہاتھ چھوڑ دو''۔

''اوہ غصہ آگیا'' نانگا طنزیہ لہجے میں بولا پھر اپنے غلاموں کو اشارہ کیا تو میدان میں کھڑے اس کے غلاموں نے مجھے اور ایرین کو ایک ایک تلوار دی اور ساتھ ہی ڈھال بھی دی۔

''سورما۔۔میرے جانباز غلام آرہے ہیں اگر تم نے ان پر فتح پالی تو۔۔۔۔تم شہزادی کو لے جاسکتے ہو'' اتنا کہہ کر نانگا نے میدان کے ایک جانب بنے بڑے سے گیٹ پر کھڑے پہرے دار کو اشارہ کیا تو اس نے گیٹ کھول دیا گیٹ کھلتے ہی ایک رتھ گیٹ سے نکل کر میدان میں داخل ہوئی اس رتھ کو دو گھوڑے کھینچ رہے تھے اور اس رتھ پر بھی دو ہی آدمی سوار تھے ایک آدمی رتھ چلا رہا تھا جبکہ دوسرا آدمی تلوار ہاتھ میں لئے کھڑا ہمیں کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا اس رتھ کے باہر نکلتے ہی ایک اور رتھ بھی گیٹ سے نکل کر باہر آئی

اس پر بھی دو آدمی سوار تھے ایک رَت چلا رہا تھا جبکہ دوسرے آدمی کے ہاتھ میں تیر کمان تھا اور کمان پر چڑھے ہوئے تیر کا رخ ہماری جانب تھا اسی طرح چار رتیں گیٹ سے باہر نکلیں اور ان چاروں رتوں پر سوار نانگا کے جانباز ہمارے گرد گول گول چکر لگانے لگے۔ یہ دیکھ کر میں نے جٹائی کے کان میں ایک بات کہی جسے جٹائی سمجھ گیا اور وہ خوشیاتے ہوئے اچھلا اور ایک جانب دوڑا اس کے دوڑتے ہی رَت پر موجود تیر کمان والے نے تیر کا رخ جٹائی کی جانب کیا اور تیر چھوڑ دیا تیر تیزی کے ساتھ جٹائی کی جانب بڑھا مگر جٹائی ایک بندر تھا اس نے اپنی دم اارینا کے ستون پر اٹکائی اور ایک لمبی چھلانگ مارک کر ارینا کے اوپر چڑھ گیا۔

جٹائی کے محفوظ نکلتے ہی میں تلوار لیکر کر ایک رت کی جانب بڑھا اور بڑھ کر اس پر وار کرنے لگا اور ساتھ ہی دوسری رتوں پر سوار جانبازوں کے وار سے بچنے لگا ہمارے درمیان گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔

جیسے جیسے جنگ کا پارہ بڑھتا جاتا لوگوں میں جوش بھی بڑھتا جارہا تھا میں نے ایک رت کے گھوڑے پر تلوار سے وار کیا تو اس گھوڑے کی اگلی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑا گھوڑے کے گرتے ہی رت بھی میدان میں گر پڑی اور اس پر سوار جانباز میدان کی زمین پر مٹی میں لوٹ پوٹ ہوگئے اس گری ہوئی رت سے دوسری رت بھی ٹکرا کر الٹ گئی اس کے سوار بھی زمین بوس ہوگئے زمین پر گرتے ہی وہ سوار اٹھے اور تلوار اٹھا کر ہماری جانب لپکے اور مجھ پر اور ایرین پر حملہ کردیا ہم دونوں ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملائے ان جانبازوں سے مقابلہ کررہے تھے ایک ایک کر کے ہم دونوں نے تین رتوں کے جانبازوں کو مار گرایا اب میدان میں صرف ایک رت باقی بچی تھی جس پر سوار جانباز تیر کمان سنبھالے ہمارا نشانہ لے رہا تھا اور اس جانباز کے تیر یا تو ہم دونوں اپنی ڈھال پر روک رہے تھا یہ اس کا نشانہ خالی کرنے کے لئے میدان میں بھاگ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے مجھے ایک موقع ملا میں نے اپنی تلوار نیزے کی طرح پکڑی اور اسے کسی ماہر نیزے باز کی طرح اس جانباز کی جانب پھینکا میرا نشانہ ٹھیک لگا اور تلوار اس جانباز کے سینے میں گھس گئی اور وہ چیختا ہوا رت سے گر پڑا جانباز کے گرتے ہی ایرین بھاگتا ہوا رت پر چڑھ گیا اور اسے رت چلانے والے جانباز کی گردن پکڑ کر اس کی گردن پر اپنی تلوار پھیر دی اور شخص بھی اپنے خون میں لت پت میدان میں گر پڑا ایرین نے فوراً ہی گھوڑوں کی لگام پکڑی اور رت کو روک دیا میں نے میدان میں پڑے نانگا کے جانبازوں کی جانب دیکھا وہ سب اپنی زندگی ہار چکے تھے اور مردہ حالت میں میدان میں پڑے تھے میں ان لوگوں کی لاشوں کے درمیان کھڑا نانگا کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''نانگا تمہارے سارے جانباز سپاہی چوہے ثابت ہوئے اب تمہیں ہی تلوار لیکر مقابلہ کرنا پڑے گا'' میں اپنی خون آلود تلوار لہراتا ہوا چلایا نانگا نے حیرت سے میدان میں مرے ہوئے اپنے جانبازوں کو دیکھا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے سارے جانباز مارے گئے۔

''سپاہیوں۔۔۔ان لوگوں کو حراست میں لے لو'' نانگا زور سے چیخا تو میدان میں یک دم چالیس پچاس سپاہی ہاتھوں میں تلوار پکڑے ارینا میں داخل ہوئے اور ہمارے گرد گھیرا بنا لیا میں اور ایرین ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملائے سپاہیوں کی جانب منہ کئے کھڑے ان سپاہیوں کو گھور رہے تھے۔

''اتنے زیادہ سپاہیوں کا مقابلہ کیسے کرینگے'' ایرین مجھ سے بولا۔

''مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں۔۔۔اپنی اور شہزادی کی زندگی کے لئے ہمیں ان سب کو ختم کرنا ہی ہوگا'' میں نے ایرین سے کہا تو وہ میری بات سمجھ گیا اور سپاہیوں کو گھورنے لگا۔ اس سے پہلے کہ سپاہی ہم پر حملہ کرتے ارینا کا بڑا سا دروازہ دھڑام کی آواز کے ساتھ

زمین بوس ہوگیا اور قبیلے کے سینکڑوں افراد ہاتھوں میں ہتھیار اٹھائے ارینا میں داخل ہوئے اور سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔

نانگا کے دیگر سپاہی جو ارینا کی حفاظت کررہے تھے وہ بھی میدان میں آگئے اور پھر وہاں گھمسان کا رن پڑا ہر جانب تلواروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی ہر جانب تلواریں چمک رہی تھیں انسانی خون سے زمین سیراب ہورہی تھی ہر جانب زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخ وپکار تھی۔

''سردار آپ لوگ کیسے یہاں تک آئے'' میں نے لڑتے لڑتے قبیلے کے سردار سے پوچھا۔

''بیٹا جب ہمیں پتا چلا کہ تم نانگا کے محل میں گھس گئے ہو تو میں نے قبیلے والوں کو غیرت دلائی کہ کاشان اور ایرین اکیلے نانگا کی پوری فوج سے مقابلہ کرنے چلے گئے اور ہم لوگ بزدلوں کی طرح نانگا سے ڈر کر بیٹھے ہیں۔۔۔بس پھر کیا بات سن کر سارے قبیلے کے مرد ہتھیار اٹھا کر نانگا کے مقابلے کے لئے چلے آئے'' سردار نے لڑتے لڑتے جواب دیا تو میں نے خوشی میں ایک زوردار نعرہ لگایا سارے قبیلے کے لوگوں نے نعرے کے جواب میں نعرہ لگایا اور پھر تیزی کے ساتھ نانگا کے سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگے میں نے تلوار چلاتے ہوئے نانگا کی جانب دیکھا وہ شہزادی کا ہاتھ پکڑے محل کی جانب جارہا تھا میں نے جلدی سے اپنے حریف کی گردن اڑائی اور نانگا کے پیچھے بھاگا۔

''ایرین میں نانگا کے پیچھے جارہا ہوں'' میں بھاگتے ہوئے ایرین کو پکارا اور نانگا کے پیچھے بھاگا اور تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس جگہ پہنچا جہاں نانگا بیٹھا ہوا تھا وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا نانگا شہزادی کا ہاتھ پکڑے شہزادی کو کھینچتے ہوئے ایک جانب بھاگا جارہا ہے شہزادی مسلسل چیخ رہی ہے میں نانگا کے پیچھے بھاگا نانگا آگے ہی آگے جارہا تھا ارینا سے کافی دور جاکر نانگا رک گیا اور اس نے شہزادی کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی کمر کے گرد لگی ہوئی تلوار نکال لی۔

''ہاہاہا۔۔۔یہ جگہ دیکھ رہے ہو سورما۔۔۔یہاں کوئی مجھے شکست نہیں دے سکتا'' نانگا زور سے دھاڑا۔

''مگر۔۔آج شکست تمہارے مقدر میں لکھی جاچکی ہے'' میں تلوار سونت کر نانگا سے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوگیا۔ مجھے اپنے مقابل کھڑا دیکھ کر نانگا نے شہزادی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی تلوار تھام لی جیسے ہی شہزادی کا ہاتھ نانگا نے چھوڑا شہزادی بھاگتی ہوئی میرے قریب آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''روب حوصلہ رکھو۔۔آج یہ شیطان میرے ہاتھوں ضرور مارا جائے گا'' میں نے شہزادی روبیسا کو تسلی دی اور آہستہ سے اسے خود سے الگ کر کے میدان کے ایک کونے میں جانے کا کہا شہزادی کو تسلی دینے اور اس سے بات کرنے کے دوران بھی میری نظریں مسلسل نانگا پر گڑی ہوئی تھیں۔

شہزادی کے ایک طرف ہونے کے بعد میں بھی تلوار کو لہراتے ہوئے نانگا کے مقابل کھڑا ہوگیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے نانگا کے لمبے قد کا مضبوط جسامت والا شخص ہے اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور اس کا قد کافی لمبا تھا میں اس کے سامنے بونا سا لگ رہا تھا۔

حملے میں پہل نانگا نے کی اس نے زوردار انداز میں اپنی تلوار گھما کر میرے سر کا نشانہ لیا میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی تلوار پر نانگا کا وار روکا نانگا کا حملہ اتنا زوردار تھا کہ ایک لمحے کو میرے پیر فرش سے اکھڑ گئے اور میں کئی قدم پیچھے کی جانب ہٹ گیا مگر میں نے فوراً خود کو سنبھالا نانگا نے اپنا دوسرا وار کیا نانگا کا دوسرا وار بھی میں نے اپنی تلوار پر روکا پھر ہم دونوں کے درمیان برتری کی جنگ چھڑ گئی نانگا بڑھ بڑھ کر وار کررہا تھا اور میں زیادہ تر اپنا دفاع کررہا تھا۔

آخر کار دفاع کرتے کرتے میں نے اچانک

نانگا پر وار کیا نانگا نے میرا وار اپنی تلوار پر روکا جیسے ہی نانگا نے میرا وار روکا میں پھرتی کے ساتھ پیچھے کی جانب بھاگا اور توقع کے مطابق نانگا میرے پیچھے دوڑا میں بھاگتے ہوئے دیوار کے قریب پہنچا اور میں نے دیوار پر اپنا ایک قدم رکھا اور نانگا کے سر سے بلند چھلانگ لگائی اور نانگا کے سر کے اوپر سے گزرتے ہوئے میں نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا اور نانگا کی گردن اس کے دھڑ سے الگ ہوگئی۔ نانگا کا سر کسی فٹبال کی طرح لڑھکتا ہوا کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا اور اس کا دھڑ کمرے کے وسط میں گر پڑا۔

مگر حیرت انگیز طور پر اس کے کٹے ہوئے سر یا دھڑ سے خون نہیں نکل رہا تھا میں حیرانگی سے یہ دیکھ رہا تھا کہ نانگا کا بغیر سر کا دھڑ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔۔اور پھر میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا نانگا کے کٹے ہوئے سر کی جگہ اس کے دھڑ سے ایک نیا سر برآمد ہوا اور وہ نانگا کے دھڑ پر لگ گیا ایسا لگا جیسے نانگا کے دھڑ سے ایک نیا سر نکل آیا ہو۔

نانگا نے اپنی تلوار سر سے بلند کی اور ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر مجھ پر حملہ کر دیا میں نانگا سے پھر مقابلہ کرنے لگا لڑتے لڑتے مجھے موقع لگا تو میں نے ایک بار پھر نانگا کا سر اس کے دھڑ سے الگ کر دیا۔۔مگر پہلے کی طرح نانگا کے دھڑ سے ایک نیا سر نکل آیا۔

''کاشی۔۔کاشی نانگا کے دل پر وار کرو'' مجھے شہزادی روبیسا کی آواز سنائی دی تو میں نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا اور نانگا کا مقابلہ کرنے لگا میں نانگا کے مقابلے میں تھکنے لگا تھا جبکہ نانگا پہلے کی طرح جوش و خروش سے لڑ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ اگر یہ مقابلہ جلدی ختم نہیں ہوا۔۔تو کہیں میں نانگا کے ہاتھوں مارا نہ جاؤں۔۔اسی وقت مجھے ایرین کی آواز سنائی دی وہ بھی میدان میں کود پڑا۔

''کیا ہوا ایرین کیا نانگا کے سارے سپاہی ختم ہوگئے'' لڑتے لڑتے میں نے ایرین سے پوچھا۔

''ہاں۔۔کاشان فتح ہماری ہوئی ہے'' ایرین بھی میرے ساتھ نانگا کے خلاف لڑائی میں کود پڑا اور اس نے نانگا پر وار کرتے ہوئے جواب دیا۔اسی وقت قبیلے کے کئی افراد میدان میں داخل ہوئے اور وہ سب بھی نانگا کے خلاف لڑائی میں شریک ہوگئے نانگا ہر ایک کے وار کا بھرپور جواب دے رہا تھا نانگا کی توجہ مجھ پر سے ہٹ چکی تھی میں آہستہ سے پیچھے ہٹا اور میں نے اپنی تلوار میان میں ڈالی اور پھر اپنی کمر پر سے کمان نکالی اور کمان پر تیر چڑھایا اور نانگا کا نشانہ لینے لگا نانگا ایرین سے مقابلہ کر رہا تھا میں نے پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے ایک اونچی جگہ سے اوپر کی جانب چھلانگ لگائی میرا رخ نانگا کی جانب تھا جو ایرین سے مقابلہ کر رہا تھا۔

''ایرین نیچے بیٹھو'' میں نے چھلانگ لگاتے ہوئے چیخ کر ایرین سے کہا تو ایرین نانگا سے لڑتے لڑتے چھلانگ مار کر ایک جانب ہٹ گیا اور میں نے نانگا کے دل کا نشانہ لیکر تیر چھوڑ دیا تیر تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتا ہوا اپنے نارگٹ پر پہنچا اور نانگا کے دل میں پیوست ہوگیا جیسے ہی تیر نانگا کے دل میں پیوست ہوا نانگا کے منہ سے ایک بھیانک قسم کی چیخ نکلی اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اس نے نہایت بے قراری سے اپنے دل میں پیوست تیر کو نکالا اور جیسے ہی نانگا نے اپنے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر تیر نکالا سیاہ خون کی ایک دھار اس کے جسم سے نکلی اور نانگا لڑکھڑاتے قدموں سے کچھ آگے بڑھتے ہوئے زمین بوس ہوگیا اس کے جسم سے انتہائی سیاہ خون نکل رہا تھا میں نے آج تک کسی جاندار کے جسم سے سیاہ خون نکلتے نہیں دیکھا تھا مگر نانگا نہ جانے کیا تھا کہ اس کے جسم سے سیاہ خون نکل رہا تھا اور ساتھ ہی اس کے خون سے دھواں بھی اٹھنے لگا اور کچھ ہی دیر میں نانگا کے جسم کو آگ لگ گئی، مرتے وقت نانگا کے منہ سے بڑی بھیانک قسم کی چیخیں نکل رہی تھیں۔

نانگا کے مرتے ہی قبیلے کے تمام افراد خوشی سے

ناچنے لگے اور شہزادی روبیسا خوشی سے میرے گلے لگ گئی۔

''کاشان ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تمہاری بہادری کی وجہ سے آج ہم نانگا کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے'' سردار کی آواز سنائی دی تو میں نے جھینپ کر شہزادی کو خود سے الگ کیا۔

''یہ تو آپ سب لوگوں کی بہادری ہے ورنہ میں اکیلا کبھی نانگا پر قابو نہیں پا سکتا تھا'' میں نے ادب سے سردار کو جواب دیا۔

''بہادری کی ابتدا تم نے کی تھی اسی لئے ہم لوگوں کو حوصلہ ملا'' سردار نے کہا پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے شہزادی روبیسا کا ہاتھ پکڑا اور اعلان کرنے والے انداز میں کہنے لگا۔

''آج میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگلے پورے چاند والی رات کو کاشان اور شہزادی کی شادی کر دی جائے گی'' سردار کے اس اعلان کے ساتھ ہی قبیلے کے تمام افراد خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ایرین جلدی سے میرے قریب آیا اور میرے گلے لگ گیا۔

''واہ میرے شیر تو نے آخر میدان مار ہی لیا'' ایرین میرے گلے لگتے ہوئے میرے کان میں بڑبڑایا۔

''بے فکر رہو میری اور شہزادی کی شادی کے ساتھ تیری اور دلنواز کی بھی شادی ہوگی'' میں نے جواب میں ایرین کے کان میں کہا تو ایرین جھینپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

''سنو۔۔سنو'' سردار نے شور کرتے قبیلے والوں کو روکا ''ابھی اعلان پورا نہیں ہوا''۔

''اور کیا اعلان ہے سردار''۔

''میرے بعد اس قبیلے کا آئندہ ہونے والا سردار کاشان ہوگا'' سردار نے پورا اعلان کیا تو قبیلے والے خوشی سے پھر نعرے مارنے لگے۔

''سردار۔۔۔۔سرداری کا بوجھ مجھ سے نہ اٹھایا جائے گا'' میں نے سردار سے انکساری سے کہا۔

''قبیلے کو تم جیسے جانباز اور بہادر نوجوان سردار کی ضرورت ہے اسے میری درخواست سمجھو'' سردار نے کہا تو میں نے ان کے سامنے سر جھکا دیا۔

ایک ہفتہ بعد میری اور شہزادی روبیسا کی شادی ہوگئی شادی والے دن مجھے میرے ماں باپ بہن بھائی بہت یاد آئے مگر میں کیا کر سکتا تھا اپنے وقت اپنے زمانے سے سینکڑوں سال پیچھے کے دور میں میری شادی ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج میرے بیٹے کی تاجپوشی ہے میں نے سرداری چھوڑی اور سردار کی کرسی پر اپنے بیٹے کو بیٹھا دیا جس طرح تیس سال پہلے روب کے والد قبیلے کے سردار نے مجھے سرداری کی کرسی پر بیٹھایا تھا۔مجھے اس قبیلے میں رہتے ہوئے تیس سال گزر گئے۔یہیں شہزادی روبیسا سے میری شادی ہوئی اور شہزادی روبیسا میرے لئے روب بن گئی روب کی ساتھ میری زندگی بہت خوشگوار گزری میرے اور روب کے دو بیٹے ہوئے اور آج تیس سال بعد جب میں بوڑھا ہوا تو میں نے سردار کی کرسی پر اپنے بڑے بیٹے کو بیٹھا دیا ابھی ابھی میرا بیٹا سردار کی کرسی پر بیٹھا ہے اور سارے قبیلے والے اس کی سرداری کی خوشی میں جشن منا رہے ہیں میں اس جشن سے اٹھ کر باہر کی جانب آگیا باہر میدان کے پار مکانات بنے ہوئے تھے اور قبیلے میں داخلے کا مرکزی دروازہ تھا اس دروازے سے تیس سال پہلے مجھے قیدی کی حیثیت سے اس قبیلے میں لایا گیا تھا اور پھر میں اس قبیلے کا سردار بن گیا۔

''آہ کتنا وقت گزر گیا۔۔میں کہاں سے کہاں آگیا بیسویں صدی سے اس قدیم دور میں۔میں کیسے آیا میں نہیں جانتا'' میری سوچوں کا سلسلہ جاری تھا میں کئی بار اپنے وقت اپنے دور میں جانے کی کوشش کی میرے پاس واپس جانے کا ایک ہی راستہ تھا جس راستے سے میں اس قدیم دور میں آیا تھا یعنی نہر میں ڈبکی لگا کر۔۔۔نہر میں نہانے کے بہانے کئی بار میں

نے گہری ڈبکیاں لگائیں۔۔مگر میں واپس اپنے دور میں نہ جاسکا اور۔۔اب تو سالوں گزر گئے میرے ذہن سے میرے ماں باپ بہن بھائی کی شکلیں تک مدہم ہوگئی کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ میرے غائب ہونے کے بعد میرے ماں باپ پر کیا گزری ہوگی۔

میں میدان میں کھڑا اپنی پچھلی زندگی کا حساب کتاب کر رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر آکر ہاتھ رکھا۔

''کیا بات ہے سردار یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہیں؟'' میرے کندھے پر ہاتھ رکھنے والا اس قبیلے میں میرا واحد بھائی نما دوست ایرن تھا ایرن جو خود بھی اب بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

''میں اب سردار نہیں رہا ایرن مجھے میرے نام سے پکارو'' میں نے ایرن سے کہا۔

''میرے لئے تو تم اب بھی سردار ہی ہو'' ایرن بولا۔

''تم اگر مجھے میرے نام سے پکارو گے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی'' میں نے کہا۔

''کاشان'' ایرن نے میرا نام لیا تو میں نے بے اختیار اسے گلے لگالیا ساتھ ہی میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

''کاشان کیا بات ہے اس خوشی کے موقع پر رو رہے ہو'' ایرن میرے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

''آج مجھے میرا گھر میرے والدین بہن بھائی بہت یاد آرہے ہیں'' میں نے ایرن سے کہا۔

''کیا ہم قبیلے والوں کی محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے جو تمہیں تمہارے گھر والے یاد آگئے''۔

''نہیں ایرن نہیں۔۔یہ بات نہیں ہے مجھے اس قبیلے میں بہت پیار ملا میں نے نہایت اچھی اور پرسکون زندگی یہاں گزاری مگر وہ کہتے ہے نا کہ بڑھاپے میں والدین یاد آہی جاتے ہیں۔۔اور پھر میں تو اپنے والدین سے انتہائی عجیب و غریب حالات میں بچھڑا تھا'' میں نے ایرن کو جواب دیا تو وہ سر ہلانے لگا۔

''چلو آؤ کہیں سیر کو چلتے ہیں'' ایرن میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں ایرن نہر پر چلتے ہے'' میں نے ایرن سے کہا تو ایرن نے مجھے عجیب سے نظروں سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا اور پھر کچھ دیر بعد میں اور ایرن اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھے نہر کی جانب چل دیئے۔

نہر پر پہنچ کر میں اور ایرن اپنے گھوڑوں سے نیچے اترے اور گھوڑوں کو ایک بڑے پتھر سے باندھ دیا۔

''کیا پھر نہر میں نہانے کا ارادہ ہے'' ایرن نے مجھے اوپری لباس اتارتے دیکھا تو پوچھا۔

''ہاں''۔

''کیا پھر اپنے زمانے میں جانے کی کوشش کروگے'' ایرن بولا۔

''آج آخری بار اس نہر پر آیا ہوں آج کے بعد پھر کبھی اس نہر پر نہیں آؤں گا'' میں نے کہا تو ایرن سر ہلانے لگا آج مجھے شدت کے ساتھ اپنے ماں باپ بہن بھائی اور اپنا علاقہ یاد آرہا تھا۔ میں تیس سال پہلے اسی نہر کے ذریعے یہاں اس دور اس زمانے میں اس قبیلے میں آیا اور ساری جوانی اس قبیلے میں گزار دی اب مجھ پر بڑھاپا چھا رہا تھا نہ جانے میرے بغیر میرے گھر والوں کا کیا حال ہوا ہوگا میرے ماں باپ اب تک زندہ ہوں گے یا نہیں۔۔میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

میں نے اوپری لباس اتارا تو ایرن نے بھی اپنا اوپری لباس اتارا پھر ہم دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کے اوپر اپنے لباس رکھے اور چھلانگ مار کر نہر میں اتر گئے میں اور ایرن کافی دیر تک نہاتے اور باتیں کرتے رہے۔

''کاشان کیوں نہ ہم بچپن والا کھیل کھیلیں'' اچانک ایرن مجھ سے بولا۔

''کونسا کھیل'' میں نے حیرانگی سے ایرن سے پوچھا۔

''دیکھتے ہیں کہ کون پانی کے اندر زیادہ دیر تک اپنی سانس روک سکتا ہے'' ایرن بولا تو مجھے یاد آیا بچپن میں، میں بھی دوستوں کے ساتھ یہ کھیل کھیلتا تھا کہ ناک پکڑ کر ہم دوست نہر کے پانی میں نیچے بیٹھ جاتے تھے اور جو سب سے آخر میں پانی سے سر اوپر نکالتا وہ فاتح ٹھہرتا تھا۔

''ٹھیک ہے بچپن کا کھیل اب بڑھاپے میں کھیلتے ہیں'' میں نے ہنستے ہوئے ایرن کی تجویز کا جواب دیا تو بے ساختہ ایرن بھی ہنس پڑا۔

''او کے۔۔تیار ہو'' ایرن نے اپنے داہنے ہاتھ سے اپنی ناک بند کی تو میں نے بھی اپنا ہاتھ اپنی ناک پر رکھ لیا اور پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ نہر کے پانی میں نیچے کی جانب غوطہ لگایا اور پانی کے اندر بیٹھ گئے میں نے ناک کے ساتھ اپنی آنکھیں بھی بند کرلیں کافی دیر تک میں سانس روکے پانی کے اندر بیٹھا رہا جب میری سانس گھٹنے لگی تو میں نے پانی سے سر نکالا اور لمبی لمبی سانسیں لیکر تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھری اور پھر اپنے چہرے سے پانی صاف کرتے ہوئے نہر میں ایرن کو ڈھونڈنے کے غرض سے نظریں دوڑائیں مگر مجھے ایرن کہیں نظر نہیں آیا۔

''ایرن ایرن'' میں بے ساختہ ایرن کو آوازیں دینے لگا مگر جواب میں ایرن کی آواز مجھے نہیں سنائی دی میں پریشان ہوگیا اور پھر میں نے ایک گہری سانس بھری اور نہر میں ڈبکی لگا کر ایرن کو پانی کے اندر ڈھونڈنے لگا مگر پانی کے اندر بھی مجھے ایرن نظر نہیں آیا میں نے پانی کے اندر سے اپنا سر نکالا اور اپنے چہرے سے پانی صاف کر کے نہر کے پار خشکی پر دیکھا۔۔۔تو مجھے عجیب سا احساس ہوا جگہ کچھ اجنبی سے معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں سے میں نے اور ایرن نے نہر میں چھلانگ لگائی تھی وہ جگہ کافی بنجر تھی اور وہاں ہریالی برائے نام تھی جبکہ اب خشکی پر ہریالی ہی ہریالی نظر آرہی تھی اور وہاں کئی بڑے بڑے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔

حیرانگی کے ساتھ کنارے کی جانب تیرنے لگا کنارے پر آنے کے بعد میں نے درختوں کی جانب دیکھا۔۔۔

تو میں حیرت سے اچھل پڑا۔۔میں تیس سال بعد اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں نہر میں نہاتے ہوئے میں قدیم دور میں چلا گیا تھا اور تیس سال بعد دوبارہ اپنے دور اور اپنے علاقے میں پہنچ گیا میں نے اس درخت کی جانب دیکھا جہاں تیس سال پہلے میں نے اپنا کرتا اتار کر لٹکایا تھا۔۔تو حیرانگی کا سامنا مجھے پھر کرنا پڑا میرا کرتا تیس سال بعد بھی اسی جگہ لٹکا ہوا تھا میں نے جلدی سے اپنا کرتا پہنا اور دیوانہ وار اپنے گھر کی جانب دوڑا۔

تیس سال بعد میں اپنے گھر جارہا تھا تیس سال میں مجھے علاقے میں کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی تیس سال پہلے میں چھوڑ کر گیا تھا میں اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرا گھر اسی طرح ہے جیسا تیس سال پہلے تھا گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اماں اماں چیختا ہوا گھر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ امی جان کچن کے دروازے کے پاس کھڑی ہیں اور مجھے حیرانگی سے دیکھ رہی ہیں میں دوڑتا ہوا ان سے لپٹ گیا۔

''امی جان۔۔امی جان میں۔۔میں واپس آگیا'' میں امی جان سے لپٹتا ہوا بولا۔

''آگیا۔۔کہاں آگیا۔۔ابھی تو ،تو سو سے لینے گیا تھا اتنی جلدی سو سے لیکر آگیا'' امی جان مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولیں۔

''ابھی۔۔'' میں حیران رہ گیا ''امی میں تیس سال بعد واپس آیا ہوں'' میں نے امی جان کو بتایا۔

''پاگل ہوگیا۔۔یا گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہے تو ابھی تیس سیکنڈ پہلے تو گیا تھا سو سے لینے اور میں کمرے سے نکل کر کچن کی جانب جارہی تھی اور ابھی تو میں کچن تک بھی نہیں پہنچی اور تو کہہ رہا ہے کہ تو تیس سال بعد

واپس آیا ہے'' امی جز بز ہوتے ہوئے بولیں۔

''بھیا کیا گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہے جو بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو'' میری چھوٹی بہن سلمٰی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آتے ہوئے بولی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو میں نہر میں نہاتے نہاتے قدیم دور میں چلا گیا تھا اور وہاں تیس سال گزار کر آرہا ہوں'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''بھیا اپنے کپڑے دیکھیں کیا وہ گیلے ہو رہے ہیں یا بغیر کپڑوں کے آپ نہر میں نہا رہے تھے'' سلمٰی ہنستے ہوئے بولی تو میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور کپڑوں پر نگاہ دوڑائی میرا سر اور کپڑے خشک تھے میں حیرانگی سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

''دیکھ لو۔۔دیکھ لو میں بوڑھا ہو چکا ہوں'' میں نے اپنا چہرہ سلمٰی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بھیا واقعی آج گرمی بہت ہے اور وہ گرمی آپ کے دماغ پر چڑھ گئی ہے لیجئے آپ خود اپنا چہرہ دیکھ لیجئے'' سلمٰی نے آئینہ میرے چہرے کے سامنے کیا۔۔۔تو میں حیران رہ گیا میں بوڑھا نہیں تھا نہ ہی میرے چہرے پر بڑھاپے کے آثار تھے بلکہ میں جوان تھا اسی عمر کا جب میں نہر میں نہاتے ہوئے قدیم دور میں چلا گیا تھا۔میں حیرانگی کے عالم میں آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''کاشی بیٹا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم کمرے میں جا کر آرام کرو میں چائے بنا کر لاتی ہوں'' امی جان میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کرتے ہوئے بولیں۔۔۔تو میں حیران ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہو گیا۔میں قدیم دور میں تیس سال گزار کر آیا، ننگا سے خوفناک جنگ لڑی شہزادی روبیسا سے شادی کی میرے دو بیٹے جوان ہوئے وہاں اس دور اس زمانے میں، میں نے تیس سال گزارے اور ۔۔۔۔اور یہاں اس دور اس زمانے میں کوئی وقت ہی نہیں گزرا۔

''نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے مسجد اقصیٰ بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتوں آسمان کی سیر کی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئے تو وہی وقت ہو رہا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر معراج پر روانہ ہوئے تھے پوری کائنات کے لئے وقت روک دیا گیا تھا'' میرے ذہن میں مولوی صاحب کے الفاظ گونجنے لگے۔

''اف میرے اللہ میں نے شک کیا تھا ۔۔۔اور اللہ نے مجھے دیکھا دیا کہ وقت کس طرح روکا جاتا ہے میں نے تیس سال زندگی گزاری اور یہاں۔یہاں تیس سیکنڈ بھی نہیں گزرے'' میں دل ہی دل میں پشیمان ہونے لگا میری آنکھیں اللہ سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگنے کے لئے بیقرار ہونے لگیں آنسو شدت کے ساتھ بہنے کے لئے تیار تھے میں جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا اور وضو کر کے اللہ کے حضور کسی مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا۔

''اے خدا۔۔۔خدایا مجھے معاف کرنا میں نے شک کیا۔۔۔اے خدا مجھے یقین ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج پر مجھے یقین ہے تیری قدرت پر'' میں نماز کے لئے کھڑا تھا میری آنکھیں برسنے کو تیار تھیں۔

''آہ بڑے بڑے انکشافات ہوتے ہیں آج میرے اوپر کشف کا دروازہ بھی کھل گیا کہ دنیا والوں کی نظروں سے بچ کر اللہ کے حضور آنسو بہانے کی سب سے اچھی جگہ سجدہ ہے۔سجدہ اللہ کو پسندیدہ فعل ہے۔۔۔سجدہ انسانیت کی معراج ہے۔۔۔'' میں خدا کے حضور سجدے میں پڑا اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے آنسو کے ساتھ میرا دل بھی دھل رہا تھا سارے شکوک و شبہات آنسو کے راستے باہر نکل رہے تھے میں سجدے میں پڑا اللہ کی حقانیت بیان کر رہا تھا، خدا پر میرا یقین مستحکم ہو رہا تھا۔